بابر
(شیر ببر)
تصنیف
ہیرلڈ لیم
ترجمہ
سیّد ہاشمی فرید آبادی
سلطنتِ مغلیہ کا پہلا تاج دار

بابر

(شیر ببر)

تالیف: ہیرلڈلیم

ترجمہ: سیّد ہاشمی فرید آبادی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز

لاہور — کراچی — حیدرآباد — پشاور

(پاکستان)

This is an authorized translation of
BABUR THE TIGER by Harold Lamb
Copyright 1961 by Harold Lamb.
Published by Doubleday & Company,
Inc., New York, New York.

سلسلۂ مطبوعات نمبر	۳۲۱
طبع اوّل	۱۹۶۲ء
تعداد	۲۰۰۰
طابع	شیخ نیاز احمد
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس لاہور

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور
بہ اشتراک
فرینکلن پبلیکیشنز لاہور — نیویارک

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	باب ششم	
۲۹	(ہندوستان کا راستہ) افغان بی بی کی ضمنی نقل	۱۷۴
۳۰	مضبوط اور بڑے قلعے کی تسخیر	۱۷۸
۳۱	ہُل بُل کی مے خواری	۱۸۳
۳۲	بابر کا غور اپنی حالت پر	۱۸۵
۳۳	گلبدن کے وقائع	۱۸۸
۳۴	حملۂ ہندوستان کی چیستان	۱۹۲
	باب ہفتم	
	(پانی پت اور کنواہہ)	
۳۵	کابل سے جنمی کوچ	۱۹۹
۳۶	پھر وہ سب سازش کرنے لگے	۲۰۲
۳۷	عزم وہمت کی رکاب میں پاؤں ڈالتا ہوا	۲۰۷
۳۸	مغل سواروں کا جھپٹا	۲۱۰
۳۹	قلندر بابر کی شہرت بادشاہی	۲۱۴
۴۰	پہرہ دار (عسس) کی ایک اشرفی	۲۱۶
۴۱	گوالیار کا دہنیا پول) ہاتھی دروازہ	۲۲۳
۴۲	ہمایوں کی سرکشی	۲۲۶
۴۳	آٹھ ستاروں کا خلاف جمع ہونا	۲۲۹
۴۴	میدان کارزار کنواہہ	۲۳۴
۴۵	بجز تقدیر الٰہی کچھ نہیں ہوتا	۲۳۶
۴۶	گنگا پر ایک پل	۲۴۱

Awais

مُقدّمہ

وسط ایشیا کی ایک گمنام سی پہاڑی وادی میں بابر ۱۴۸۳ میلادی میں پیدا ہُوا[1]۔ ان پہاڑیوں کے سوا، حکومت و اقتدار کی صرف دو طرفہ یادیں ورثے میں ملی تھی۔ وہ یُوں کہ ماں کی طرف سے تو وہ چنگیز کی اولاد میں تھا، جو اُس منول کا سردار اور کچھ عرصے تک دنیائے معلومہ کے بڑے حصّے کا فرماں روا رہا۔ باپ کی طرف سے اس کا اور بھی قریبی براہِ راست نسب تیمور لنگ (لفظی معنی= لنگڑا فولاد) تک پہنچتا تھا، جسے یورپ والے "تاتاری فاتح "تمرلین" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اِس طرح بابر کے خون میں منگول نسل کی متوقع تناس بربریت کا چھینٹا اور اس سے بھی قوی تر تُرک قوم کی توانائی شامل تھی۔ پھر یہ دو گونہ تُرک و مُغل نترکہ آگے جا کے ایک بعید طرزِ زندگی یعنی خانہ بدوشی سے متوارث ہُوا تھا۔

نا محدود زمانے سے شمال وسطی ایشیا کے بدوی قبائل اپنے مواشی کے گلّوں پر زندگی بسر کرتے تھے جس میں اُن کی بل کر شکار کھیلنے کی مہارت ممد ہوتی تھی۔ ندی نالوں کی تنگی گزرگاہیں ان کے راستے تھے۔ صحرا کی اچھی چراگاہیں ان کی مقبوضہ اراضی تھیں اور ان والے پہاڑ اُن کے امن تھے۔ انہی پناہ گاہوں اور بہتر مرغزاروں کی تلاش میں وہ اپنی بھیڑ بکریوں، گھوڑے، کمل کے لپیٹ جانے والے ڈیرے، غرض تمام اثاث البیت کے ساتھ برف پوش پہاڑوں کے پار ہجرت کر آتے تھے۔ کبھی کبھی یہ متحرک قبیلے کسی صاحب عزم خدا داد سردار کے ماتحت ایک بڑا جرگہ جتھا بن جاتے تھے، جس میں تمام تندرست مرد صحرا کے جان دار ٹٹوؤں پر سوار ہوتے اور ان کا خاص ہتھیار دونوں سروں پر خمیدہ کمان ہوتی تھی۔ حفاظت کے لیے کڑیوں کی زرہ یا گدّہ دار چمڑے کا سینہ بند رہتا تھا۔ یہ لشکر اپنے گُم نام گوشوں سے یا تو سخت قحط پڑ جانے کے باعث، یا کسی زیادہ طاقتور جتھے کے دباؤ سے نکلتے اور یا دُور دست متمدّن شہروں کی دولت لُوٹنے کی طمع انھیں باہر لاتی تھی۔ ان غارت گروں کا یہ خروج قانونِ قدرت کی سی باقاعدگی کے ساتھ عمل میں آنا۔ مغربی یورپ کے بعید انقطاع میں

---

[1] "شش محرم" بہ حساب جمل ہجری سال ولادت ۸۸۸ اور روزِ ولادت بھی ہے۔ (مترجم)

موج در موج ہُن، آوار، بلغار، تُرک، منگولوں کی ان طغیانیوں کو قہر الٰہی اور یا جُوج کے ہُوئے یاجوج ماجوج کا رسّیاں تڑا کے نکلنا سمجھ کر لوگ صبر کر لیتے تھے۔

بابر کے معاملے میں اسلاف قدیم کا یہ طرزِ زندگی محض بھولی بسری یاد نہیں تھا۔ ممکن ہے خود اس کی سرشت میں خانہ بدوشی کے دبے ہوئے اثرات موجود ہوں لیکن زندہ خانہ بدوش تو اس کے خون میں عمر بھر بلا شبہ جاں رہے۔ کیونکہ وسط ایشیا کے یہ نو وارد خاص صفات کے مالک ہوتے تھے۔ بھیانک سرزمینوں میں موسم کی شدائد کا پیہم مقابلہ کرتے رہنے سے ان میں بڑی جفاکشی اور خطرات کے وقت فوری تدبیر کر گزرنے کی قابلیت آجاتی تھی۔ کمزور بال بچوں کی حفاظت، گاؤں کے ٹھکانے اور خود اپنے ڈیرے ڈالنے کی ضرورتیں شروع سے ان میں تنظیم کا بڑا سلیقہ پیدا کرتی تھیں۔ جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے ان وسط ایشیا کے جفاکش تیر انداز سواروں کے مقابلے میں آرام سے رہنے والے شہری عموماً نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ایک حقیقت جس کی طرف اکثر توجہ نہیں کی جاتی یہ تھی کہ ان بدویوں کی فوقیت کا سبب ان کے ذہن کی تیزی اور موقع کے مطابق بدل جانا بھی ہوتی تھی۔

روم کے قدیم ترین مسیحی دعاۃ میں سے ایک کا مشاہدہ یہ تھا کہ جنگ میں "تاتاری" اس درجہ وحشی اور خونخوار نہ تھے جتنا مسیحی یورپ کے عسکری [illegible] برسے، ایک نسل سے کچھ ہی زیادہ مدت پہلے عثمانلی ترکوں نے جو اپنے اوطان سے کہاں سے کہاں پہنچے ہوئے آئے تھے، شہر قسطنطنیہ کو تسخیر کیا کہ قریب قریب ناقابل تسخیر مقام تھا، تو یہ عظیم کامیابی محض جسمانی مشقت کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس میں آبنائے باسفورس پر پُل بنا لینے اور اُسے دونوں [illegible] معلوم کر لینے، نیز اعلیٰ قسم کے آلات قلعہ شکنی سے کام لینے کی حربی تدابیر کا بہت کچھ دخل تھا۔

علیٰ ہٰذا یہ بات بھی لوگوں کے ذہن میں کم آتی ہے کہ وسط ایشیا کے قدیم فاتح خوانین و سلاطین نے اپنی فتوحات کے بعد دولت کو ہضم کرنے میں کبھی بیابانیت کا ثبوت دیا۔ چنگیز خاں کے تحت نہایت وسیع پیمانے پر منگولوں کی تاخت تاراج کو دو پشتیں بھی نہ گزری تھیں کہ منہدم بعید شہروں کی نئی تعمیر ہونے لگی۔ ملک چین میں خان بالق جسے منگول "پورت کبیر" یعنی بڑا پڑاؤ کہتے تھے، وہاں کے مغل فرماں روا قبلائی خاں نے عیش و نشاط کے قریب قریب ہر شاہانہ "گنبد" کی تعمیر کے ساتھ شکار گاہوں کے اندر مسکونہ محلات بنانے کا بھی حکم دیا اور تجارت کے راستوں کو دوبارہ بحال کیا جیسا کہ اطالوی سیاح مارکو پولو شہادت دے گیا ہے۔

تنظیمی مہارت کے علاوہ یہ مغل فرماں روا دنیا کے سامنے ذمہ داری کا احساس رکھتے تھے۔ چین میں ان کا خانوادہ بر آن ایک وسعت پذیر سلطنت کا سربراہ تھا۔ ایران میں ایل خانیوں نے ترقی پذیر شہر تبریز کو مرکز بنایا اور نہایت باقاعدگی کے ساتھ اُن ممالک پر حکمرانی کی جن میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ آگے چل کر عثمانلیوں نے ایک مضبوط سلطنت "دولتِ عثمانیہ" اسی شہر کو مرکز بنا کر قائم کر دکھائی جو ان کی آمد سے قبل کامل جمود کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ کم بالو، تبریز، قسطنطنیہ جو دورِ گزشتہ میں ایک دوسرے سے منقطع پڑے تھے، اب تجارتی اور سفارتی دونوں قسم کے روابط سے مربوط ہو گئے اس طرح وہ امنِ عامہ جسے مغول سے منسوب کیا جاتا ہے، ظہور میں آیا اور یہ محض جنگی قوت کی بنیٔی سے کہیں بڑھ کر ان کی عمدہ حکومت کا نتیجہ تھا۔ یہی صورت "پیکس رومانا" (امن رومہ) کی مغلوں کی آمد سے ایک ہزار سال پہلے تھی[لے]۔

رومیوں کی آہنی حکومت قوانین کے محکم نظام پر مبنی تھی۔ مغل فرماں رواؤں کے پاس اوّل اوّل خانہ بدوشوں کا قانون "یسا" تھا جسے چنگیز خاں قیدِ الفاظ میں لایا۔ اس کے ذہن میں اپنے صحرائی خیمہ نشین (کمّل کے یورتوں میں رہنے والے) امیروں کی سیادت مفتوحہ زراعت پیشہ رعایا پر مسلّم تھی۔ اس کا تصور کچھ ایسا تھا کہ ان مغول امیروں کی قوت اُردو ہائے مغل یعنی ان کے جنگجو بہادر لشکروں پر مبنی ہو اور یہ سب خود اس کی اولاد کے بڑے لشکر "التون اُردو" (طلائی لشکر) کے زیرِ اقتدار رہیں۔ ان فرماں رواؤں کو مشورہ دینے کا حق صرف آزمودہ کار سپہ سالاروں یا "نوئینوں" کو حاصل ہو۔ مگر اس عظیم فاتح نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے اخلاف تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ خیمہ نشین گردی کی بجائے اکثر چنگیزی شہزادوں نے بیرونی دولت مند شہروں میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور خانہ بدوشوں کی نقل مکانی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے، اور کچھ غلط نہیں ہے کہ چنگیز کے پوتے قبلائی نے ضعیف شدہ سونگ خاندان سے ملک پوری طرح چھین لیا تو چین کو فتح کر لینے نے ہی چین اس کو فتح کر چکا تھا۔ مغلوں کے التون اُردو میں مذہب نے بھی رخنہ ڈالا۔ اپنی فتوحات کے آغاز میں یہ تاتار و مغول جاہلی مذہب رکھتے تھے اور بیرونی دنیا کے مذاہب سے انھیں کوئی تعصب یا اعتنا نہ تھی۔

لے مصنف نے اپنی دو سری کتابوں: "چنگیز خاں" اور "دی ارتھ شیکرز" میں مغول کے ظہور کی داستان لکھی ہے۔

رفتہ رفتہ یوآن بادشاہوں نے بُدھ مت اور ایران کے ایل خانیوں نے اسلام قبول کر لیا حقیقت میں بابر کا زمانہ آنے تک تبّت کی برفانی سطح مرتفع سے بعید دریائے والگا تک یَسا کی بجائے شریعت اسلامی کا کامل عمل دخل ہو چکا تھا۔ یہاں محمد صلعم کے احکام چنگیزی اقتدار پر غالب آ گئے تھے۔

غرض اس طرح فاتح اوّل کے ورثا بیرونی تہذیبوں کا جزو بن کر ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے اور مغل نومئینوں اور ترک ترخانوں کے صحرائی امیروں کے خاندان منتشر ہو کر جاگیرداروں، تاجروں، مذہبی علما اور فلاسفہ کے تہذیب یافتہ معاشرے میں گھُل مل گئے۔ اب پھر وہی زراعت پیشہ مستقل آبادیوں اور باقی ماندہ خانہ بدوشوں میں باہمی آویزش کا طبعی قانون عمل میں آیا۔ کیونکہ چنگیز نے یورپ کے دو علاقے اپنے بیٹوں کو جاگیر میں دے دیے تھے، وہ اسی طرح خانہ بدوشی اور کم وبیش یَسا کے قانون پر عامل رہے۔

ترک ومغل سیلاب نے بیرونی ممالک میں جاگیرداری پولینڈ ولتھوآنیہ کی سرحدوں اور روس کے شہر کیو ان سے لے کر ڈین یوب کی ندیوں تک بہت کچھ تغیّر پیدا کیا، بایں ہمہ جہاں تک ترک ومغل آباد تھے ان علاقوں میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہاں والے بدستور خانہ بدوش رہے جو تجارتی شہروں کو چھوڑ کر دوسری بستیاں تاخت تاراج کرتے رہتے تھے اور یا قبائلی گروہ حصولِ سیادت کے لیے آپس میں دائمی کشت وخون کرتے تھے۔

بابر کی پہاڑی وادی سے دُور شمال مغرب میں دریائے یورال سے آرتیش تک وہ نیم صحرائی علاقہ تھا جو چنگیز کے سب سے بڑے [illegible] دسر بیٹے جُوجی کی ریاست میں دیا گیا تھا۔ اس کے بیٹے باتُو کے عہد میں اسی علاقے کے [illegible] زبردست اُردو کو یورپ والے التون اُردو کے نام سے جانتے تھے، جس کا سبب شاید [illegible] پُرشکوہ خیمہ وخرگاہ تھے جو والگا کے مشرقی کنارے رواں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں انگریز شا[illegible] رچہ سرے لکھا تھا کہ

"ارضِ تتاریہ کے شہر سرا میں ایک بادشاہ رہتا ہے کہ
روسیہ کا دردِ سر ہو گیا ہے۔"

خانوادۂ جوجی کے یہ خان دوسری خانی ریاستوں سے الگ تھلگ رہے اور روس کی کچّی فصیلوں کی بستیوں کے سوا کسی بیرونی تمدن سے بھی ان کا سابقہ نہیں پڑا۔ اس تاریک نیم صحرائی سرزمین میں اسلامیت

کا قدم بھی سُست رہا۔ پھر جب اس التُون اُردو کے مرکز گریز مجادلات نے ٹکڑے ٹکڑے کیے تو چند گروہ والگا کے مشرق میں ہٹ آئے اور "قپچاق" یعنی صحرانشین کہلائے۔ جس زمانے میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو تسخیر کیا، اسی کے قریب ان قپچاقوں کی ایک نئی اور جان دار گروہ بندی وجود میں آئی جو اپنے آپ کو "اُزبک" یعنی خود سردار موسوم کرتے تھے۔ اس لفظ کی اصلیت کسی قدر مشکوک ہے لیکن ازبک تیر انداز سواروں کا فوج در فوج خانوادۂ چغتائی کے علاقوں پر پل پڑنا تاریخی واقعہ ہے۔

چغتائی (یا چغتے) چنگیز کا دوسرا بیٹا تھا۔ وسط ایشیا کا قلب جو سطح مرتفع تبت کے اوپر واقع ہے اس کی وسیع جاگیر تھا۔ اس میں صحرا اور نیم صحرا شامل ہیں جو بلند ہوتے ہوئے ایشیا کی ریڑھ تک چلے گئے ہیں جہاں تھیان شان کا سلسلہ ابر آلود پامیر پر کوہستان ہندوکُش سے آملا ہے۔ مذکورہ بالا سرزمین بھی اُزبکی اوطان کی طرح عملاً بدوی ہی رہی تاہم یہاں کاروانی راستے آکر ملتے تھے، خصوصاً نسطوری نصاریٰ یا اسلامی زیارت گاہوں کے گرد، تر[illegible]یب کے جزیرے سے بنے اور برابر قائم رہے تھے۔ کاشغر، المالیق، بشبالیق (پنج شہر) جیسی بستیاں اگرچہ مغلوں کی پہلی یورش میں تاراج ہوئیں، لیکن اب چغتائی کے اخلاف وہاں پھر آبسے تھے۔ ایسی مستقل سکونت اُن کے قانون یسا کی خلاف ورزی تھی۔ چنانچہ اگرچہ وہ اپنے ذاتی خزانے [illegible]ل بند شہروں میں محفوظ کر دیتے تھے، خود ابھی تک اپنے قبائل کے ساتھ جاڑے ندیوں کے کنارے مرغزاروں میں اور گرمیاں پہاڑوں پر چراگاہوں میں گزارنے چلے جاتے تھے۔ ان چغتائی خوانین کی جماعت انگھڑ قسم کی شان امارت رکھتی تھی اور تخت حکومت کی بجائے زیادہ تر وہ گھوڑے کے زین پر بیٹھے ر[illegible]ہاں روائی کرتے تھے۔ جہل کے اندھیرے میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ ان کی رہنما کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ بیرونی جنگ و جدال میں بھی اُلجھتے رہتے تھے۔ پہاڑوں کی پشت کے مشرق میں ان کا بڑا شہر کاشغر [illegible] اب چین کے دائرۂ اثر میں ہے۔ وہاں اس علاقے کو مغولستان یعنی ارض مغول کہتے تھے اور پہلیوں کی نظر میں مغل اور راہزن میں کوئی فرق نہ تھا۔

کوہستانی حدِ فاصل کے مغرب کے خوانین دعویٰ دار تھے کہ چغتائی کے اصل وارث وہی ہیں۔ اُن کا خاص گڑھ تاشقند یعنی پتھر کا شہر فصیل بند تھا۔ یہ ان وسیع گیاہ زاروں میں واقع تھا جن کے درمیان سے چین کی بڑی شمالی شاہراہ گزرتی تھی۔ تجارتی قافلے اسی راستے سے چین جاتے اور وہاں کا ریشم ادھر

لاتے تھے ۔ ان خوانین کو بت پرست کرغز اور جنگلی قزنق قبائل سے اپنی چراگاہوں کی حفاظت کرنا ہی دشواری سے خالی نہ تھا کہ اب وہ خاصی طرح اُزبکوں کے راستے میں آ گئے جو جنوب کی طرف ڈھل رہے تھے ۔

بابر کا سخت کوش نانا خاندان چغتائی کی اسی شاخ میں تھا اور ہرچند شہر تاشقند پر اُسی کی حکومت تھی جب اُسے بابر کا اصلی نام بتایا گیا تو وہ اُسے بلا دِقّت ادا نہ کر سکا ۔

واضح رہے کہ چغتائیوں کے خطّے کا یہ جنوب مغربی قطعہ دوسرے اقطاع سے اتنا مختلف تھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی ۔ سرسبز پہاڑی وادیاں اسی علاقے میں نیچی ہوتے ہوتے وسیع میدان سے مل جاتی تھیں ، جو بحر ارال تک جانے والے دو بڑے دریاؤں کے درمیان واقع ہے ۔ اسی میدان میں اور گویا خانہ بدوشی کے سمندر میں تہذیب اور ثقافت کے دو جزیرے آ گئے تھے : ایک بخارا جو اسلامی درس گاہوں اور مزاروں کے باعث مشہور تھا ۔ دوسرا سمرقند جہاں عالی شان محلات اور تجارت کی گرم بازاری تھی ۔ ان شہروں کے گرد زراعت پیشہ آبادی دریائی آب پاشی کے سہارے زندگی بسر کرتی تھی ۔ آمو اور سیر (جیحوں ، سیحوں) کے اس دوآبے میں وادیوں کے پورے سلسلے پر شریعت اسلام کا نفاذ ہو گیا تھا اور قانون یسا قریب قریب معدوم ہو چکا تھا ۔ یہی سرزمین تھی جہاں مغلوں کے درمیان تیمور لنگ کا چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ظہور ہوا ۔ تیمور نے سمرقند ہی کو اپنا مخکم حصار بنایا اور پھر ترک تازیوں کے غنائم سے اسے مالا مال کیا ۔ یہ لنگڑا فولاد اسلام کا جھنڈا لے کر اٹھا اور خانہ بدوشوں پر تابڑ توڑ ایسے جوابی حملے کیے کہ باتو کے التون اُردو کا رہا سہا جتھا پراگندہ ہو گیا اور مغلستان کے چغتائی خوانین کا شیرازہ بکھر گیا ۔ تیمور نے اپنے آخری سنین میں سمرقند کو چار چاند لگائے ۔ شمالی ہندوستان کو تاخت تاراج کیا ۔ عثمانی سلاطین کی فتحمند فوجوں کو پامال کر ڈالا اور وسط یورپ تک میں "تمرلین" نام کی ہیبت پھیلا دی ۔ ۱۴۰۵ء میں وہ چین پر لشکر کشی کر رہا تھا جہاں منگ خاندان کے عروج کے سامنے یوان خاندان کا چراغ جھلملانے لگا تھا جب کہ وہ مشیتِ الٰہی سے فوت ہو گیا ۔

پائے تخت سمرقند میں ہونے کے باوجود تیمور کی چند روزہ سلطنت اپنے مغرب کی سطح مرتفع ایران کی تہذیب کے زیر اثر قائم ہوئی تھی ۔ سمرقند کے باغوں کے محلات میں چوکے تک ایرانی معماروں نے لگائے تھے اور ایرانی اہل قلم ہی نے اس بزرگ فاتح کے نام کو بقائے دوام بخشی جو اپنے لیے صرف

"امیر" یعنی صاحب امر کا لقب پسند کرتا تھا۔ تیمور، چنگیز کی اولاد میں نہ تھا اگرچہ مقبرے کے کتبے پر چنگیز کا نام بھی تیمور کی ازدیادِ شہرت کے لیے کندہ کر دیا گیا ہے۔

محاربات تیموری کے بعد نہضت تیموریہ کی وہ ایک صدی آتی ہے جو وسط ایشیا کی تاریخ فنون میں سب سے درخشاں دور ہے۔ ایک بیٹے کے ماتحت سمرقند میں اور ایک پوتے کے وقت ہرات میں ملک خراسان میں یہ چمک دمک قائم رہی۔ ارباب صنعت اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے جیسے یورپ کے شہروں میں۔ پھر چالیس برس محدود امن کے گزرے جس میں آل تیمور نے اپنے مرکز اقتدار کو بچائے رکھا۔ ۱۴۶۵ء تک ہم تیموری فرماں روا ابوسعید[1] کو دامن قاف سے مشرقی پہاڑوں کے پار کاشغر تک کی بادشاہی کا دعویٰ کرتے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اب ازبک خانوادۂ جوجی کے وارث بن کر قفقنوس کی طرح کنج خمول سے دوبارہ یسا کا وہی قانون لیے ہوئے نمودار ہو گئے تھے جسے روشن خیال تیموریوں نے کب کا ترک کر دیا تھا۔

۱۴۶۵ء کے بعد دولت تیموریہ دعویداروں کی باہمی جنگ سے پارہ پارہ ہونے لگی۔ پائے تخت سمرقند کے وارث کو یہی غنیمت نظر آتا تھا کہ جس طرح بنے اپنے بھائیوں سے فی الوقت صلح صفائی رکھے۔ ان میں ایک بھائی تو جنوب مغرب میں ہرات پر قابض تھا جہاں صنعت و فن ترقی پر تھے۔ دوسرا جنوب مشرق کی بلند سرزمین پر جہاں سے جیحون سیحون نکلے ہیں، ہندوکش تک فرماں روائی کرتا تھا۔ اور جنوب میں تیسرے بھائی نے ہندوکش کے پار افغانی علاقے میں کابل دبا لیا تھا۔ سب سے مجہول چوتھے بھائی کو سمجھئے جو انتہائے مشرق میں فرغانہ پر قابض رہا۔ یہ بابر کا باپ تھا۔

ان دُور دست پہاڑیوں میں بابر کا پیدا ہونا تقدیر کی بے مہری تھی کیونکہ ایک طرف تو ریف پرشر اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے اور دوسری طرف تاشقند سے جو چغتائی کے وارثوں کا مسکن تھا، فرغانہ پہنچ جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ وادی حقیقت میں آدھا ادھر آدھی ادھر تھی۔ یہ بارونق شہر سمرقند اور دوسری جانب صحرانورد خانہ بدوشوں کے درمیان حدِ فاصل تھی۔ اس کے ایک طرف تاشقند کا دوسری طرف شکاری ادھر صاحبانِ علم و فن اور ادھر وحشیوں کا دور دورہ تھا۔ بعید فرغانہ کی خبر کرنے والا کوئی نہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی سرگزشت صفحۂ تاریخ پر باقی نہیں رہے گی۔

---

[1] متن میں یہ نام "ابوسعید" لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ (مترجم)

بایں ہمہ بابر نے قلم سے کام لیا۔ اپنی گمنام سی مادری زبان چغتائی ترکی میں فرغانہ اور خود اپنی زندگی کے حالات لکھے۔ اس عہدِ خموشی میں اس نے اپنی آواز لوگوں کے کان تک پہنچا دی۔ چنانچہ آج بھی کہ اس تحریر کو لکھے ہوئے پانچ سو برس کے قریب گزر چکے ہیں، وہ داستان کچھ اس طرح ہمیں سنائی دیتی ہے کہ گویا کہنے والا رات ہوتے پڑاؤ پر پہنچا ہے، دن بھر دشمن کے تعاقب میں اور یا زیادہ تر یہ کہ دشمن اس کے تعاقب میں تھا۔ گھوڑے سے اتر کر ڈیرے میں آگ کے پاس بیٹھا اپنی روداد سنا رہا ہے۔ اسی رزمیہ روداد میں ہم کو اس عہد کی تصویر نظر آنے لگتی ہے جو یورپ والوں کے "زرنگار مشرق" پر قبضہ جمانے سے پہلے یہاں کی کیفیت تھی۔

بابر کا زمانہ وہ تھا جب کہ یورپ میں ایک دھندلے جزیرے انگلستان میں وہاں کا ایک امیر کمسن وارثِ تاج ایڈورڈ کی بجائے رچرڈ ثالث کے لقب سے خود بادشاہ بن جانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ ادھر طوفانی رودبار کے پار [illegible] دہ سالہ بیبار (BAYARD) شمشیر زنی سیکھ رہا تھا اگرچہ بہادر شہسوار بننے سے بڑھ کر اس کا مطمحِ نظر فرانس کے بادشاہی پرچم کو اونچا رکھنا تھا۔ آگے مشرق میں سوونرولا راہب سامعین کے روز افزوں مجمع کو عقبیٰ کے خطرات سے اور قہرِ الٰہی سے جسے وہ بھولے ہوئے تھے، ڈرا رہا تھا۔ [illegible] نظم یورپ کی مشرقی سرحد ان دنوں تیوتانی سرداروں کے قلعوں سے بہ مشکل آگے جاتی تھی [illegible] یہ سردار ابھی اپنے جذبۂ جہاد کو بالٹک کے تاریک ساحلوں کے بُت پرستوں کو ہلاک کرنے تک [illegible] محدود رکھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ پرتگال کے بادبانی جہاز افریقہ کے مغربی سواحل پر ڈھونڈتے [illegible] پھرتے تھے کہ مشرق کے افسانوی ملک کا جہاں پریسٹر جون کی کبھی حکومت تھی، راستہ مل جائے [illegible] ایک ہٹیلے ملاح نے جو اس بحری گشت میں ان کے ساتھ رہا، ذہن میں یہ حجت بھی کی [illegible] پھرنے کی بجائے سیدھے مغرب میں سمندر کو پار کریں تو ایشیا میں جا نکلیں گے لیکن اس ملاح کرسٹوفر کلمبس کی درخواست کہ اسے "اوشن سی" کا ناخدا بنا کے چند چھوٹے جہاز دیئے [illegible] ہیں، اس وقت منظور نہیں کی گئی تھی۔

بابر (شیرِ ببر)[1]

بڑے مُغل بادشاہوں میں پہلا بادشاہ

[1] مصنف نے "دی ٹائیگر" لکھا ہے لیکن بابر کا صحیح مترادف بلکہ متبادل بَبر ہے (مترجم)
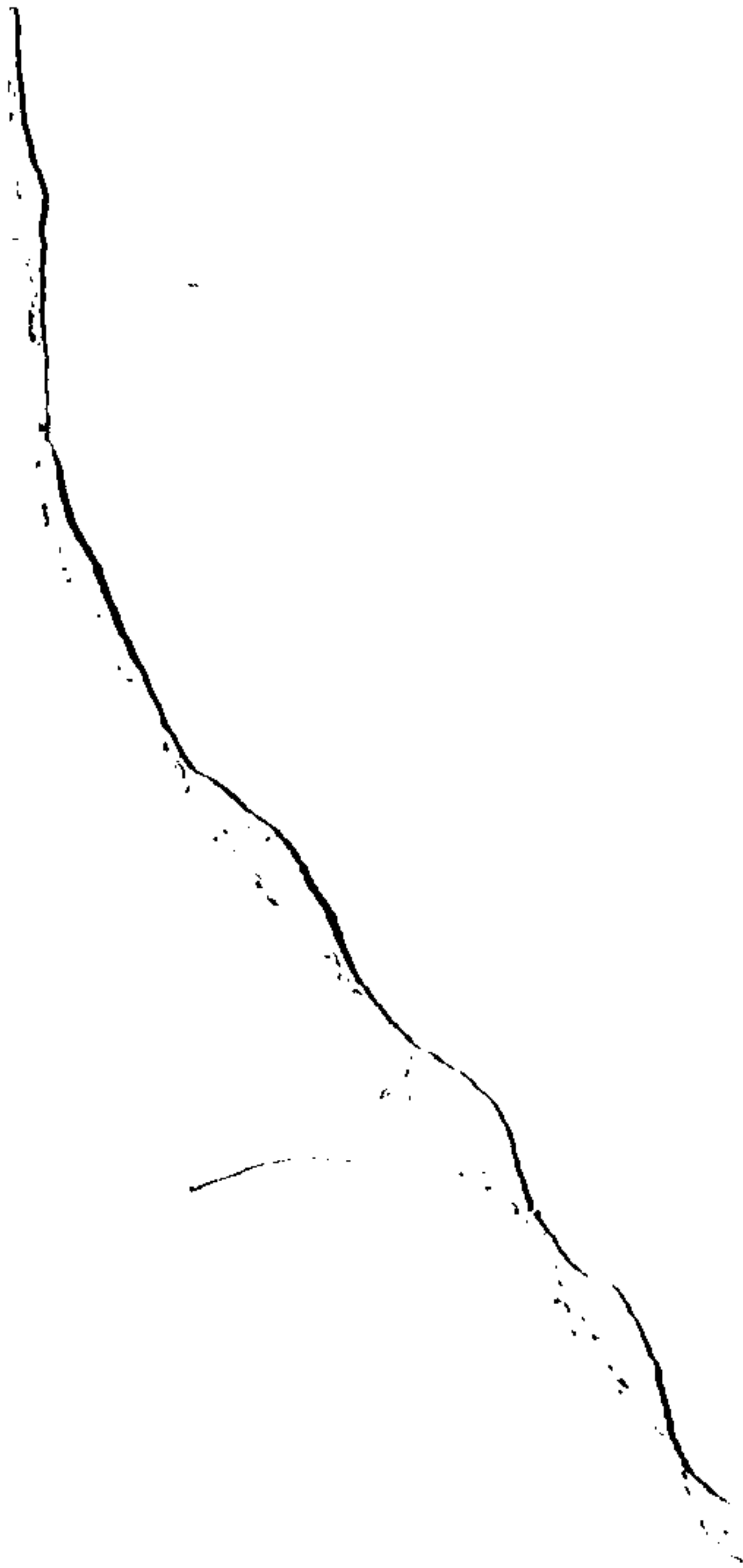
باب اوّل

وادی کی رُوداد

بابُر ۱۴۸۳ کے وسط سرما میں پیدا ہوا جب کہ برف پہاڑوں سے پھسل پھسل کر شاہ دانہ کے باغوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ان دنوں وادی محصور تھی کیونکہ برف نے آمد و رفت کے درے بند کر دیے تھے سوائے اس راستے کے جو دریا کے کنارے سے سمرقند جاتا تھا۔ بابر پہلا بیٹا تھا لہٰذا اس کی ولادت پر محل سرا میں بہت خوشی منائی گئی۔ شکستہ حال قلعے کے دریچوں سے عورتوں نے قالین باہر لٹکائے۔ بابر کی بہن پانچ برس کی تھی، یعنی اتنی بڑی کہ ننّھے بھائی کی دیکھ بھال کرنے کا شوق رکھتی تھی۔

ملک کے گوشے گوشے سے قبائلی سردار اور ان بستیوں کے والی جو عمر شیخ مرزا کی مطیع تھیں گھوڑوں پر سوار جوق در جوق ولادت باسعادت پر باپ کو مبارک باد دینے اور خوب دعوتیں کھانے آئے کیونکہ عُمر شیخ عقل و تدبیر سے نہ سہی فیاضی کی صفت سے متّصف تھا اور قریبی زمانے میں اس کے معاملات کچھ بے طور سے رہے تھے، لہٰذا اس موقع پر مہمانوں کے ساتھ جو بھی ہم پیالہ ہوئے، اس نے آب ممنوعہ پیا۔ نجومی کو بلوا کر بچّے کے طالع سعد کا زائچہ کھنچوایا اور [illegible] ہوا تو مسنون قرآن کی بجائے شاہنامے کی پیش گوئیاں پڑھنے لگا۔[1] عمر شیخ [illegible] خیال کی منزل سے آگے نہیں بڑھے۔ البتہ اس کے شوق کا مشغلہ کبوتر [illegible] کبوتروں کا عاشق تھا اور کبوتروں کو بڑی محنت اور صبر سے ہوا میں چٹیاں کھانی سکھایا کرتا تھا [illegible]

---

[1] یہ مصنف کی ناواقفیت کی بات ہے۔ قرآن مجید سے تفاؤل کر سکتے ہیں لیکن وہ باشاہ نا پیش گوئیوں کی کتاب نہیں ہے۔ (مترجم)

باز وغیرہ اُڑانے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم بابر کی ولادت نے اب اُسے بچّے کی طرف زیادہ متوجہ کرلیا۔ سِنّ رُشد کو پہنچنے کے بعد بابر سمجھ گیا تھا کہ ظاہری آؤ بھگت کی تہ میں اس کے باپ کا کمّاپن مخفی تھا۔ (اپنی تزک میں لکھتا ہے)

"عمر شیخ میرزا کی قبا صباں وسیع تھیں، اسی طرح اس کا دل وسیع تھا بڑی بڑی اُمیدیں اور شاندار منصوبے باندھتا تھا اور ہمہ وقت کشورکشائی کی تجویزیں سوچا کرتا تھا، اگرچہ جب کبھی فتح کرنے نکلا، شکست کھاکر مایوس وملول واپس آیا۔ وہ سلطان ابوسعید میرزا کا، جس نے آخر مرتبہ امیر تیمور کی سلطنت کے جملہ اقطاع کو مجتمع رکھا، چوتھا فرزند تھا۔ کسی قدر پستہ قامت، تراشیدہ نکیلی ڈاڑھی سُرخی مائل بال اور بڑے تن و توش کا آدمی تھا۔ اتنا تنگ جامہ پہنتا کہ پیٹ دباکر بند باندھے جاتے اور بدن ڈھیلا چھوڑتا تو اکثر ٹوٹ جاتے تھے۔ اپنی غذا یا لباس کے بارے میں اُسے کوئی خاص لحاظ نہ تھا۔ ڈھیلی دستار کے دونوں سرے پڑے لٹکتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں مغلی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا۔

وہ اپنے عقائد میں پکّا تھا۔ پابندی سے پنج وقتہ نماز ادا کرتا اور اکثر قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اگرچہ شاہنامہ پڑھنے کا اُسے بہت شوق تھا۔ مزاج کا نرم، لیکن اچھا بہادر آدمی تھا اور انداز بھی بُرا نہ تھا، مگر اس کے مُکّے میں غضب کی قوت تھی۔ ...سے ہی مکّا ... گرے بغیر نہ رہتا تھا...... آگے چل کر وہ ایک دو بار بزم ناؤنوش میں شریک ہونے لگا تھا۔ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا۔ اکثر چوسر کبھی کبھی پانسوں سے کھیلتا تھا۔"

برخلاف اس کے بابر کی ماں امور خانہ داری میں مصروف رہتی اور محل کا جس کی آمدنی کم خرچ زیادہ تھا انتظام کرتی تھی۔ یہاں اُسے مغل ہی کے نام سے یاد کرتے کیونکہ اس کا باپ جس نے عمر شیخ

سے اس کا عقد کیا، تاشقند کا مغل حاکم یونس خاں تھا۔ (وادئی فرغانہ میں "منگول" کا تلفظ "مغل" کیا جاتا
تھا) وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہوسکتی تھی لیکن ان تفریحات کی اسے فرصت
کہاں تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ اُسے مختصور دربار کی آن بان قائم رکھنی پڑتی تھی جو تاشقند کے
دربار سے جہاں وہ پلی بڑھی، بہت ادنیٰ تھا۔ مگر فربہ اندام، من کے موجی امیر کی، جسے کبوتر بازی،
مے نوشی اور کشور کشائی کے لاطائل منصوبوں سے فرصت نہ ملتی تھی، صدر بیگم ہونے کے باعث یہ سب
کام کرنے پڑتے تھے۔

بچے کی ولادت کی تقریب میں آنے کے لیے اس بیگم کے ماں باپ کو پورا ایک سال لگا کیونکہ وہاں
چغتائی مغلوں کے خاندان یونس خاں کا ساتھ چھوڑے جا رہے تھے۔ اصل میں ان مغلوں کو اپنا پرانا
طرزِ زندگی چھوڑنا کہ ادھر سے اُدھر گلّے لیے پھرتے ہیں اور چھاپے مار کر دولت لوٹ رہے ہیں،
گوارا نہ تھا۔ ادھر یونس خاں جما ہوا تھا کہ نئے اصول [illegible] شرت کو ہاتھ سے نہ دے گا، کم سے کم
تاشقند کی فصیلوں کے اندر جہاں وہ اپنے جنگ جو [illegible]فیقوں پر آئین مذہب و تجارت چلا سکتا
اور خود سیب کے باغوں میں آرام سے بیٹھ کر حافظ کے لطف کلام کا اتباع کرسکتا تھا۔ اسے عیاریاں
کرنی آتی تھیں، چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے ایک نئی جنگ [illegible] چھیڑ دی اور شوریدہ سر قبیلوں کو اپنے
جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یونس خاں نے ز[illegible]نے کے بہت نشیب و فراز دیکھے تھے۔
کئی بار زندانوں سے نکل کر محلات میں پہنچا تھا یہاں تک کہ مرحوم ابو سعید میرزا نے اُسے جلاوطنی میں
ایران کے عشرت کدوں سے واپس بُلایا اور چغتائیوں کی رہی سہی [illegible]ت پر، چنگیز کے وارث صحیح
کی حیثیت سے حکومت کرنے کی دعوت دی۔

بہرحال اب جو یونس خاں نواسے کو تحفہ تحائف دینے وادئی فرغانہ آیا تو پوری شان و شوکت
سے قبائل کی فوج لے کر آیا جن کے ساتھ نفیریاں کان اُڑا [illegible] گھوڑوں پر
دھرے ہوئے دف کی تال پڑ رہی تھی۔ ادھر سے عمر شیخ مرزا، باں تن و توش عاجلانہ [illegible]لا کہ ایک
منزل آگے بڑھ کر خان کا استقبال کرے اور آداب خوردانہ بجا لائے۔ اسی کے ساتھ دل [illegible]یش
بھی ہوگی کہ یہ بزرگ مغل واقعی کچھ اعانت کرے گا یا داماد کی کچھ اور زمین ہتیا لے گا۔ کیونکہ، مدت بعد
بابر بیان کرتا ہے کہ "بارہا میرے باپ نے مشکل کے وقت اپنے خسر کو مدد دینے کے لیے بلایا،

مگر ہر مرتبہ اپنے ملک ہی کا کوئی حصّہ اس کے حوالے کر دیا حتٰی کہ خود تاشقند شہر بھی جو اصل میں میرے باپ کی ملکیت تھا، یونس خاں کو دے دیا۔"

مگر اس آمد کے وقت یونس خاں بزرگ خاندان بن کر آیا اور لطف و عنایت پر مائل تھا۔ یہ بابر کے عقیقے کی تقریب تھی جس میں وہ شریک ہوا اور چونکہ بچّے کے نام ظہیر الدین ـــ محمد، کو ادا نہ کر سکتا تھا[1]، لہٰذا اس بوڑھے نے لاشعوری طور پر اُسے بابر کے لفظ سے یاد کیا۔ پھر یہی عرف چل گیا۔

مولود کی نانی ایسان بھی بچّے کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئی۔ وہ بے نقاب صرف سفید براق رومال سر پر ڈالے سواری کا گہرے رنگ کا پوستین پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آمد پر قلعے کی سب عورتیں خاموش ہو کر آداب بجا لائیں۔ ایسان[2] کے شریفانہ اوصاف کا قصّہ سُن کر یُونس خاں نے ۴۱ برس کی عمر میں اسے ایک صحرائی قبیلے سے عقد نکاح میں لیا تھا اور اب تیس سال سے یہی بیوی اس کے دُکھ درد میں شریک اور اس کے روز افزوں مرض فالج میں اس کی تیمار دار تھی۔ ایک مرتبہ جب یونس خاں کو غلّے کی تلاش میں مغولستان کے باہر اپنے رشتہ داروں کے پاس جانا پڑا تو اس کے ایک جانی دشمن نے چھاپہ مار کر ایسان کو گرفتار کر لیا اور اپنے کسی ساتھی کو دے دیا۔ ایسان نے اپنے نئے مالک کا خیر مقدم کیا اور کپڑے اُتارنے میں مدد دیتے وقت قتل کر ڈالا۔ پھر اپنے گرفتار کرنے والے خان کو اطلاع کرائی اور کہلا بھیجا کہ تم مجھے جان سے مار سکتے ہو لیکن یونس خاں کے سوا اور کسی کے حوالے نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اعزاز کے ساتھ وہ اپنے شوہر کے پاس واپس بھیج دی گئی۔ ایسان کی تعلیم صرف گرم و سرد زمانہ کا تجربہ تھا۔ صحرانوردوں کی طرح خطرے کو تاڑ جانے اور اس سے بچ نکلنے کا ہنر جانتی تھی۔ اس کی چوکسی آئندہ بابر کے بہت کام آئی۔

بابر، جو اسی نام سے پکارا جانے لگا تھا، پہلی دفعہ دادی سے باہر سمرقند گیا تو اس سے ایک سال قبل یونس خاں [illegible] چکا تھا۔ وہ اگرچہ ابھی پانچ سال کا بچّہ تھا، پھر بھی شاندار باغوں کے محلات [illegible] برج ہائے مقبروں کے لاجوردی چوکوں کی چمک دمک دیکھ کر تعجب کرنے کی اس میں سمجھ تھی۔ اپنے افسانوی جدّ امجد کا عظیم مقبرہ "گور امیر" دیکھ کر شاید اتنا حیران نہیں ہوا، جتنا ایک

---

[1] جو شخص کلامِ حافظ سے بہرہ اندوز ہو اس کا صاف نام ادا نہ کر سکنا بالکل خلاف قیاس بات ہے (مترجم)

[2] اس کا املا ایسن (دولت بیگم) بھی کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

چینی پگوڈا میں ہاتھی دانت کے جانور دیکھ کر، یا "گونجتی مسجد" میں آواز کا جواب سُن کر، جس کا پکارنے
والا نظر نہیں آتا تھا۔ ایک اور باغ "دِلکشا" نام کی بارہ دری میں تیمور کی فتح ہند کی تصویریں منقوش
تھیں اور یہ دیکھ کر کہ خود اسی کی وادی جیسے شہسوار عجیب قسم کے جنگلی ہاتھیوں کو مار کر بھگا رہے ہیں،
ضرور اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئی ہونگی۔ مگر ہمارے شبیر کو لوگوں نے اُس کی دُلھن دکھائی تو وہ کچھ
زیادہ متاثّر نہیں ہوا۔ یہ اسی کی ہم عمر پنج سالہ شہزادی عائشہ تھی جو منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے گھونگھٹ
ڈالے لائی گئی اور رسم ادا ہوتے ہی اُلٹے پاؤں بھاگ گئی۔ بابر نے اسے خود رائے لونڈیا سمجھا اور آیندہ بھی
کچھ ایسا ہی سمجھتا رہا۔

لیکن ایک اور تماشا جس نے شاید اس کے دل پر ہیبت پائے دار نقش چھوڑا، یہ ہُوا کہ اس کے
چچا سلطان احمد میرزا نے ایک اور شادی انہی دنوں رچائی۔ یہ چچا اس وقت سمرقند کا مالک تھا اور اپنے
بھائیوں میں صلح صفائی کی کوشش کے ساتھ درپردہ انھیں بے وقعت کرنے کی فکر میں تھا۔ اس پوری
عمر کی شادی میں اس نے ننھے بابر کو بُلا کر کہا کہ دلھن کا گھونگھٹ منہ سے ہٹا دے۔ جس وقت وہ تعمیلِ حکم
کوشش کر رہا تھا، اس نے حاضرین امرا کے قہقہے کی آواز سُنی جو گویا اس کی تضحیک کر رہے تھے۔[1]

بابر اب اپنے آس پاس کی عورتوں کے جذبات سمجھنے لگا تھا۔ عائشہ اسے ناپسند کرتی تھی۔ بہن
خانزادہ جو اب بڑی عورتوں کے سے زیورات کی خواہش مند ہو چلی تھی، اس کی طرف دار چاہنے والی تھی۔
ماں خیرخواہی سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی۔ نانی کی ہر وقت دیکھ بھال رہتی تھی۔ ان باتوں نے بابر پر بہت
اثر کیا۔ اگلے سال اسے زنان خانے سے باہر بھیج دیا گیا کہ اپنے باپ کے ساتھ رہا کرے۔

یونس خاں کے مرنے سے بابر اور اس کا باپ اپنے ایک حمائتی سے محروم ہو گئے۔ وہ انھیں نوچتا
کھسوٹتا رہتا تھا مگر کنبے بھر میں ان کا سچّا حلیف اور محافظ بھی تھا۔ ورنہ تینوں [illegible] سگے بھائی عمر شیخ
میرزا کا ملک نکال لینے کی خواہش میں متحد تھے اور سمرقند میں پچھلے دنوں ملاپ کا جو سوانگ رچایا گیا،
اس کے بعد صرف آپس کی بدگمانیوں نے ان بھائیوں کو فوراً ایسا اقدام کرنے سے باز رکھا۔
ان کی طمع کا سبب یہ تھا کہ گو موٹے بھائی کے ہاتھ میں روپیہ نہ تھا اور اسی لیے کوئی مضبوط فوج جمع

---

[1] مغلوں میں رسم تھی کہ نئی دلھن کا گھونگھٹ کوئی بچّہ اُٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ شاید مصنف نے ٹھیک
بات نہیں سمجھی۔ (مترجم)

بھی اس کے پاس نہ تھی، تاہم اس کی وادی خوب آباد اور سرسبز تھی۔ بابر جب اس قابل ہوا کہ گھوڑے پر چڑھ کر باپ کے ساتھ دورے کرے تو اس کی سب سے پہلی محبوب شئے یہی وادیٔ فرغانہ بنی۔

کابک ٹوٹتی ہے

ایک مدت بعد بابر کیفیت لکھتا ہے کہ "سرزمین فرغانہ آباد (متمدن) دنیا کے سرے پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سمرقند اور جنوب کی طرف بدخشاں کے بلند اقطاع ہیں۔ شمال میں جیسا کہ تاریخ بتلاتی ہے، سابق میں المالیق اور المآتا (سیبوں کا باپ) جیسے شہر آباد تھے لیکن جب سے ازبکوں کے قدم آئے وہ قریب قریب سب اب ویران ہو گئے ہیں۔

خود فرغانہ کا رقبہ زیادہ نہیں ہے لیکن یہاں غلّہ اور پھل افراط سے ہوتے ہیں۔ اس کے ہر طرف پہاڑیاں کھڑی ہیں، سوائے مغرب کے جو سمرقند اور خجند کی سمت ہے ادھر پہاڑیاں اٹھی ہوئی نہیں ہیں اور اسی طرف سے دور دور کے دشمن فرغانہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس علاقے میں تیلا سیر (سیحوں) بہتا اور خجند سے گزر کر شمال کا رُخ کرتا ہے۔ پھر وہ ترک قبائل کی میدانی زمینوں میں پہنچتا ہے اور راستے میں کوئی معاون ندی نہ ملنے کی وجہ سے آخر ریگستان میں جذب ہو جاتا ہے۔"

ان شمالی گیاہستانوں پر پہلے یونس خاں کا پہرا رہتا تھا۔ نوعمر بابر کی نظر میں اب وہ مخدوش زمین بن گئے تھے جس کے پار ی جتھے ایسے نظر آتے تھے جیسے میدانوں سے افق پر کالی گھٹا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں پہاڑیوں کی فصیل بھی کوئی مضبوط حائل نہ تھی کیونکہ ندیوں کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ سوا ں کا انھیں طے کر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ یہ ندیاں برف کے پانی سے جاری رہتیں اور وعہ اراضی تک پہنچنے میں پہاڑیاں کاٹ کے راستے تیار کر دیتی تھیں۔

فی الواقع ی قسم کے راستوں سے تجارتی قافلے منزل بہ منزل آتے اور ختا (چین) کا مال سمرقند کی منڈیوں میں لاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ایسا قافلہ بابر کے شہر کے قریب مرغزار میں پڑاؤ لگاتا تھا کہ برفستان طے کرنے کی تکان دور کرے اور ایال دار یاک اور ٹٹوؤں سے سامان اتار کر گھوڑوں پر منتقل کرے جو سمرقند کے آگے، سرخ ریگستانوں سے گزرنے کے لیے دوبارہ اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔ زیادہ بلندی والے درے جاڑوں میں عموماً مسدود ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان بلندیوں

کوچ کرنے والے ایک قافلے کو برف نے آدبایا اور صرف دو آدمی زندہ بچ کر نشیبی وادی تک پہنچ سکے۔ جونہی میرے باپ نے یہ خبر سنی، داروغہ روانہ کیے کہ قافلے کے ہلاک ہونے والوں کا مال اسباب تحویل میں لے لیں اور اگرچہ اس وقت اپنے جملہ مداخل وہ ٹھکانے لگا چکا تھا اور روپے کا ضرورت مند تھا، مگر اس نے یہ تمام سامان مقفل کرا کے وارثوں کے واسطے محفوظ کر دیا۔ انھیں اطلاعیں بھیجیں تا آنکہ ایک دو سال میں سمرقند اور خراسان سے مال کے وارث آئے اور اس نے بجنسہ سارا مال اسباب ان کے حوالے کر دیا۔ وہ ایسا منتدین آدمی تھا۔"

عمر شیخ میرزا دوسروں کے حق میں فیاض مگر خود اپنے لیے نفع رساں نہ تھا وہ اپنے شہر اندجان میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا کرتا تھا مگر اتنا نہ ہوا کہ اس کی مورچہ بندی بھی کرا لیتا۔

تھوڑی ہی مدت میں بابر نے پتا چلا لیا کہ اس کی وادی دو مختلف علاقوں پر مشتمل ہے: ایک تو ندیوں کے کنارے کے نشیبی دیہات، دوسرے غیر آباد پہاڑیاں۔ اس کے شہر کی ندی سے نو نہریں بستی میں آتی تھیں۔ وہ بہت دن اسی حیرت میں رہا کہ یہ اندر وں میں پہنچ کر کہاں غائب ہو جاتی ہیں پھر اس کا تجسس اسے اوپر پہاڑیوں پر لے گیا جہاں نرسل کے جھنڈ اور وہ تنگ گھاٹی تھی جسے "جست گوسفند" کہتے تھے اور پھر اوپر برفانی چوٹی کے کوہ برا کا دیدبان مقام تھا۔ نیچے کی سطح ہری بھری چراگاہ میں مویشی کے گلّے چرتے پھرتے اور دور دور گاؤں نظر آتے تھے۔ خود پہاڑی کے آس پاس بھی گرمیوں کی چرائی کے لیے اونچے قطعات کا سلسلہ تھا جہاں کہیں کہیں قبائلی لوگ چرمی جھول دار یوں میں جو تیز ہوا سے بچاتی تھیں، زمین پر بیٹھے ہوتے، ارد گرد چند بھیڑیں اور کالی بکریاں ہوتی تھیں۔ پہاڑی لوگ نو عمر شہزادے کی بادام اور موٹے تیتر کے گوشت سے تواضع کرتے تھے۔ بابر اندازہ لگاتا ہے کہ ایک تیتر کا شوربہ چار آدمیوں کے لیے کفایت کر سکتا تھا۔ اس قسم کے گشتوں میں خود اس کے ساتھ کوئی مسلح سپاہی یا سردار ضرور ہوتا تھا۔ ان کوہستانی قطعات میں اس نے قدرتی عجائبات دیکھے۔ مثلاً سنگ سماق کی ایک چوٹی کہ بالکل درگاہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک دھندلا سا سفید پتھر اتنا چکنا کہ اس میں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ اسے بابر نے "سنگ آئینہ" موسوم کیا۔ پھر پہاڑیوں پر وہ پھول بھیاں تھیں کہ دیہات میں نہیں ہوا کرتیں۔ ان کی ٹہنیاں پتھر کی منڈیریوں سے پہچانی جا سکتی۔ جون پر چل کر بناہ گزین شہری نوابین کی گرفت سے بچتا بچاتا دوسری وادی تک جا نکلے۔ ہمارے تبصرنے

جلد رُشد و ہدایت حاصل کی اور ان خفیہ راستوں کے بھید بھی سیکھ لیے۔ نوعمر رفیقوں کے ساتھ وہ ان ویرانوں میں سفید ہرن شکار کرتا پھرتا تھا۔

آمد بہار یا فصل کی تیاری پر عموماً بستیوں میں میلے لگتے ان تقریبات میں اکثر بڑی عمر کے لوگ بھی شراب ممنوعہ پیتے اور عمر شیخ میرزا کے ساتھ نرد و قمار آ کر کھیلتے۔ وسط گرما میں گلاب اور لالہ کے پھول کھلتے۔ لڑکے شام کو بڑے بڑے کچھوؤں کی پشت پر موم بتیاں جما کے روشن کر دیتے اور ان کے باغوں میں خراماں خراماں پھرنے کا تماشا دیکھتے۔ خربوزوں کی فصل تیار ہوتی تو اُن دنوں گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں لوگوں کے مجمعے لگتے تھے۔ ہمارا شیر مزے کا رسیا تھا۔ انہی میلوں کھیل تماشوں یا رسیلے پھلوں کی بنا پر ہر بستی کو یاد رکھتا تھا۔ پرانے خجند میں بڑے رس بھرے انار ہوتے تھے۔ کاروانی شاہراہ اسی کے قریب سیر دریا کو آتی تھی اور اس کی پہاڑیوں میں اعلیٰ درجے کا فیروزہ مل سکتا تھا، مگر وہاں سانپوں کی بھی کثرت تھی۔ اور آگے مرغیناں کی خشک بیابانیاں جن میں باادام بھرے جاتے تھے، اسے پسند تھیں۔ اسی مقام کے مُکّہ باز پہلوان مشہور تھے۔ لڑنا بھڑنا، دھونس دھڑکا انھیں خوب آتا تھا۔ اسی سے یہ مثل بن گئی تھی کہ "جو دھونسیا ہے وہ مرغیناں کا"۔ دریا کے پار کی بستی بابر کا اصل مسکن ہونا چاہیے تھی۔ اس کا نام اخسی[1] اور یہاں وادئ فرغانہ کا سب سے قدیم و مستحکم قلعہ تھا۔ شروع میں عمر شیخ نے یہاں اقامت کی مگر پھر اُسے چھوڑ دیا۔ البتہ یہاں ایک کبوتر خانہ بنا دیا تھا اس کی نگہداشت کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بستی کے مکان تو آڑ میں محفوظ تھے لیکن کھلی پہاڑی کی چوٹی پر بالا حصار ہوائے تند کی زد میں تھا (بابر لکھتا ہے) "قلعہ بلند چٹان کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ ڈھلوان ندی نالے اس کے پہلوؤں میں خندق کا کام دیتے ہیں۔ قلعے کے سامنے دریا بہتا ہے۔ قلعے اور بستی کے درمیان صحرا ہیں جن میں سفید ہرن کی کچھ کمی نہیں ... باز کا شکار بھی ہر طرف خوب ہوتا ہے۔ صحرا کے اسی اتصال کے باعث یہاں والے کہا کرتے ہیں "... ہے صحرا، کہاں ہے شہر"[2] اخسی کے خربوزے ایسے اچھے ہوتے ہیں کہ دنیا میں نظیر نہیں ..." بابر ان پُر وزن، سُرخی مائل خربوزوں کو عمر بھر نہیں بھولا۔ واقعی وہ ایسے بامزہ ہوتے تھے ... انھیں امیر تیمور کے خربوزے کہنے لگے تھے[3]۔ مگر اس کا باپ اخسی چھوڑ کر اہل ددھیال کے ساتھ

---

[1] اصل ترکی تلفظ آخشی۔ (مترجم) [2] فارسی تزک میں: "دِہ کجا و درختان کجا" (مترجم)

[3] فارسی میں: "خربزہ میر تیموری" (مترجم)

وادی کے مشرقی سرے پر اندجان میں جارہا - وہاں بابر کو کوئی چیز دل کشی کی نظر نہ آتی تھی - معلوم ہوتا ہے فصیل کے اندر کی بستی بہت گنجان تھی کیونکہ وہ لکھتا ہے اس کے کوچہ و بازار اس راستے کے سرے تک چڑھے چلے آئے تھے جو قلعہ کے گرد بنا ہوا تھا - قلعے کی خندق کا کام ایک چھوٹی ندی انجام دیتی تھی اور اسی کی بدولت تھوڑے سے دن بعد بابر کی جان سخت خطرے میں پڑ گئی تھی -

اندجان کے میوہ باغ میں بابر استاد کے آگے دوزانو بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا - جاڑوں میں ایوان کے اندر جیسے بڑی انگیٹھیاں گرم کرتی تھیں، پڑھائی ہوتی - بے شبہ اس نے پڑھائی پر بہت محنت کی ہوگی کہ گیارہ سال کی عمر تک اتنا کچھ پڑھ لیا - کیونکہ اس کے بعد تو اسے تعلیم پانے کی فرصت ہی کہاں ملی - استاد اسے اور اس کے چھوٹے علّاتی بھائیوں کو حساب کے مسائل، ستاروں کے نقشے، اسلامی تعلیمات ذہن نشین کراتا اور خاندان کی کئی پشت کی تاریخ، تیمور و چغتائی تک پڑھاتا تھا - بابر کی فطرت میں تجسّس بھرا تھا، بہت جلد اس نے حافظے میں معلومات کا ایک خزانہ جمع کر لیا - اس کی تیز نگاہ سے یہ بات بھی مخفی نہیں رہی کہ اخوند جو پڑھانے میں تشدد کرتا تھا، کردار میں اتنا کمزور تھا کہ قبول صورت لونڈوں کو ساتھ سُلانے پر پھسلاتا تھا - ایک اور استاد کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ بھی شہوت پرست، فریبی، ریاکار آدمی تھا "

نوعمر بابر کے گرد و پیش تین زبانیں بولی جاتی تھیں - لہٰذا اسے دیہات کی پُرانی تُرکی، کوچہ و بازار کی فارسی بولی اور اہل علم کی فصیح فارسی اور عربی پر قدرت حاصل کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی - وہ ضلع جُگت سُن کر بہت خوش ہوتا تھا - اپنے آس پاس کے لوگوں کے حال سے کر [illegible] دلچسپی تھی - اب اپنی وادی کے باشندوں کو وہ بزرگان دین، خواجگان کے اقوال اور شعرا کے عمدہ اشعار سننے لگا تھا - شاہ نامے کی مترنم ابیات میں اسے بہادر شاہ و شہریار کی فتح و شکست کے افسانے ایسے معلوم ہونے کہ گویا ان وادیوں میں جو اس کی وادی سے کچھ بڑی تھیں، ابھی ابھی یہ واقعات گزرے ہیں - اس [illegible] پسند تھا، جو چیز عجیب اور پُراسرار معلوم ہوتی اس کی ٹوہ لگاتا تھا - اندجان کے قلعے میں چند کتابیں عجیب معلومات سے پُر تھیں مگر بابر ابھی ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا - رومیؒ کا الہامی کلام سنا رہے آسمان کے پار کی خبریں سناتا تھا اور ان غیبی ہستیوں کی، جن کا کوئی نام نہیں ــــ وہ جو کبھی کبھی کسی کو خواب میں نظر آجاتی ہیں - اس کا باپ نشے میں گرما کر مثنوی کو جھوم جھوم کے خوب پڑھ سکتا تھا لیکن جب اس

کے معارف بیان کرنے چاہتا تو زار و قطار آنسو جاری ہو جاتے۔ وہ اپنے بیٹے کو اسی قدر بتا سکا کہ ایک قطب الاقطاب حضرت احرار[1] ایسے بزرگ ہیں جو اسرارِ حیات کی شرح کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگ دُور دست تاشکند در اندجان میں کبھی نہیں آئے۔ عمر شیخ میرزا کے قلعے میں فقط آوارہ گرد نجومی البتہ آجایا کرتے تھے۔ انھیں خوب کھانے کھلائے جاتے اور وہ چند سکوں کے عوض آیندہ کی خبریں سنایا کرتے تھے۔

رات کو گھر والوں کی باتیں سُن سُن کر یہ بھی بابر کے ذہن نشین ہو گیا کہ اس کے چچا جو دُور کے شہروں میں رہتے ہیں، ان کے گھروں کا حال بھی اندجان ہی جیسا ہے۔ فنون سپہ گری میں مہارت اور اعلیٰ درجے کے سامانِ عیش و طرب کے ذوق شوق کے باوجود ابو سعید میرزا کے چاروں بیٹے کچھ بہت دولت و مال نہ رکھتے تھے۔ شعرا جو اُن کی مدح میں قصیدے کہتے، حضرت رومیؒ کے مرتبے کے نہ تھے کہ ان کی بات کا یقین کیا جائے۔ چاروں شہزادے مانگے کی ناموری پر بسر کرتے تھے۔ وہ شاہ خرچ، نا عاقبت اندیش اور کچھ اس قسم کے قسمت آزما بن چلے تھے جنھیں ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور لُوٹ کھانے کا شوق ہوتا ہے۔

عمر شیخ میرزا نے صیغۂ راز میں بیٹے کو سمرقند اور موروثی تخت، نیز میدانی علاقے کے تاشقند پر قبضہ کرنے کے منصوبے بھی سنائے۔ وہ خود اچھا تیر انداز یا شہ سوار نہ تھا مگر بیٹے کو دس برس کی عمر سے سپہ گری سکھانے پر مُصر تھا۔ چنانچہ بابر کو دربار کے ماہرینِ جنگ کی شاگردی میں دے دیا گیا اگرچہ اس نے اپنی کتابی تعلیم [illegible] سے نہیں دی۔ یہ جنگی تربیت آئے دن شکار کھیلنے یا کبھی کبھی اُن جنگی تاختوں میں شریک رہنے سے ہوتی تھی جو اس کے باپ کے نقشے پر دریا پار کی جاتی تھیں۔ کیونکہ کوہستان کے شرفا [illegible] معرکہ آرائی فقط میدانوں میں یا صف بند لشکروں سے نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ کسی وقت بھی [illegible] ہو سکتی تھی۔ بابر کے اتالیقوں نے بخوبی سمجھا دیا تھا کہ اسے ہمہ وقت خصوصاً جو وقت [illegible] کے حق میں نہایت تکلیف دہ ہو، ایسی معرکہ آرائی متوقع سمجھنی چاہیئے مثلاً سوتے میں یا سیل [illegible] پہنتے میں۔ ایک بہادر مگر ذرا موٹی عقل کا جنگ آزما سلاّخ کے عرف سے مشہور تھا[2]۔ اس نے [illegible] کو سواری کی حالت میں ڈھیلی زرہ اور ہلکا خود پہن کر لڑنا سکھایا تھا۔ سواری کے بغیر تو آدمی

---

[1] مراد شیخ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ سے ہے (مترجم) [2] اصل نام قنبر علی (مترجم)

کسی شمار قطار ہی میں نہیں رہتا۔ اس نے گھوڑے پر سے تلوار گھمانے اور دشمن کے وار سے بچنے میں ڈھال کو حرکت دینے کی مشق کرادی تھی۔ ایک چھوٹی ترکمانی کمان سے آگے یا پیچھے کے رخ بھاگتی چیز پر کس طرح نشانہ لگاتے ہیں، یہ ہنر بھی بابر سیکھ گیا تھا۔ استاد سلّاخ عمر شیخ میرزا کی ملازمت میں آنے سے پہلے یونس خاں کا آفتابچی[1] رہا تھا۔

بھورے بال والا سردار قاسم محل سرا کا داروغہ تھا۔ اُسے دست بدست جنگ کی زیادہ فکر نہ تھی۔ اس کا قول تھا کہ گلّہ بان داؤد شمشیرزن جالوت سے زیادہ عاقل تھے۔ بابر کو بھی دشمن کو تیز رفتار تیر سے پہلی ضرب لگا کر بیکار کر دینے کی ترکیب سیکھنی چاہیئے۔ بابر نے یہ نکتہ فراموش نہیں کیا لیکن وہ سردار قاسم بیگ کو اتنا بھروسے کے لائق نہیں سمجھتا تھا جتنا الاؤبالی مگر وفادار سلّاخ کو۔ اصل میں اونچے رُتبے کے امیر جو خود بھی طلب جاہ سے خالی نہ تھے، ان پر اتنا اعتماد کیا بھی نہ جاسکتا تھا، جتنا معمولی ملازمین پر۔ ایک اور امیر پسر یعقوب نے گھٹنے کے زور سے گھوڑا چلانے، دوڑانے کے گر سکھائے۔ اُس نے کہا اگر تم پھرتی سے حرکت کروگے تو دشمن کا آسانی سے ہدف نہیں بن سکتے۔ یہ حسن[2] یعقوب بیگ اچھا دلیر، جھگڑالو آدمی تھا۔ لڑکوں کے ساتھ چوگان یا گھوڑی کا کھیل کھیلنے میں شریک ہو جاتا اور اُنھیں چھیڑتا، چڑاتا رہتا تھا۔ اسی نے بابر کو یہ بات بھی سُنادی تھی کہ اگر تمھارے سر پر عقابِ کلاں کا سایہ نہ ہوا تو کالے کوّے تمھاری ہڈّیاں کھائیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر نوعمر شہزادے کو محافظ اور پشت پناہ نہ ملے تو سرِ رہ بھیک مانگنے والوں کی طرح مارا جائے گا۔ حسن یعقوب اسی طرح کے ذو معنین شعر بھی خود کہا کرتا تھا۔

قاسم بیگ کم خواندہ آدمی تھا، متنبّہ کرنے میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا۔ ۱۴۹۴ء کی گرمیوں میں جب کہ فصلیں تیار، چرائی بھی اچھی تھی۔ قاسم کو خطرہ پیدا ہوا، جو اوروں کو نظر نہ آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ بابر کے سب سے بڑے چچا سلطان احمد اور یونس خاں کے فرزند اکبر محمود خاں بیں تو دوڑ رہے ہیں اور یہ دونوں گھوڑے چرانے نکلے ہیں لیکن فرغانہ کے رخ بڑھ رہے ہیں اور درحقیقت یہ ان کی لشکر کشی ہے۔ ادھر عمر شیخ میرزا والی فرغانہ جسے اپنے لشکر کو جمع اور ہتیار بند کرنے کی ضرورت تھی، فصیلیں اور اپنے کبوتر دیکھنے اندجان سے چلا گیا اور دار الملک ایک قاضی صاحب کے سپرد کر گیا جو نہایت مقدس مگر بالکل غیر عسکری قسم کے بزرگ تھے۔ ان بزرگ

---

[1] بہ تصحیح مترجم۔ [2] بہ تصحیح مترجم۔

نے رنگین مزاج حسن یعقوب اور عیّار طبع قاسم بیگ کی بات نہیں مانی۔ قاضی کا خاندان سمرقند میں بھی اپنے تقویٰ طہارت کی بنا پر قابلِ احترام مانا جاتا تھا۔ انھوں نے فرمایا اصل محافظ مشیت الٰہی ہے اور حکم خدا کے سوا اور کوئی "قانون" ماننے کے لائق نہیں۔ اور یہ کہ آگے چل کر خود بابر پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی۔
بابر دل میں سوچنے لگا کہ خود اس کے باپ پر بھی یہ حقیقت کبھی کھلی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ جو اپنی ساری پاک طینتی اور دوستوں میں خوش طبعی کے باوصف ابھی تک افیون نوشی اور نرد و قمار کے ممنوعہ اشتغال سے دل بہلاتا رہتا تھا۔

اب جو اپنا کبوتر خانہ دیکھنے وہ اخسی گیا ہُوا تھا، گرمیوں کے ایک صاف دن میں بابر باز شکرے اور چند یار دوستوں کو لے کر اندجان سے باہر ایک پہاڑی باغ کی طرف روانہ ہوا کہ شکار کے ساتھ وہاں کی بارہ دری میں بیٹھ کر آرام بھی کرلیں گے (باپ کبوتروں کے قریب باز وغیرہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا تھا) یہ دوشنبہ (پیر) کا [illegible] تھا اور باغ ہی میں ایک قاصد مارا مار اس کے پاس پہنچا۔ بابر لکھتا ہے کہ "عجیب سانحہ پیش آ[illegible]۔ پہاڑ کی چوٹی سے اخسی کا کبوتر خانہ کبوتروں اور عمر شیخ میرزا سمیت نیچے گرا اور اسی کے ساتھ میر[illegible] کی روح عالم بالا کو پرواز کرگئی"۔ پھر صراحت کرتا ہے کہ "اس مہینے بارہ برس کی عمر میں میں فر[illegible]نہ کا بادشاہ ہوگیا"۔

خزف ساحل کی طرح لڑھکتے پھرنا

خبر سُن کر بابر نے پہلے [illegible] کیا کہ محل سرا کو جائے۔ وہ عمل فوراً کرتا تھا، سوچتا بعد میں تھا۔ چنانچہ شکرا ایک نوکر کے [illegible]والے کیا اور سوار ہو کر سرپٹ باغ سے چلا۔ ساتھی پیچھے پیچھے آتے رہے۔ شہر کے بازار میں [illegible]داخل ہُوا ہی تھا کہ سامنے سے محل کا ایک مہتمم آیا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر خبردار کیا کہ قلعے میں [illegible] ملک سے ہو قید کرلیے جاؤ۔ عمر شیخ کے مرنے سے وادیٔ فرغانہ چوپٹ پڑی رہ گئی تھی [illegible] کوئی بھی رئیس امیر جس کی جمعیت مضبوط ہو اور مرحوم والی کے خاندان کی وفاداری بالائے طاق [illegible]ٹھنا چاہیے، وہی اس کو اُچک لے۔ اب بابر اور آنے والا سردار دونوں شہر کے پار عیدگاہ[1] کی طرف چل پڑے۔ جس کے باہر ٹیلیوں سے جنوبی کوہستان کو راستہ جاتا تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر

---

[1] بہ تصحیح مترجم۔

بابر آزاد رہتا اور انتظار کر سکتا تھا کہ واقعات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن عیدگاہ کے قریب ایک قدیم ملازم نے انھیں آلیا اور پیام دیا کہ قائم مقام قاضی نے کہا ہے کہ بابر سیدھا شاہی دیوان میں آئے۔ بابر بلا تاخیر وہاں گیا اور دیکھا کہ وہ بزرگ قاضی معدودے چند وفادار عمائد کے ساتھ یہ بحث اور ہر پہلو پر گفتگو کر رہا ہے کہ نوعمر لڑکے کے لیے کیا کیا جائے جو خود حکمرانی کے قابل نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان کا ایک تاریخ نویس لکھتا ہے کہ اس وقت بابر کی حالت "ساحل کے خزف کی سی تھی جو ہوا سے اِدھر اُدھر لڑھکتا پھرتا ہو۔"

اسے ان فوجی سرداروں کی جنھیں عمر شیخ میرزا نے جاگیریں دے رکھی تھیں، مدد کا ایک سہارا نظر آتا تھا ورنہ حالات بہت ہی خراب تھے۔ لاابالی باپ نے اپنے طاقتور رشتہ داروں سے جھگڑے مول لیے تھے، اب وہ سب بابر کو متوارث ہوئے۔ ان عزیزوں میں سب سے اول تو بڑا چچا احمد تھا جو سمرقند سے بڑھا آتا تھا اور فرغانہ کے م[illegible]بی قصبات نے اس کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ اب وہ اندجان پر پیش قدمی کر رہا تھا اور اِدھر ا[illegible]ں کا حلیف، یونس خاں کا بڑا بیٹا سیردریا سے اوپر چل کے قلعۂ اخسی کی طرف آرہا تھا جہاں بابر کی ماں اور چھوٹا علاتی بھائی گھرے رہ گئے تھے۔ کچھ اور دشمن جاگیرداروں کو مشرقی پہاڑوں کے ایک درے میں چین کی کاروانی شاہراہ پر دیکھا گیا تھا۔

قاضی نے حملے روکنے کی پریشان گفتار تجویزوں کو رد کردیا اور کہا کہ خورد سال بادشاہ کے لیے صرف ایک ہی چارۂ کار ہے کہ اپنے چچا احمد، والئی سمرقند سے جس کی لڑکی بابر سے منسوب ہو چکی تھی اور حملہ آوروں میں وہی سب سے طاقتور ہونے کے ساتھ کریم النفس بھی تھا، مدد کی التجا کرے اور پھر معاملہ خدا کی مرضی پر چھوڑ دے۔ بابر نے یہ رائے فوراً مان لی [illegible] بعد اپنے بھلے سادہ چچا سلطان احمد کی کس چابک دستی سے یہ تصویر کھینچی ہے:

"وہ ذہن و ذکا سے خالی، سیدھا سادہ ترک تھا۔ اختیاط سے بل دے کے پگڑی باندھتا۔ پابندی سے پنجوقتہ نماز ادا کرتا، حتیٰ کہ نا و نوش کے جلسوں میں بھی جن کا سلسلہ ۲۰، ۳۰ دن تک چلتا وہ یہ فریضہ ترک نہ کرتا تھا۔ پھر وہ اتنے ہی دن تک شراب کو منہ نہ لگاتا اور اس کی جگہ تیز مسالے[1] کے کھانے کھاتا تھا۔

---

[1] فارسی ترک میں معاجین یا منشیات لکھا ہے۔ مترجم۔

شہر میں پلا، بڑھا مگر کوئی تعلیم نہیں پائی۔ انصاف پسند آدمی تھا اور ہر قانونی مسئلے میں اپنے پیر مرشد سے مشورہ کرتا۔ دادرسی کے وقت اخلاق اور آداب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ زانو تک نہیں بدلتا تھا البتہ ایک دفعہ جب فرش کے نیچے ہڈی نکلی، اس نے پہلو بدلا۔ بہت اچھا تیرانداز تھا کہ میدان کے پار گھوڑا دوڑاتے ہیں بانس پر رکھے ہوئے سبو[1] پر بار بار ٹھیک نشانہ لگاتا تھا۔ آگے چل کر جب تن وتوش زیادہ ہوگیا تو سلطان احمد میرزا نے گھوڑے پر شکار کھیلنا چھوڑ دیا۔ صرف شاہین اور جرے سے تیتر بیٹر شکار کراتا تھا۔ فطرتاً سادہ مزاج، کم سخن، بالکل اپنے خوانین کی رائے پر چلنے والا۔ خرچ کرنے میں جان چُراتا تھا۔"

قاضی کی نصیحت کے مطابق بابر نے جلدی سے ایک سفیر سلطان احمد کی خدمت میں روانہ کیا اور "فرزند اور خادم" کی حیثیت سے اظہار اطاعت کے ساتھ صرف اپنے شہر پر بدستور حاکم رہنے کی درخواست کی۔ نیک دل احمد یہ پیش کش قبول کر لیتا لیکن اس کے سرداروں نے ایک لڑکے کی، جو قابو میں آچکا تھا، شرطیں ماننا محض لایعنی خیال کیا۔ سفارت ناکام رہی۔ احمد کے رسالے سیدھے اندجان کی طرف چل پڑے۔

یہ شہر خوش فضا، گرد ہرے بھرے کھیت، تجارت کی گرم بازاری تھی لیکن قلعہ بند تھا۔ ندی کے کنارے اس کا بالا حصار بھی نیچا بنا ہوا تھا۔ گرد کی خندق پاٹ کر، اوپر بازار سا بن گیا تھا۔ ادھر اکثر باشندے بھی ایک لڑکے کے لیے لڑنے مرنے کو تیار نہیں نظر آتے تھے۔ یہاں کے عام لوگ سوداگر ہوں، اہل حرفہ یا کسان عموماً تاجیک، قدیم سے اسی سرزمین پر بسے ہوئے تھے اور صدیوں سے پہاڑ پار کے جو مغل، ترک، تتار حملہ آور آتے اور حکومت جماتے رہے ان کی باہمی جنگوں میں حصہ نہ لیتے تھے۔ امیر امرا مسلح عسکری جو بابر کی رفاقت میں جمع ہوئے (حسن یعقوب بھی ان میں تھا) وہ حصار کی فصیل کے رخنے بند کرنے اور شہر کی منڈی سے اجناس خوردنی فراہم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اس عرصے میں، سلاخ نے عمائد کو ترغیب دی کہ اپنے چھوٹے سے بادشاہ کو لے کر چلیں اور کم سے کم دیکھیں تو سہی کہ دشمن کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر جمعیت نکل کر چلی۔ "قاضی صاحب نے دعا دی خدا اس کا انجام بخیر کرے۔"

---

[1] اصل لفظ "قبق" ہے۔ مترجم۔

شام تک یہ جماعت ایک دھنسی ہوئی ندی کے کنارے پہنچی اور دوسرے کنارے پر سلطان احمد کے رسالوں کا کالا کالا دَل بادل معائنہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ گذرا اس نے بابر پر بہت گہرا اثر کیا۔
سمرقندی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آرہے تھے، انھوں نے جو اندجان والوں کو دوسرے کنارے پر دیکھا تو ایک دم ندی کی طرف دوڑے۔ گدلے پانی کی اس دھار پر تپلا سا پُل تھا اور نہ دونوں کناروں پر دلدل تھی۔ اب جو ریلے پر ریلا پُل پر آیا تو گھوڑے کیچڑ پانی میں گرے اور اونٹوں نے بھاگنا، بھاگ بھاگ میں دولتیاں جھاڑنی شروع کیں۔ رات کا اندھیرا ہونے تک کوئی سردار یا سالار اس طوفان بے تمیزی کو قابو میں نہ لاسکا۔ رات آنے پر سمرقندی سپاہ نے اپنے مضروب ساتھیوں کو سنبھالا اور دایں چل دی اور پھر دوسرے دن بھی نظر نہیں آئی۔ تجربہ کار سرداروں نے بابر کو بتایا کہ سمرقند کی ایک فوج پہلے بھی اس پُل پر مصیبت اٹھا چکی ہے۔ وہمی لوگوں کو اب یہ خوف ہوا کہ یہاں جو لوگ پہلے مرے تھے اُن کی رُوحیں لڑنے آگئی ہیں۔ مشیروں نے احمد کو رائے دی کہ وہ [illegible] اور بہت سے سپاہی علیل ہو گئے ہیں واپس چلنا چاہیئے اور نیک مزاج بادشاہ نے پھران کا مشورہ قبول کر لیا۔
مگر اثر پذیر حساس بابر نے یہی اعتقاد کیا کہ دشمن سے پہلے مقابلے میں خدائے تعالیٰ نے میری مدد کی۔
ادھر پُل کی اس عجیب و غریب شکست نے اَخسی کی قسمت پر بھی اثر کیا کہ یہاں جو اندجان کے خلاف سابقہ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے بلند پہاڑی پر مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا، اس میں عمر شیخ مرزا کے سرداروں نے ڈٹ کر یونس خاں کے بیٹے کا مقابلہ کیا۔ پھر جب اس نے سنا کہ سلطان احمد فرغانہ سے واپس چلا گیا تو خود بھی اُلٹا پھر گیا۔ اس طرح چند حوصلہ مند بہادروں کے جمے رہنے سے (خُوں میں) وادی کا مشرقی حصہ بھی بابر کے پاس رہا اور وہ اس موقع پر جرأت دکھانے سے جو [illegible] ہوا تھا اسے عمر بھر نہیں بھولا۔
اس واقعہ کے بعد ہی بابر بہت جلد اَخسی باپ کی قبر پر گیا۔ یہ پہاڑی کی چوٹی پر بنی تھی، فرغانہ لوٹ جانے سے پالتو کبوتر بے گھرے رہ گئے اور ادھر ادھر دیواروں پر اڑتے رہتے تھے۔ عمر شیخ ان کو انہیں دانہ ڈالتا تھا۔ بابر نے خیال کیا کہ "مرحوم کا فیض عام تھا اسی طرح اس کی روح کی برکت وسیع ہو گی" اس نے فاتحہ پڑھی، قبر کے گرد پھرتا رہا پھر فقیروں کو جو اسی امید میں کثرت سے جمع ہو گئے تھے

حسب دستور خیرات تقسیم کی۔ چلنے سے پہلے ایک شکاری کو حکم دیا کہ کبوتروں کو روزانہ دانہ کھلایا کرے۔
بابر کے بہت سے سپاہی مشرقی دروں سے حملہ آوروں کو نکالنے گئے وہ خود اہل محل کو لے کر واپس اندجان آیا جہاں اس کی ماں عدت میں گوشہ نشین ہوئی۔ یوں بھی وہ خاموشی پسند عورت تھی اور اپنے بچوں کے بے قابو مزاج پر انھیں سمجھانے، فہمائش کرنے کی بجائے دل میں گھٹا کرتی تھی۔ ہوش مندنانی کا یہ حال نہ تھا۔ بابر رائے زنی کرتا ہے کہ "عقل سلیم اور فراست میں بہت کم عورتیں شہزادی ایلسان دولت کی مثل ہوں گی۔ وہ بہت دور کی بات دیکھ لیتی اور اسے جانچ لیتی تھی" وہ بالا حصار کے دروازے کے برج میں آرہی کہ آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔ بابر کے خاص خاص دوستوں سے اخلاص و محبت کرنے پر اعتراض کرتی اور ایک پرانی مثل سنایا کرتی تھی کہ " بادشاہی کوئی رشتہ کنبہ نہیں جانتی"۔ اسے چوگان کے کھلاڑی، ظریف الطبع حسن یعقوب کے وزیر بنائے جانے پر بھی اعتراض تھا۔ فرغانہ میں صرف حسن ایسا شخص تھا جس نے سمرقند کے اکابر سے صلح صفائی کا راستہ نکال لیا اور ادھر سے بھی گویا اظہار دوستی کے لیے اسے ایک شادی کے جشن میں شرکت کی دعوت بھیجی گئی تھی۔ اپنے دید بان سے ایلسان یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے محترم قاضی صاحب کو اپنے پاس بلایا۔ پھر تند مزاج قاسم کو طلب کیا اور آخر بابر کو بلا کر برا بھلا کہا۔ اسے خود رائے قرار دیا اور کہا کہ لوگوں کے کہنے سننے میں آجاتا ہے مگر جس بات کو خود کرنا نہ چاہے اُسے کسی کے مشورے سے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

بخلاف بابر کے، اس کا علاتی بھائی جہانگیر (اور یہ نام آل تیمور میں بہت مقبول تھا) جس کی دس برس کی عمر تھی، حسن یعقوب جیسے اقتدار طلب وزیر کے بلا دقت قابو میں رہ سکتا تھا۔ پھر بابر سے ایلسان نے تقاضا کیا کہ نئے بادشاہ کا سب سے پہلا کام کرنے میں دیر نہ لگائے اور وہ یہ کہ اپنے چھوٹے بڑے جملہ متوسلین کو اراضی عطا کرے اور بادشاہ کے متعلق ان کی خدمات و فرائض انھیں بتائے۔ یہ کام خاطر خواہ ہو گیا تو خواہی نخواہی اس کے وفادار رہیں گے۔ بابر کو اس بارے میں تامل تھا اور ادھر حسن یعقوب نے اپنا احسان مند بنانا شروع کر دیا تھا۔

بابر نے ناتی سے کہا کہ حسن یعقوب نے سمرقند والوں سے سردست صلح کرا کے ہمیں فائدہ پہنچایا اور خود ان کے بلاوے پر بھی سمرقند جانے سے انکار کر دیا، ایسے شخص کے ساتھ کیوں بد گمانی کی جائے؟

۱؎ بہ تصحیح مترجم۔

مگر ایسان کے نزدیک بابر کا اُسے قابل اعتماد سمجھنا محض اس وجہ سے تھا کہ وہ اسے پسند کرتا تھا سالے اندجان میں تنہا حسن یعقوب سمرقند کے قاصدوں سے گفت وشنید کیا کرتا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ موقع ہاتھ آتے ہی امرائے سمرقند کی فوجی مدد سے وہ عمر شیخ کے فرزند اکبر کو الگ کر کے جہانگیر کو اس کی بجائے کٹ پتلی بادشاہ کے طور پر تخت نشین کر سکتا ہے۔

سلطان علی کا غائب ہونا

آئندہ ایام میں بابر نے دیکھا کہ یعقوب اپنا کام خوب انجام دے رہا ہے لیکن بعض پرانے سپاہیوں کے ساتھ نخوت سے پیش آیا اور انھوں نے قلعے میں آنا موقوف کر دیا۔ ایسان کی نگاہ اور دور تک جاتی تھی۔ اس نے قاضی، اور قاسم بیگ کے ساتھ شاہی سرداروں کو بلوایا۔ پھر بادشاہ سے پوچھے بغیر یہ لوگ مسلح ساتھیوں کو لے کر حسن یعقوب کی تلاش میں گئے مگر بالا حصار کے ایوان میں وہ کہیں نہیں ملا۔

اصل میں بابر کا یہ ظریف وزیر شہر کے عیدگاہ دروازے سے ندی کے پار سمرقند کی سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ قاسم بیگ نے اِدھر اُدھر سے کچھ سپاہی جمع کئے اور تعاقب کرنے چلا تو معلوم ہوا کہ حسن یعقوب ایک جمعیت فراہم کر کے اخسی کی طرف مڑ گیا ہے کہ اس قلعے کو اچانک جا دبائے اور پھر اپنے متوقع سمرقندی حلیفوں سے صلہ حاصل کرے۔ لیکن اب ایک اور تقدیری واقعہ یہ پیش آیا کہ حسن یعقوب نے ضابطہ پسند قاسم کو دھوکا دیا اور پھیر کھا کے اس کے پڑاؤ پر شبخون مارا مگر اندھیرے میں خود اپنے ایک ساتھی کا تیر کھا کے، کچھ ایسے زخمی ہوئے کہ گھوڑے پر چڑھنے کے قابل نہ رہا اور پھر اسی رستاخیز میں گھوڑوں کی روند میں آ کر ہلاک ہو گیا۔ بابر کی حتمی رائے ہوئی کہ "اس طرح تقدیر الٰہی اس کی دغابازی کا انتقام لینے کی تاک میں تھی"۔ پھر طفلانہ جوش میں بابر نے پختہ ارادہ کر لیا کہ کمال تقویٰ کی زندگی گزارے گا۔ چنانچہ مشتبہ کھانوں[1] سے پرہیز کیا۔ چھری، دسترخوان تک پاک وطاہر رکھنے پر توجہ کی۔ پچھلے پہر کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے لگا۔ اس نے قاسم بیگ کو محل سرا کا آغا اور اپنے شہر اندجان کا حاکم مقرر کیا۔ ایسان کو بھی اس [illegible] اعتراض نہ تھا۔

خزاں میں اس مرتبہ برف نے وادی فرغانہ کے راستے بند کر دیے تھے۔ نو عمر بادشاہ کو چند [illegible]

[1] مصنف نے یہاں ناقص سے "حرام گوشت" تحریر کیے ہیں۔ مترجم۔

اطمینان رہا لیکن آئندہ سال (۱۴۹۵ء) باہر سے بُری بُری خبریں آنے لگیں۔

سمرقند میں شریف مزاج اور بیکار شہریار سلطان احمد میرزا کا انتقال ہوگیا جو امیر تیمور کی بادشاہی کی آخری پرچھائیں تھا۔ کوہستانی ولایات میں عمر شیخ اور اس کے بھائیوں کے زمانے ہی میں حالات ابتر و پراگندہ ہوگئے تھے۔ اب بھائی بھتیجوں کے جھگڑوں نے جن میں سے ہر ایک فوجی جمعیت رکھتا اور تیموری وراثت کا دعویٰ دار تھا، انھیں اور بھی خراب و یاس انگیز بنا دیا۔ ادھر جیحوں پار کی خطرناک مغل ٹولیاں نمودار ہونے لگیں جنھیں زمین یا لُوٹ کی تلاش تھی خود سمرقند ایک فصیل بند اکھاڑا بن گیا جس میں سازش و غابازی کے ساتھ سرگرم کار تھی اور شہر والوں کو لوٹ مار سے بچنے کی پڑی تھی۔ لٹیرے سر بازار نئی نئی بدمعاشیاں دکھا رہے تھے۔ سپاہی لوگ جو شہر کے مالک بنے ہوئے تھے طرح طرح کے شرمناک سانگ بھنڈیلوں سے کراتے اور سرعام امردوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اکڑتے پھرتے تھے۔ بابر کا بیان ہے کہ "کوئی شخص بغیر امرد کے نہیں نظر آتا تھا۔ لوگ رات کے وقت اپنے رضاعی بھائیوں کے بچوں تک کو اٹھا لے جاتے تھے۔"

بابر نے سمرقند کی بدنظمی کا تاریک نقشہ کھینچا ہے۔ وہ جن کو پسند نہیں کرتا ان کی خبر لینی خوب جانتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اب ایک نیا عزم اسے تحریک میں لا رہا تھا۔ عمر شیخ میرزا کے تھوڑے ہی دن بعد سلطان احمد کی وفات ایک شگون معلوم ہونے لگی تھی۔ ریشہ دوانی کرنے میں اسے مہارت نہ تھی اور سازشوں سے جب تک اس کے مفید مطلب نہ ہوں، الگ رہتا تھا۔ اس میں لوگوں کی محبت حاصل کرنے کا ملکہ خداداد تھا اور نانی کی تنبیہ کے باوجود اس صفت پر بھروسہ کرتا تھا۔ ایسان اور بابر کی ماں دونوں کو گذشت اقبال مندی کا غم تھا جب کہ عمر شیخ کی فرغانہ کے پار دُور دُور تک حکمرانی تھی اور انھوں نے بڑے بڑے درباروں کے ناز و نعم دیکھے تھے جو اب قصۂ پارینہ ہو چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ فرغانہ کا الگ تھلگ ہو جانا ایک طرح کی وقتی حفاظت کا باعث ہوا تھا۔ مگر یہ بیبیاں اس حفاظت کی پائیداری پر شک رکھتی تھیں۔

ان اثرات کے تحت بابر نے اپنا ایک مقصد سب سے الگ بنایا۔ وہ یہ کہ سمرقند کو لینے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اندجان میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں تخت شاہی حاصل کرنا ہے تو وہ تیمور کا تخت ہونا چاہیئے۔

اس کے حالات پر نظر کیجیے تو اس ہوس کا پورا ہونا غیر ممکن بات تھی۔ مگر اس کوشش کے سلسلے میں لڑکے نے ایک عزم مصمم کی ضرور پرورش کر لی۔ دو سال ہاتھ پاؤں مارنے سے اس کے متبعین دو ایک سرحدی بستیاں لینے کے سوا اور کچھ کامیابی نہ پا سکے۔ تاہم بعض نکالے ہوئے امیر اور کچھ گشت لگانے والے مزدور اس کے پاس پہنچے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ انھوں نے اپنی آمد کی باقاعدہ خبر کرا دی تھی۔ نو عمر بابر نے بھی تازہ وارد بھرتی ہونے والوں کی خاص طرح درباری پذیرائی کی "میں ایک شہ نشین پر تکیہ لگا کے بیٹھا جیسی کہ سلاطین تیموری کی رسم ہے اور جب یہ چھوٹے چھوٹے ملوک قریب آئے تو اٹھ کر تعظیم دی، بغل گیر ہوا اور مسند پر اپنی دائیں جانب انھیں جگہ دی۔"

مغل رنگروٹ کوئی حکم نہیں مانتے تھے۔ بابر نے قاسم سے کہا کہ ان میں سے دو چار کو قتل کر دے کہ دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ قاسم نے حکم کی تعمیل کی لیکن چند سال بعد انھی مغل سپاہیوں کے خون کا بدلہ خون کے خوف سے اُسے بابر کی نوکری چھوڑنی پڑی۔

اس اثنا میں سمرقند کی بیرونی محاذات سے بابر کو ایک نفع یہ ہوا کہ وہاں کے شکست خوردہ سپاہی اس کی فوج میں آنے لگے جس میں بہر حال استقامت تھی۔ اس کے ایک عم زاد بھائی سلطان علی میرزا کو اندھا کرنے کے لیے تپتی سلاخ آنکھوں سے چھوائی گئی تھی۔ وہ بھی بچ کر بھاگا اور محتاط لفظوں میں بابر کی طرف داری کرنے کا عہد و پیمان کیا۔ پھر جس طرح اس کے ساتھ قرارداد ہوئی تھی، گھاس خشک ہونے کے وقت، مئی ۱۴۹۷ء میں بابر نے سمرقند پر، خوانین کے مختصر گروہ مسلح شہری اور جلو باشیوں کو لے کر پیش قدمی کی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر کو البیان کے پاس چھوڑنے میں کچھ حرج نہیں سمجھا اور کوئی معتمد علیہ نگرانی کے لیے نہیں چھوڑا۔ آیندہ ثابت ہوا کہ یہ بڑی فروگذاشت تھی۔

بابر نے خوشی خوشی سمرقند کی سرحد کی ندی پار کی۔ راستے میں کئی بستیاں لیں، جوان بھرتی کیے خوش منظر پہاڑی گاؤں شیراز کے قریب کئی سو اچھے مسلح سپاہی جن میں ایک دبلا سردار بھی تھا، ملاقی ہوئے اور اس نے بطیب خاطر انھیں اپنی ملازمت میں شامل کیا۔ ایک مدت بعد معلوم ہوا کہ اصل میں یہ لوگ پہاڑی محاذوں پر اسے روکنے کے لیے سمرقند سے بھیجے گئے تھے۔ اس کا افراری حلیف سلطان علی مشرق سے نہ آیا۔ بابر نے اس کے غائب ہونے کی زیادہ فکر نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر پیدائشی قسمت آزما تھا مگر کسی سلطنت کی تعمیر

لہ صحیح پورا نام: ویس لاغری۔ مترجم۔

کا اس میں مادّہ نہ تھا۔ اس نے حکومت کرنا بھی زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر ہی سیکھا۔

شوال کا چاند دیکھ کر عید الفطر کا دُگانہ ادا کر کے بابری لشکر آگے بڑھا اور ان پہاڑی باغوں میں ڈیرے ڈالے جہاں سے امیر تیمور کے قلعے کے چمکتے گنبد اور خاکی فصیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ اندر سے کچھ سلحشور لڑنے نکلے۔ ان سے بابر کے دلیر تر سپاہیوں نے شمشیر زنی کی۔ ان کا غلبہ دیکھ کر بابر مسرور ہوا کیونکہ وہ ہر بات جو فال نیک کا پہلو رکھتی ہو اچھی طرح یاد رکھتا تھا۔ ایک دن سمرقند کے دو امیر جو شہر کے باہر چمنستانوں کے لیے لڑنے آئے تھے، زخمی ہوئے۔ ان میں سلطان تنبل کے برچھی لگی تھی مگر وہ گھوڑے سے نہیں گرا۔ البتہ دوسرا جو شہر کا بڑا قاضی تھا[1]، گلے پر زخم کھا کے اسی وقت مر گیا۔ بابر نے روزنامچے میں لکھا کہ "وہ صاحب علم وفضل شخص تھا۔ ایک وقت میں میرے باپ نے اس کی بہت عزت حرمت کی اور اسے مُہردار مقرر کیا تھا۔ وہ سب سے اچھا باز کا شکاری تھا اور کہہ رُبا سے طرح طرح کے کرشمے دکھانے جانتا تھا۔"

نوعمر بابر کی اوہام پرستی بڑھ رہی تھی لیکن ایک عملی وجدان رکھتا تھا جس نے لُٹے ہوئے سوداگروں کے معاملے میں اس کی صحیح رہ نمائی کی۔ جب سے اس کا لشکر نواح شہر پر قابض ہوا اُنھیں آس پاس کے سرسبز علاقے کا دانہ چارہ افراط سے مل جاتا تھا جس کی شہر کے اندر فوجیوں میں نامیسّری تھی۔ شہری اور تاجر جنھیں خانہ جنگی سے تعلق نہ تھا، بابر کے لشکر میں آنے جانے اور پڑاؤ کے بازار میں اجناس کا مبادلہ کرنے لگے تھے لیکن ایک دن بابر کے سپاہیوں پر طمع غالب ہوئی کہ انھوں نے ان تاجروں کا مال اسباب لوٹ لیا۔ اس پر قاسم بیگ اور خود بابر نے سپاہیوں سے مطالبہ کیا کہ سارا سامان جو لوٹا گیا ہے سمرقندیوں کو واپس کر دیا جائے اور ان کے ساتھ امن وصلح کی جو مفاہمت تھی، بدستور قائم رہے۔ چنانچہ "دوسرے دن کی پہلی گھڑی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایک تاگا اور ٹوٹی سوئی تک ان کے مالکوں کو بجنسہٖ واپس کر دی گئی۔" (لوٹ میں مُغل تیر اندازوں کا بھی ہاتھ تھا۔ اب جو سب سامان واپس کرنا پڑا تو اس بات [illegible] ن قاسم کی طرف سے کینہ ان کے دل میں مزید ہو گیا۔)

صرف ایک بار اندجان والوں نے مورچہ بند قلعے پر حملہ کیا، سو وہ بھی بار در نہ ہوا۔ بعض شہر والے انھیں رات کے وقت "غار عشاق" کے راستے بالا حصار تک لے چلے تھے لیکن جو لوگ ان رہبروں کے

---

[1] فارسی تزک میں "خواجہ کلاں، بڑا بھائی ملا صدر"۔ مترجم۔

کے پیچھے پیچھے چلے وہ رات میں ایسی جگہ پھنسے جہاں قلعہ والے گھات میں بیٹھے تھے۔ بابر کے چند پرانے رفیق یہاں کھیت رہے۔

گرمیاں ختم ہوئیں، سورج برج میزان کی طرف بڑھتا نظر آیا تو بابر کے سرداروں کو سردیاں گزارنے کی فکر ہوئی طے پایا کہ کھلے پڑاؤ کو چھوڑ کر قریب کے ویران قلعوں میں قیام کیا جائے جہاں سپاہی چھتیں ڈال کر پناہ لے سکتے تھے۔ یہ منتقلی ہو رہی تھی کہ اسی رات ایک عجیب واقعہ ہوا جس سے ممکن تھا کہ محاصرہ اسی وقت ختم ہو جائے۔ ہوا یہ کہ چارہ فراہم کرنے والے دوڑے ہوئے آئے اور خبر دی کہ مشرق کے راستے سے سواروں کا ایک لشکر آ رہا ہے۔ بابر کو امید ہوئی کہ شاید غائب ہونے والے حلیف ہوں لیکن ان کے پرچموں پر نئی طرح کی گھوڑوں کی دُمیں لٹکی ہی تھیں۔ سب طے ہوئے تاریک مجمعے کی صورت میں دہقانی لباس پہنے بغیر کسی ساز و سامان یا بھیڑ کے آ رہے تھے۔ نہ انھوں نے کوئی قاصد بھیج کر آنے کی اطلاع دی تھی۔ بارے بابر کے مغل سپاہیوں نے بہت جلد پہچان لیا کہ یہ دریا پار کا اُزبک لشکر ہے۔ ساتھ ہی افواہ اُڑ گئی کہ یہ نوجوان سُلطان بائسنغر کے بلائے ہوئے آئے ہیں جو اس وقت بابر کے مقابلے میں سمرقند پر قابض تھا۔ جنگی فن فریب تو بابر کے حق میں سازگار نہیں ہوئے تھے لیکن ضرورت کے وقت فوری عمل کرنا اُسے خوب آتا تھا۔ شاید اس کی بے خبری بھی اس وقت کار آمد ثابت ہوئی اور ممکن ہے اندجان کی ندی پر مٹھی بھر سپاہیوں سے مقابلہ کرنے میں جو کامیابی نصیب ہوئی تھی وہ اسے یاد آئی ہو کہ اس نے قریبی سواروں کو پکارا اور انھیں لے کر چپ چاپ آنے والے ازبکوں کے سامنے ایک بلندی پر جا کھڑا ہوا۔ اب یہ مقابلہ آپس کے بھائی بھائیوں کی آویزش نہیں تھی بلکہ پشتینی دشمنوں سے جنگ ٹھن رہی تھی۔ اندجان کے تمام سپاہی بہ عجلت اس کے جھنڈے کے نیچے ٹیلے پر جمع ہو گئے۔ ادھر ازبکوں کے سردار شیبانی خاں کو مشکوک صورت میں اندیشہ ہوا کہ کسی پھندے میں نہ پھنس جائے، لہٰذا اپنی فوج کو بڑھنے سے روک دیا۔ دن کے باقی حصے بھر فریقین اسی طرح آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک طرف بابر کے شہری سپاہی دوسری طرف خانہ بدوش لٹیرے جو دارالحکومت کے جھگڑوں میں پاؤں اڑانے آئے تھے۔ شیبانی خاں بابر سے عمر میں بڑا تھا۔ وہ یونس خاں کو اپنے باپ کے قتل کا ذمہ دار گردانتا تھا۔ رات ہوتے ہی اُزبک لشکر محفوظ پڑاؤ کے واسطے پیچھے ہٹ گیا اور جب اگلی صبح بھی قلعے کے اندر سے کسی فوج نے نکل کر اُن سے آ ملنے کا اقدام نہ کیا تو وہ شمال کی طرف چمپت ہو گئے۔ بابر کی اپنے دور اندیش اور آئندہ بارہ برس میں غالب آنے والے

حریف سے یہ پہلی مڈبھیڑ تھی۔

سمرقند میں ایک سو دن

مگر اس بلا جنگ مقابلے نے محصور شہر اسے جتا دیا۔ شہر پناہ کے اندر سامان خوراک کم ہو رہا تھا۔ سردیاں سر پر تھیں اور شہر والے بائسنغر کی حکومت کے تحت بہت مصائب جھیل چکے تھے۔ یہاں بابر کے سوداگروں کے ساتھ فیاضانہ سلوک نے بھی ان کے خیالات پر اثر ڈالا۔ ازبکوں کے بائسنغر کی مدد پر آ جانے کا خوف بھی دور ہوا۔ اب اس کے اُمرا اپنی ریاستوں کو جانے کے لیے کھسکنا شروع ہوئے اور پھر خود بائسنغر چند صد رفیقوں کے ساتھ نکل کر جنوبی راستے پر ہو لیا کہ اپنے خاندان کے دُور دراز رہنے والے حامیوں کا دامن تھامے۔ اس کے جاتے ہی شہری اور نوجوان سوار جوق در جوق بابر کے سرمائی قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ انھیں جلو میں لے کر ہمارا شیر بالا حصار میں گھوڑے پر سوار داخل ہوا اور محل کے باغ میں اُتر پڑا۔ اب وہ تیمور کے شہر اور اس کی وادی کا بلا شرکت مالک تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا، خدا کی عنایت سے ہوا۔

عمر شیخ کے فرزند نے پائے تخت کا جہاں دس برس قبل بچہ سا آیا تھا، اب تفصیل سے جائزہ لیا۔ لکھتا ہے " اتنے پسندیدہ محل وقوع کے شہر دنیا میں کم ہوں گے۔ تب ہی تو اس کی بنیاد سکندر نے رکھی اور یہ محفوظ شہر مشہور ہوا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کی کچی فصیل قدموں سے ناپی جائے۔ یہ پیمائش دس ہزار چھ سو قدم نکلی "

بابر جب کسی مقام کی تفتیش کرتا تو اوپر کے طبقے سے شروع کرتا اور وہاں کی روایات ورسوم اور جو باتیں دل پسند ہوتیں، اُن سب کو محفوظ کرتا تھا۔ سمرقند، فاضل حکما، فلاسفہ اور فقہا کے مآثر کا خزانہ تھا۔ وہاں کے باشندے سنت والجماعت حنفی مذہب کے سچے اور پکے مسلمان تھے۔ اس کی ندی جو کوہک پہاڑی کے دامن میں بہتی ہوئی آتی تھی، اپنے رجبہوں سے پورے میدان کو سیراب کرتی تھی اور یہاں کی زرخیز مٹی میں نہایت رسیلے سیب اور وہ گہرے رنگ کے انگور ہوتے تھے۔ جو ذبیح مترجم / صاحبی موسوم تھے۔

" بالا حصار کے اندر امیر تیمور صاحب قران نے چار منزلہ محل تعمیر کیا تھا جو نیلے محل کے نام سے

شہرہ آفاق ہوا۔ "آہنی دروازے" کے اندر پتھر کی عظیم جامع مسجد بنائی، جس کے دروازے پر آیۂ قرآن "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا"[1] کندہ ہے۔ واقع میں یہ نہایت پُرعظمت عمارت ہے"۔

شہر کے ایک دروازے کے قریب ایک مدرسے اور درویشوں کی خانقاہ کے آثار باقیہ تھے اور اسی احاطے کے اندر امیر تیمور اور اس کے اخلاف کے گنبدوں نے سمرقند میں بادشاہی کی "مقبرے تھے۔

عالم شادمانی میں بابر اپنے آپ کو بھی اسی درخشندہ زمرے میں تصور کر رہا تھا۔ اسی زمرے میں بزرگ فاتح کا وہ پوتا شامل تھا جس کا دنیائے علم و فضل میں نام روشن ہوا۔ یعنی اُلغ بیگ بطلیموس جغرافیہ نگار کی کتاب المجسطی کا شارح۔ "اسی نے دامن کوہک میں سہ منزلہ رصدگاہ تعمیر کی تھی اور اسی رصدگاہ کی بدولت ستاروں کی وہ "زیچ" مرتب ہوئی جو آج کے دن تک مسلّم و مستند مانی جاتی ہے"۔

علم ریاضی بابر کی دسترس سے باہر تھا لیکن ریاضی کے کمالات کی وہ قدر جانتا تھا کہ اس کے ذریعے ستاروں کے مقامات ماضی و مستقبل کی جدولیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اُلغ بیگ کے غیر معمولی حافظے کی یہ روایت بھی اسی نے سُنی تھی کہ یہ شہزادہ جو کتب بینی کے ساتھ شکار کا بھی شوقین تھا، روزانہ اپنے شکاروں کی کیفیت روزنامچے میں درج کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ سال بھر سے زیادہ کا روزنامچہ کھو گیا تو اُلغ بیگ نے حافظے سے اُسے دوبارہ لکھوا دیا۔ پھر کچھ دن بعد اتفاق سے گم شدہ روزنامچہ مل گیا تو نئے لکھے ہوئے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف تین چار جانور جو وہ مار کر لایا تھا، دوبارہ لکھوانے میں چھوٹ گئے تھے۔

"کوہک کے دامن میں جانب مغرب ایک میدانی باغ کے اندر شاندار "چہل ستون" کی دومنزلہ عمارت بنی ہوئی ہے کونے کے برجوں سے چار مینار اوپر نکالے گئے ہیں۔ ستون سب پتھر کے نئی نئی طرز سے تراشے ہوئے ہیں۔ بعض نالی دار، بعض پیچ در پیچ اور بعض میں دوسری ندرتیں ہیں۔ وسط میں وسیع ایوان بھی ستونوں پر قائم ہے۔ اوپر کی منزل میں چاروں طرف کھلی ہوئی غلام گردش بنائی ہے"۔

اسی طرح نوعمر فاتح نے رعایا کی تفریحی بارہ دری کا نقشہ کھینچا ہے جو ایک وسیع احاطے کے اندر تھی اور ہر طرف چنار کے درختوں کا سایہ تھا۔ انہی کے نیچے لوگوں نے سنگ مرمر کی یہ عمارت

---

[1] فارسی تزک میں: "اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ —— الایہ۔ مترجم۔

بنائی تھی جس کے پتلے پتلے میناروں کے بیچ میں کاشانی چوکوں کا گنبد، سامنے ساکت پانی میں اپنا جھلملا
ہوا عکس ڈالتا تھا ــــ یہ گویا تاج محل کا نقش اول تھا۔

عظیم تختِ شاہی کا بابر نے غور سے معائنہ کیا۔ یہ ایک کوشک کے نیچے رکھا تھا اور پتھر کی ایک ہی بڑ
ڈال کو تراش کر بنایا گیا تھا جس کی لمبائی تیس فیٹ اور بلندی پندرہ (اونچائی) فیٹ تھی۔ اس پر طرح طرح کے
ابھرواں نقش ونگار تراشے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ "یہ دیو ہیکل چٹان بڑی دور سے لائی گئی تھی۔ لوگو
نے مجھے بتایا کہ اسے یہاں قائم کرنے کے بعد اس میں درز آگئی ہے۔

درز نے بابر کو تشویش میں ڈال دیا۔ دوسری نشانیوں کے ساتھ یہ بھی آلِ تیمور کے زوال کی خبر د
تھی اس نے شمار کیا کہ صرف چار مختصر پشتوں ہی میں دس فرماں روا تختِ سمرقند پر باضابطہ متمکن ہوئے
اس کا غائب ہو جانے والا حلیف سلطان علی صرف ایک دو دن اور اس کا بھائی بائسنغر چند ماہ باد
رہے۔ بڑی کوشک کے گرد باغ میں ایک اور بارہ دری کی چھت پر چینی کے چوکے تھے۔ اسے جنگلی اُزبک
حملہ آوروں نے بڑی طرح نقصان پہنچایا تھا۔ گو تختی مسجد کی شکستہ دیواروں کی کبھی مرمت نہ ہوئی تھ
بچپن میں بابر نے یہاں کے عجائبات دیکھے تو ان خرابیوں پر اس کی نظر نہیں گئی تھی۔ مگر مسجد کے چھوٹ
دالان کے فرش پر اس نے پاؤں مارا تو اس وقت بھی وہی عجیب صدا "لق لق" گونجی۔ "یہ حیرت ناک بات
ہے اور کوئی شخص اس کا بھید نہیں جانتا۔"

بہرحال شہر کے تجارتی وسائل کا حساب کر کے بابر نے دل کو تسلی دے لی۔ سمرقند میں ہر پیشے والوں کا
الگ بازار تھا۔ سب سے بہتر نان بائیوں کی دکانیں تھیں۔ دنیا کا نفیس ترین کاغذ سمرقند میں ملتا تھا ا
وہ قرمزی ریشم جس کی یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی (اسی کے رنگ سے انگریزی لفظ "کرمزن" مروج
ہوا ہے) پھر بابر نے باہر کے مرغ زار اور سرمائی و گرمائی مقامات کی سیر کی، جہاں سمرقند کے خوش حال
لوگ جا کے رہا کرتے تھے۔ انھیں "تورُوغ" کہتے تھے اور یہاں ملوک و امرا کے خاندان ہفتوں قیام کرتے
تھے۔ پردے کی دیواریں اغیار سے ان کی نگہبانی کرتی تھیں۔ اصل میں شہری گلی کوچوں کی مسقف
زندگی کے اندر بند پڑے رہنا ابھی تک ترک و مغل امرا کی عادت نہیں بنا تھا۔

بابر کی نامذاقی کا سامان لطف و نشاط کی ذرا ذرا سی چیز تک جاتی تھی۔ اسے شکایت ہے کہ سمرقن

لہ بہ تصحیح مترجم۔

کے نقش "چار باغ" میں سرو، ناروَن، سفیدار کے درخت موزوں تسم بندی کرکے نصب کیے ہیں، لیکن آبِ رواں کا کوئی انتظام نہیں۔ وہ اس خطّے کے ابلقی خربوزوں کی خوبی تسلیم کرتا ہے مگر کہتا ہے کہ وہ میری وادی فرغانہ والوں کی مثل شاداب و شیریں نہیں ہوتے۔

ابتدائی چند روز کی شادمانیاں بہت جلد فکر و تشویش میں بدل گئیں۔ سمرقند کے جن امیروں نے اطاعت قبول کی بابر نے خاص طور پر ان کا خیر مقدم کیا۔ انہی میں سلطان احمد تنبل سے وہ خصوصی عنایت سے پیش آیا جس کا برچھی کا زخم اچھا ہوگیا تھا۔ اگرچہ فراموش نہیں ہوا تھا۔ لیکن خود بابر کی معجون مرکّب فوج اب باعثِ خلجان ہوگئی تھی۔ سپاہیوں نے بازاروں سے کافی مالِ غنیمت حاصل کیا لیکن لوٹا نہیں تھا کیونکہ اس کی بابر نے اجازت نہیں دی کہ محاصرے کی وجہ سے پہلے ہی اس نے بہت مصیبت جھیلی تھی۔ موسم سرما کی آمد تھی اور نواحی علاقہ اجناس خوردنی سے بہت کچھ خالی کرایا جا چکا تھا۔ بیج تک کے لیے سے اپنے مختصر ذخیرے سے غلّہ تقسیم کرنا پڑا۔ "بھلا ایسے مفلوک شدہ دیہات سے اور کیا لیا جا سکتا تھا؟ ہمارے فوجی لوگ پریشان تھے اور میں انھیں کچھ نہ دے سکتا تھا۔" جاڑے کے موسم نے صورتِ حال کو اور ابتر کر دیا۔ "لوگ گھروں کو چل دینے کی سوچنے اور ایک ایک، دو دو کرکے فرار ہونے لگے۔ جملہ مغول ساتھ چھوڑ گئے اور آخر میں سلطان احمد تنبل بھی چلتا ہوا۔"

سمرقند کے نیم ویران محلوں میں انتظار کرتے کرتے، بابر نے اپنے بزرگ قاضی سے امداد طلب کی تو معلوم ہوا کہ خود اندجان کے گرد مخالف جمع ہو رہے ہیں۔ اس کے مفروضہ حلیف سلطان علی کے ہرکاروں نے تنبل کو تلاش کرلیا اور پھر ان دونوں نے مل کر نئی فوج تیار کرنی شروع کی۔ نامطمئن افراد، مغول کی بگڑی ہوئی جمعیت کو ساتھ ملایا اور بہلا پھسلا کر بابر کے چھوٹے بھائی جہانگیر کو بھی اندجان سے باہر کھینچ بلایا اس کے بعد یہ کہہ کر کہ ہم اسے جہانگیر کے لیے فتح کرنا چاہتے ہیں، سازشیوں نے شہر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔

ایسان دولت بیگم اور قاضی کے خط آئے کہ بلا تاخیر واپس آؤ اور اپنے شہر کو بچاؤ۔ لیکن مذکورہ سازش کی خبروں نے نوعمر بابر کو بالکل سراسیمہ کر دیا تھا۔ ادھر سمرقند میں اس کے پاس ایک ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے۔

قاسم بیگ نے صحیح کہا کہ ہمارے پاس فوج کہاں ہے جسے اندجان بھیجیں پھر اسی نازک موقع پر بابر علیل ہوگیا۔

فکر و تشویش نے بخار میں ایسی شدت پیدا کی کہ چار دن تک خط پڑھنا، احکام جاری کرنا ایک طرف وہ زبان سے بات نہ کر سکتا تھا۔ بحران مرض میں صرف روئی سے پانی اسے چوایا جاتا تھا۔ اسی سے افواہ پھیلی کہ وہ بخار سے جانبر نہ ہو گا۔ سوئے اتفاق سے اسی زمانے میں باغی لشکر کا ایلچی آیا اور اصرار کیا کہ بابر کے سامنے مجھے لے چلو۔ تیمار دار عمال کی غلطی تھی کہ اسے بابر کی حالت دیکھنے کا موقع دیا۔ چنانچہ وہ فوراً اُلٹا ہوا اندجان کے پڑاؤ پہنچا اور خبر دی کہ بابر نزع کی حالت میں ہے۔ اس خبر کو سن کر قلعہ دار نے باغیوں کے سامنے جن کے قبضہ میں جہانگیر تھا ہتھیار ڈال دیے۔ تنبل نے کمال شقاوت سے بابر کے سب سے متقی مزاج طرف دار قاضی خواجہ کو سولی پر لٹکا دیا ــــ بابر تزک میں لکھتا ہے کہ "میں بلاشک و شبہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ بزرگوار قاضی اولیا اللہ میں سے تھا۔ اس حقیقت کا صرف یہ ایک ثبوت کیا کم ہے کہ جو لوگ اس کے خون ناحق میں شریک تھے، چند ہی روز کے اندر ان میں سے ایک شخص بھی دنیا میں باقی نہ رہا۔ سب کے سب ہلاک و بے نشان کر دیے گئے۔ دوسرے خواجہ قاضی کی حیرت انگیز دلاوری بھی اس کے سچے باخدا ہونے کی کوئی معمولی شہادت نہیں ہے۔ اکثر بہادر سے بہادر اشخاص بھی دل میں خوف و خطر سے خالی نہیں ہوتے مگر اس بزرگ کے دل میں ان کا ذرا بھی گزر نہ تھا۔"

سمرقند میں بابر کو افاقہ ہوا تو اس واقعے سے پہلے ہی وہ نانی کا التجا آمیز خط پڑھ چکا تھا کہ اگر ہماری فریاد سن کر تم مدد کو نہ آئے تو سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ سواری کرنے کے قابل ہوتے ہی وہ اپنی سپاہ لے کر مضطربانہ اندجان کی طرف چل پڑا۔ وسط راہ میں اور خود اپنے وطن کی ندی کے کنارے ایک بستی میں خبر ملی کہ اندجان ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی روز دوسری طرف سے اطلاع آئی کہ اس کے رخصت ہونے کے بعد سلطان علی نے سمرقند پر قبضہ جما لیا۔" اس طرح اندجان کی خاطر میں نے سمرقند کو کھویا مگر معلوم ہوا کہ اُسے کھو کر بھی دوسرے کو نہیں بچا سکا۔"

بایں ہمہ بابر کو اذعان تھا اور ساری عمر رہا کہ بخار کی شدت میں اس نے پیر پیران حضرت احرار رح کی طرف (جو کئی سال پہلے جب بابر سات سال کا تھا، فوت ہو چکے تھے) رجوع کیا اور انہی کی شفاعت سے اس کی جان بچی۔

بابر کی قزاقانہ جنگ

عمر شیخ کا فرزند بادشاہی کے دونوں سرے ہاتھ سے کھو چکا تھا۔ چالاک حریفوں کی سازش نے اُسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسے اپنی یاس انگیز حالت کا اندازہ ہوا "میں اپنے ملک اور رفیقوں سے کبھی اس طرح نہیں بچھڑا تھا۔" یہ سوچ سوچ کر وہ غم زدہ ہوتا اور جب کوئی پاس نہ ہوتا، تو روتا تھا۔ حقیقت میں خود اس کی عمر کہ اب وہ پندرہ سال کا ہونے والا تھا، خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ چھوٹے بھائی کو تو مفید مطلب کٹھ پتلی کے طور پر حریفوں نے بچائے رکھا تھا جیسا کہ ایسان پیش گوئی کر چکی تھی لیکن بابر جس نے کچھ روز پہلے سمرقند فتح کیا اور فوجوں کی سپہ سالاری کر دکھائی، دشمنوں کی نظر میں خار تھا اور وہ اس کانٹے کو دُور کرنے کے در پے تھے۔ شکاری ہمارے شیر کو ہر طرف سے گھیرتے چلے آتے تھے اور وہ دو سال تک علاقے بھر میں مارا مارا پھرا کہ محفوظ جگہ کہیں مل جائے۔ اپنی وادی چھوڑ کر نکل جانے کا اس نے خیال نہیں کیا۔ اپنے ماموں محمود خاں خلف یونس خاں کے پاس مدد دینے کے لیے "قاسم بیگ" کو بھیجا۔ اس وقت بابر کی ماں، محمود خاں کی بہن باغیوں کی قید میں تھی۔ محمود خوشی سے فوج لے کر چلا لیکن سمجھ گیا کہ حالات بھانجے کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ اس کے سرداروں نے تنبل کے نائبین سے تحفے تحائف قبول کیے اور اپنے خان کو مشورہ دیا کہ وادی میں خطرہ مول نہ لے، واپس ہو جائے۔ بابر اپنی فوجوں کو اینچ پیچ سے لا رہا تھا کہ ماموں سے آملے۔ اسے بہت مایوسی ہوئی۔ پھر محمود کی واپسی نے خود اس کی فوج میں انتشار ڈال دیا۔ اس کی بے بسی دیکھ کر بہت سے سپاہی اور سردار دونوں سردیاں چمکتے ہی پڑاؤ چھوڑ کر چلنا شروع ہوئے اور ان کے اہل و عیال شہر اندجان کے اندر تھے اور اس مضبوط شہر کو چھین لینے کی کوئی امید نظر آتی تھی۔ لہذا وہ بابر کا ساتھ چھوڑ گئے۔ "ان کی تعداد جنھوں نے میرے ساتھ بے خانماں رہنے مصیبت بھگتنے کو ترجیح دی، کُل دو تین سو ہوگی۔ اسی میں اچھے بُرے سب شامل ہیں۔ یہ صورت میرے لیے سخت روح فرسا ہو گئی اور میں دل بھر کے رویا۔"

ٹھیک اسی زمانے میں باغیوں نے اس کے اہل محل کو آزاد کر دیا۔ شیر دل ایسان کے آجانے سے نواسے کو بہترین مشیر مل گیا۔ تامل کے بغیر خود بابر نے عاجلانہ تاشقند کا سفر کیا۔ محمود خاں سے مدد

مانگنے کے لیے نہیں۔ بلکہ ظاہرا اپنی خالاؤں سے ملنے اور ماں کے واسطے کچھ مسلح دستے مستعار لانے کی غرض سے۔ چنانچہ شمالی جنگ آزماؤں کے چند معقول جوق اُسے مل گئے اور وہ شوق ذوق سے انھیں لے چلا کہ اپنی وادی کے ایک سرحدی قصبے پر حملہ کرے۔ لیکن نئے سرداروں نے بتایا کہ اس پر قبضہ رکھنے کے لیے ہماری فوج ناکافی ہوگی۔ بابر کو زد پر چڑھا ہوا شکار بادل ناخواستہ چھوڑ دینا پڑا۔ البتہ وہاں کے تھوڑے سے مزہ دار خربوزے ہاتھ آئے۔" ان شیخی خربوزوں کا چھلکا کمبخت کی طرح کھردرا اور گودا چار چار انگل ہوتا ہے۔ نہایت لطیف اور لذیذ ہوتے ہیں۔"

بابر کے قبضے میں ایک ہی بستی نجند رہ گئی تھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا یہاں بھی قدم نہیں ٹک سکتے۔ یہ سیر دریا کے قریب سمرقند اخسی کی کاروانی شاہ راہ پر ایک چھوٹا سا مقام اتصال تھا۔ لوگ دریا میں کشتیاں چلاتے یا دام چن کر بسر اوقات کرتے تھے۔ اس بستی میں چند صد مسلح سپاہیوں کی سربراہی کرنے کی استطاعت نہ تھی۔ بابر نے حسب معمول پسند نہ کیا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے بلکہ جس طرح ایک مستعار فوج سے لشکر کا پیکر تیار کیا تھا، اب اونچی پہاڑیوں میں جہاں غلے کے کھیت اور مواشی کے گلے تھے، مستعار لشکرگاہ حاصل کرنے کی تدبیر کی۔ ادھر روانہ ہوتے وقت سلطان علی کا جس کی خاطر بابر نے سمرقند پر چڑھائی کی تھی، ہرکارا پہنچا اور تنبیہی پیام لایا۔ دشمن کا نرغہ بے گھرے شہریار کے گرد تنگ ہوتا جاتا تھا۔ پناہ کے لیے کوئی فصیل بند مقام نہ تھا۔ بابر نے انہی پہاڑیوں کا راستہ تلاش کیا۔ جہاں سابق میں وہ گھوما کرتا تھا اور جہاں اس کے آدمیوں کو خشک میوہ اور شکار ملنے کی امید تھی۔

اس پہاڑی گھونسلے میں، آنے جانے لوگوں نے یہ بھی صلاح دی کہ پہاڑی بلندیوں کے پار ادھر اُدھر ایسی بستیاں ہیں جہاں وہ قیام کرسکتا ہے ان میں ایک رقب جاق خسرو شاہ کی عمل داری تھی جو کسی وقت سمرقند میں وزیر رہا اور علانیہ اُس میں گرفتار رہا۔ مگر بابر نے یہ بات گوارا نہ کی۔ لکھتا ہے۔

"خسرو شاہ پانچ وقت کی نمازیں ضرور پڑھتا تھا۔ لیکن سیاہ دل بخیل، موذی، کمینہ فطرت آدمی تھا۔ ساتھ ہی حلف دروغی کرنے والا غدار ——" یہ الفاظ بابر نے اس وقت لکھے جب سنا کہ خسرو شاہ نے اپنے سابق آقا کے ایک بیٹے کو مروا دیا اور ایک کو اندھا کرا دیا۔" خدا کی ہزار لعنتیں، ایسا کرنے والے پر اور جو اس کا یہ فعل سنیں ان کی لعنتیں تاقیامت اس پر ہوں!"

بابر کو معدودے چند ہی لوگوں سے عناد ہوا، لیکن وہ سب سے بڑھ کر اسی خسرو سے اظہار نفرت

کرتا تھا۔ اوروں کی نگاہ میں خسرو کتنا ہی نرم خو ہو، بابر کی نظر میں اس نے اپنے ولی نعمت کی اولاد کی قبروں پر چڑھ کر اقتدار حاصل کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس روز افزوں لشکر و مال ہونے کے باوجود بابر کو یقین تھا کہ ذاتی طور پر وہ "عظیم پلے میں ایک مرغ کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا"۔ غرض مصلحت کی خاطر بھی اس نے خسرو کا رخ نہیں کیا۔ اگرچہ وہی ایسا طاقتور حاکم تھا جس سے مدد مل سکتی تھی۔ ادھر سے منہ پھیر کے بابر اپنے ساتھیوں کو اتی کوہ سفید کی چوٹیوں پر لے چلا۔ جہاں مہمان نواز قبائل کی جھونپڑیوں میں پناہ مل سکتی تھی۔ ان چٹیل بلندیوں پر کوئی اچانک حملہ نہ ہو سکتا تھا اور نہ کسی تنگ گوشے میں اسے گھیرا جا سکتا تھا۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن جب تنہا گشت لگانے میں اپنے حال پر غور کیا تو اسے عجیب طرح کی مایوسی نظر آئی۔ اب شارع عام پر خجند واپس جانا مخدوش تھا اور ادھر یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان جنگلی قبائل کے درمیان اپنے گھر والوں اور سپاہیوں کو کب تک رکھنا ممکن ہوگا؟

ایک دن انہی افکار میں غلطاں تھا کہ اسے ایک نشانی نظر آئی، یا اس نے اسے نشانی سمجھا۔ یعنی ایک درویش سے جو اسی کی طرح بے گھر تھا، ملاقات ہوئی۔ وہ شہید قاضی کا مرید تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے تعزیت کی اور مل کر دعائے مغفرت، پھر ایک دوسرے کے حال پر افسوس کرتے رہے۔ درویش نے کہا کہ صرف قادر مطلق خدا ہی معاملات کو روبراہ کر سکتا ہے، سہ پہر کو ایک سوار بابر کے پڑاؤ پر آیا اور بابر کے سابق قلعہ دار علی دوست کا، جس نے اندجان کا قلعہ باغیوں کے حوالے کر دیا تھا، تحریری پیام لا کر دیا۔ علی دوست کو تنبل نے قبول اطاعت کے صلے میں فرغانہ کا تیسرا بڑا قصبہ مرغینان حکومت میں دے دیا تھا۔ اب علی دوست نے معاصرین کی اطاعت قبول کرنے کی خطا کا اعتراف کیا اور اپنے اصلی آقا بابر سے درخواست کی کہ وہ خود مرغینان آئے۔ علی دوست شہر اس کے حوالے کر کے اپنے سابقہ جرم کی تلافی کر دے گا۔ مضطرب جلاوطن کو یہ پیغام درویش کی دعا کا اثر معلوم ہوا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ باغیوں نے خواجہ قاضی کو سولی دی تو علی دوست کو انعام کیوں دیا؟

"مایوسی کے بعد، ایسی خوش خبری! ہم اسی گھڑی کہ سورج غروب ہو چکا تھا، بلا تامل سیدھے مرغینان کی طرف چل پڑے، ایسی سرعت سے گویا چھاپہ مارنے جا رہے ہیں۔ وہ جگہ مڑک سے کوئی پچیس فرسخ ہوگی۔ ہم ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک مارا مار چلتے رہے۔ یہاں تک کہ خجند کے ایک

گاؤں کی تپلی ندی پر پہنچ کر دم لیا۔ خود سستائے۔ گھوڑوں کو دانہ چارہ کھلایا۔ شام کی نوبت بجتے ہی پھر سوار ہوئے، صبح تک چلے اور اسی طرح اگلے دن شبانہ روز چلے یہاں تک کہ اگلی فجر ہونے سے کچھ پہلے مرغیناں سے چند میل پر پہنچ گئے۔ یہاں "دبلا آغا"[1] اور دو چار آدمیوں کو ساتھ لایا اور مجھ سے حجت کی کہ "حقیقت میں علی دوست بد آدمی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس سے نہیں ملا۔ اور آپ کے اور اس کے مابین گفتگو یا شرائط طے نہیں ہوئیں۔ پھر کس بھروسے پر ہم جا رہے ہیں؟" ان کا اعتراض بجا تھا لہٰذا میں نے ٹھہرنے کا حکم دیا اور گفتگو کی۔ آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ ہمارے خدشات صحیح ہیں لیکن اب بعد از وقت ہیں۔ دن رات منزلیں مار کر یہاں آئے ہیں اور اب کسی آدمی یا گھوڑے میں طاقت باقی نہیں رہی۔ دوسرے، جائیں بھی تو کہاں جائیں؟ اتنی دور آ جانے کے بعد آگے ہی چلنا ہوگا۔ آئندہ جو کچھ ہوگا، حکم خدا سے ہوگا۔"

"فجر کی نماز کے قریب ہم مرغیناں پہنچ گئے۔ علی دوست اس وقت تک بند دروازے کے باہر نہیں آیا جب تک کہ ہم سے شرائط طے نہیں ہو گئیں۔ طے ہونے کے بعد اس نے پھاٹک کے پٹ کھولے اور میرے سامنے آ کے آداب تعظیم بجا لایا۔ پھر ہم اندر چلے اور شہر پناہ کے اندر ایک مناسب مکان میں گھوڑوں سے اترے میرے ساتھ چھوٹے بڑے کُل دو سو چالیس نفوس تھے۔"

تھوڑے دن بعد وفادار قاسم بیگ اپنے پہاڑی مامن سے ایک سو اور سوار لے کر آیا۔ پشیمان علی دوست کے سپاہیوں نے بابر کی اطاعت کا حلف اُٹھایا۔ اور اس طرح ہمارے شبر کے پاس میدان کا ایک مورچہ بند شہر اور خاصا چھوٹا موٹا لشکر پھر فراہم ہو گیا۔ اس نے تقدیر پر بھروسہ کیا اور سمجھا کہ تقدیر نے یاوری کی۔ لہٰذا سازگار نصیبے سے فائدہ اُٹھانے کی مزید کوشش کرنے لگا۔ قاسم اور معتمد علیہ نائبوں کو اور فوج بھرتی کرنے ادھر اُدھر بھیجا۔ ساری وادی میں دیہ بہ دیہ خبر پہنچی کہ بابر کو پھر قوت حاصل ہو گئی۔ قبائل جو انتظار میں تھے گھوڑوں پر سوار ہو ہو کر اپنے بادشاہ کے فرزند اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گھاس پکنے کے ساتھ شمالی دروں سے ماموں کے سپاہی جوق در جوق غارت کا مال ملنے کی طمع میں آنے لگے۔ اُخسی اور اندجان میں عوام نے ہتھیار سنبھالے۔ خوش مزاج بابر گلی کوچوں میں بہت ہر دل عزیز رہا تھا، ادھر تنبل اور باغی سردار سختی سے حکومت کرتے تھے۔ غرض

[1] مطلب ہے: دُبلی بیگ لاغری۔ مترجم۔

عوامی جذبات کا مرغ باد نما عمر شیخ کے بیٹے کی جانب پھر گیا۔ بلند چٹانوں پر اخسی کے قلعے کو یکایک ہلہ کر کے اور لڑ کر چھین لیا گیا۔ یہ معرکہ اس طرح ختم ہوا کہ تنبل کی فوجیں ندی کے راستے کشتیوں میں آئی تھیں، بابر کے مغلوں نے ان کا حملہ پسپا کیا اور ننگی پیٹھ کے گھوڑوں پر سوار انھیں بھگاتے ہوئے ندی کے اندر تک گھس گئے۔

طوفانی تاختیں، چھاپے، پلٹ کر حملے چھین جھپٹ کے ہنگامے جن کا بابر مرد میدان تھا، گرم تھے کہ اندجان والوں نے بھی بابر کی اطاعت کا اعلان کیا۔ اجیر مغلوں کا سردار وادی سے فرار ہوا۔ اس کے سواروں نے بابر کے اس وعدے پر کہ سابقہ بدعنوانیوں کی اُن سے باز پرس نہ ہوگی، اس کی ملازمت قبول کر لی۔ دو سال تک ادھر اُدھر چھپتے پھرنے کے بعد بالآخر جون ۱۴۹۹ء میں بابر دوبارہ فرغانہ کا مالک ہو گیا کم سے کم خود وہ یہی سمجھا۔

حکومت ہاتھ میں لینے پر اس کا پہلا اقدام نہایت نقصان دہ نکلا۔ اصل میں اندجان کے قدیم رفیقوں پر اجیر مغلوں نے بڑی زیادتیاں کی تھیں۔ اب اس کے عمائد فریاد کر رہے ہیں کہ انہی مغل دشمنوں نے ہم کو اور خواجہ قاضی کے متوسلین کو لوٹا تھا۔ انھوں نے اپنے رئیسوں کے ساتھ وفا نہیں کی تو کیا یہ ہمارا ساتھ دیتے رہیں گے؟ اس میں کیا خرابی ہے اگر انھیں پکڑ کر لوٹ کا مال ہمیں واپس دلوایا جائے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے وہ اُنھی گھوڑوں پر سوار وہی پوشاکیں پہنے پھر رہے ہیں جو ہم سے لوٹ لے گئے تھے۔ ہم سے چھینی ہوئی بھیڑ بکریاں کاٹ کاٹ کے کھا رہے ہیں۔ کیا آپ ہمیں ہمارا مال اُن سے واپس لینے کی اجازت بھی نہیں دیں گے؟

جب بابر کی آوارہ گردی کے رفیقوں نے بھی انہی ہم آل کی تائید میں رائے دی تو بابر کو ان کی درخواست ماننی پڑی۔ اس نے مغلوں کو جو خاموش تھے حکم دیا کہ میری رعایا کا جو سامان وہ شناخت کر لیں، واپس کر دیا جائے۔ بابر لکھتا ہے کہ "ہر چند یہ حکم بجائے خود معقول اور منصفانہ تھا مگر بے موقع عجلت سے دیا گیا، پھر مناسفانہ رائے قائم کرتا ہے کہ "جنگ اور امور ملک داری میں بہت سی باتیں بادی النظر میں عقل و انصاف کے مطابق ہوتی ہیں، لیکن بیسیوں مختلف پہلوؤں پر احتیاط سے غور کیے بغیر ایسا کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے"۔

شیر سبق سیکھ رہا تھا مگر ابھی تک سیکھے پر عمل نہیں کرتا تھا۔ چار ہزار مغل جو اس کی سپاہ کا قوی ترین

حقہ اور اس کی ماں کے متوسل تھے، انھوں نے حکم ماننے سے انکار کیا لوٹ کا سامان لے کر کوچ کر گئے۔ ایک کن کٹے سردار کو جو ذاتی طور پر بابر کا احسان مند تھا، بھیج کر مطلع کیا کہ وہ اس کی نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تنبل کے لشکر میں جا ملیں گے، بابر انھیں روکنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت سے مغلوں کے اطوار سے، جو خود اس کے اجداد کے طور طریق تھے، اسے سخت نفرت ہو گئی اور ان کے نام تک سے جسے "مغول" تحریر کرتا ہے، بیزار ہو گیا۔

اپنے ہاتھوں، جنگ کرتے دشمن تنبل کو صحرائی جنگ آزماؤں کی ایسی زبردست کمک بھیج دی، تو اب نوعمر بادشاہ کو سوار فوج کے حملے سے اپنی چھاؤنی بچانے کی فکر ہوئی۔ ہر طرح کے ہتھیار، آدمی، جانور جمع کیے۔ پیادہ فوج کی حفاظت کے لیے چمڑے کی ڈھالیں اور چلتے تک تیار کر لئے۔ درخت کے گدوں کی باڑیں گاڑ کر مورچہ بندی کی کہ بلا سے سوار فوج کم ہے تو ان کا حملہ ہی روکا جا سکے۔ بایں ہمہ جب تنبل اور اس کے مغل اندجان کو گھیرنے آئے تو بابر نے اپنے دفاعی مورچوں اور چرم پوش پیادوں کو یاد نہ کیا۔ نئی آموختہ مآل اندیشی بھی طاق پر رکھی اور اپنی معجون مرکب فوج کو لے کر میدان میں نکل آیا۔ وادی کے دیہات میں جلدی جلدی اپنے دستے پھیلا دئے۔ ایک دن علی الصباح فریقین کے رسالوں میں ٹکر ہوئی۔ بابر کے آزمودہ کار سردار ڈٹ کر لڑے۔ دشمن کا منہ پھیر دیا، بلکہ چند آراستہ خیمے چھین لیے لیکن آگے تعاقب کرنے سے ابا کیا کیونکہ انھوں نے کہا بھاگتے مغلوں کا پیچھا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ معرکہ تو معمولی سا تھا مگر بابر نے رفیقوں کی تحسین اور انعام اکرام سے اس کی اہمیت خوب بڑھائی۔ لکھتا ہے کہ "میری زندگی کا یہ پہلا میدانی مقابلہ تھا۔ خدائے قدیر نے اپنی عنایت سے مجھے فتح دی۔ میں نے اسے فال نیک سمجھا۔" (مگر اس موقع پر بھی اسے یہ خیال نہ آیا کہ علی دوست نے دشمن کا تعاقب کیوں رکوا دیا؟)

سردیاں آ رہی تھیں، بادشاہ اور بادشاہی کے امیدوار دونوں ہی اپنے خدم و حشم کے لیے چھت کی فکر میں تھے۔ بابر نے وسط وادی کی جھونپڑیوں میں ٹھیرنا پسند کیا جہاں شکار مار کر کچھ نہ کچھ شکم سیری کی بھی صورت تھی۔ وہ شکار کا عاشق تھا۔ "ندی کے قریب پہاڑی بکرے اور ہرن کثرت سے تھے۔ جنگلی سور کا شکار بھی تھا۔ جنگل کی بکھری ہوئی جھاڑیوں میں جنگلی مرغی اور خرگوش کی کمی نہ تھی۔ یہاں کی لومڑیاں دوسری جگہ سے زیادہ تیز پا ہوتی ہیں۔ بکری اور ہرن کے لیے ہم جنگل چھانتے تھے۔ جھاڑیوں کے بن میں پٹکے چھوڑتے، دوشاخہ تیر سے بھی شکار کرتے تھے۔ اس قشلاق میں دوسرے تیسرے

دن میں شکار کھیلنے جاتا تھا۔ یہاں جنگلی مرغی خوب موٹی ہوتی ہے اس کے گوشت کی ہمارے ہاں افراط رہی۔"
ساتھی سردار اس جاڑے بھر شکار و معرکہ آرائی سے زیادہ خوش نہ تھے "چلاک ہونے" سلاخ کو تو
گھوڑے پر چڑھ کر اپنے برادری والوں سمیت اندجان جانے سے زبردستی روکنا پڑا[1]۔
سب سے بڑھ کر علی دوست، جس نے بابر کو پہاڑیوں میں سرگرداں پھرنے سے نجات دلائی،
جتّیں اور بار بار تقاضے کرتا تھا۔ کہ شدید سردی سے بچنے کے لیے دشمن سے عارضی صلح اور اندجان
میں واپس چلنا چاہیے۔ بابر اسے وجدانی طور پر غلط سمجھتا تھا، مگر علی دوست سے جبراً اپنی بات منوانے
کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ "آخر اسی کی رائے ماننی پڑی" ۱۴۹۹ء کا خاتمہ مخدوش آثار میں ہوا۔ سمرقند
ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ فرغانہ پر دعوے کے لیے علاتی بھائی جہانگیر طاقتور دشمنوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا
ادھر وقتی صلح کی بجائے علی دوست نے باقاعدہ صلح نامہ کی شرطیں طے کر لیں۔ بابر کی طرف سے تنبل کو دوستانہ
پیام سلام پہنچائے۔ قیدیوں کا تبادلہ کرا یا اور شرط مان لی کہ بابر صرف اندجان اور سیر دریا کے بائیں
کنارے پر حکومت کرے، اخسی اور دائیں رُخ کا علاقہ تنبل، جہانگیر، سلطان علی جیسے کے حوالے کر دیا
جائے۔ طرّہ یہ کہ بابر کی اتنی سی عمل داری بھی علی دوست کے رحم و کرم پر مبنی تھی اور جب تک دشمن سیر کی دوسری
طرف سامنے خیمہ زن تھا، بابر کو علی دوست کی خاطر رضا جوئی کے بغیر چارۂ کار نہ تھا۔
آگے چل کے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ میدان سیاست کے نئے شاطر کو اپنے اصلی ورثے یعنی وادئ فرغانہ
سے دست بردار ہونے پر تیار کر لیا گیا۔ بشرطیکہ سمرقند اُس کے ہاتھ آ جائے۔ انھی ایّام میں امرائے
سمرقند کے قاصد اس کے پاس آ رہے تھے اور مُصر تھے کہ وہ ان کی مدد سے اس دارالسلطنت میں
واپس آئے۔ امیدیں باندھنے والے لڑکے کو یہ خفیہ بلاوے عین خداساز نظر آئے۔ سمرقند پر حکمرانی
کی آرزو کے ساتھ اپنے طالع سازگار کا بھروسہ بھی ضرور شامل تھا اور یہ اذعان کہ "العزم منّا والاتمام
من اللہ"۔ غرض علی دوست نے تنبل سے مل کر وطنی شہر اندجان حوالے کر دینے کی قرارداد کر لی اور اس
مرتبہ یہ تحویل خود خوش عقیدہ بادشاہ کی رضامندی سے عمل میں آئی۔ بابر کے ذہن میں نہ آیا کہ تیمور کے
تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے کا اب کوئی امکان نہیں رہا۔
پندرھویں صدی کے اواخر میں یورپ والوں میں جنھیں بابر نے کبھی نہیں دیکھا، بعض تبدیلیاں

---

[1] فارسی تزک میں ہے کہ اسے جانے کی آخر اجازت دی۔ مترجم۔

ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ پیئیرِ تو بیار جسے اطالیہ میں لبِ دریا فورنودو کی گمنام سی جنگ میں غیر معمولی جاں بازیاں دکھانے پر بہادر ("نائٹ") کا خطاب ملا، اس کا طریقِ عمل ابھی تک گذرنے والے قرونِ وسطیٰ ہی کے مطابق تھا۔ خدا پر بھروسہ کر کے اپنے بادشاہ کی بے چون و چرا اور بلا خوفِ ملامت اطاعت کرنا ہی اس کا شعار تھا لیکن اسی زمانے میں ایک غیر معروف سا نوجوان سفیر نکولو مکیاولی بھی ریاست فلورنس کی طرف سے دربارِ فرانس میں بھیجا گیا تھا جس نے دورانِ سفر میں شاہ و شہریار کی جنگوں کے بے سود ہونے کا مشاہدہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اطالیہ کی ریاستیں ایک موہوم کلیسا اور سلطنت کی حدود کے اندر رہ کر بھی ذرا ذرا سی بات کے لیے لڑ کر برباد ہو رہی ہیں۔ مکیاولی کی باریک بین نگاہ میں اُس وقت بظاہر نہ کوئی ہمہ گیر کلیسا باقی تھا نہ سلطنت۔ جو کچھ ہوتا تھا وہ قدرتی یا محض تقدیری اسباب ہی کا نتیجہ تھا۔ تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے اُسے یقین کامل ہوا کہ بادشاہ بے دردی سے اپنی شخصی مرضی پر چلیں تو قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا موروثی ظل اللہ بادشاہوں کا دَور ختم ہوا۔ خود ادپر آنے والے مطلق العنانوں کا زمانہ سر پر تھا۔

مکیاولی کے دائرۂ فکر سے باہر، دیگر مقامات یعنی پرتگال کی بندرگاہوں میں نئی نئی سرگرمیوں کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ واسکوڈگاما بعید ترین مشرق سے زندہ سلامت واپس آیا اور ساحلِ ملیبار، ہندستان کی بندرگاہ کالی کٹ سے جہاز لدے پھندے لایا۔ یہ علاقہ اسی نصف دنیا میں تھا جسے چند سال پہلے پاپائے روم کے فتوے نے دریافت حال اور حکمرانی کے لیے بادشاہ پرتگال کے نام لکھ دیا تھا۔ پھر گریگوری تقویم کے سال ۱۵۰۰ء میں ڈگاما کے ہم وطن پیڈرو کیبرال نے کوئی درجن بھر بادبانی جہاز اور بہترین ملاحوں کے ساتھ بحر نوردی کی تیاری کی تاکہ اپنے بادشاہ کے لیے نئی تجارتی بندرگاہیں اور ہندستان میں مزید علاقہ حاصل کرے۔

یہ اس شخص کے، جسے عہد جدید کی تاریخ میں "پہلا مغل اعظم" کہا گیا، شمالی ہند کو فتح کرنے سے ۲۶ برس قبل کی بات ہے۔

باب دُوم

سمرقند سے اِخراج

عورتوں کا مقام

جس وقت بابر خلاف مرضی اندجان کے قلعے میں لایا گیا تو وہ تینوں خواتین جو برابر اس کے ہمراہ پڑاؤ سے پڑاؤ میں ساتھ رہی تھیں، اپنے پرانے دالانوں میں اتریں اور اس جاڑے میں کچھ روز آرام لیا۔ مرد رشتہ داروں کے برخلاف خاندان کی سب مستورات بابر کی وفادار رہیں، سوائے ایک کے۔ اس کی دلاور نانی بھی اپنے برج میں متمکن ہو گئی تھی۔ اب اس پر بڑھاپا آ رہا تھا۔ علی دوست کی نسبت بدظنی کی باتوں سے کہ یہ بھی یعقوب کے متوفی بیٹے کی طرح انھیں سونے کی زنجیریں ڈال کر محض برائے نام بادشاہ بنائے ہوئے ہیں، وہ بابر کو فکرمند کرتی رہتی تھی۔ بہن خانزادہ بیگم جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، سمرقند واپس جانے کے منصوبوں میں اس کی شریک تھی۔ ماں یاد دلاتی رہتی تھی کہ اب وہ انیس سال کا ہو گیا ہے اور شادی کرنے کے تقاضے کرتی تھی۔

اس اثنا میں معلوم ہوتا ہے بابر اپنی تعلیم کی کمی پوری کرنے سے غافل نہیں رہا۔ پچھلی دفعہ پہاڑیوں پر جانے میں بھی دل پسند کتابیں ساتھ لے گیا تھا۔ پھر شہر میں خواجہ احرار کے مرید، بعض مذہبی لوگ بھی اس سے ملنے آئے جنھیں بابر سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ نوجوان بادشاہ اپنے سادہ سپاہیانہ افکار کو کبھی کبھی اشعار کی شکل میں لانے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ جب موج آتی ترکی زبان میں جو عوام کی بولی تھی اور کبھی فارسی میں جو اہل علم کی زبان ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی ندیم عشق و محبت یا عورتوں کے باب میں گفتگو نہ کرتا تھا۔

آخر اس کی ماں نے اس کی دلھن کو لانے کا انتظام کرایا۔ شہزادی عائشہ اپنی دایہ، نوکروں اور جہیز کے ساتھ سمرقند سے چل کر آئی۔ اب وہ پوری جوان اور جب تک بابر نے شوہر کی حیثیت سے اس کی نقاب چہرے سے ہٹائی، گویا ایک غیر خاتون تھی۔ یہ رسم بڑی شان و راہ پر خجند میں ادا ہوئی۔ اسے حاصل کرنے کے ابتدائی شوق کے بعد ان کے درمیان سرد مہری سی پیدا ہو گئی۔ بابر کی طرف سے شرمیلا پن اور بیوی کی طرف سے کچھ ناگواری رہی۔ ممکن ہے بہن کی ہمہ وقت رفاقت بھی اُسے دلھن سے بے تکلف ہو جانے میں مانع آئی ہو۔ بقول خود "میں اس کے پاس دسویں بیسویں دن جاتا تھا، بلکہ یہ رکاوٹ ایسی بڑھتی گئی کہ پھر والدہ ہی مجھے کسی قصور وار کی طرح دھکیل کر مہینہ چالیس دن میں بھیجا کرتی تھیں"۔ بیوی سے تغافل کی ایک اور وجہ بھی وہ بیان کرتا ہے کہ انہی ایام میں اُسے چھاؤنی بازار کے ایک نوعمر لڑکے سے بڑی انسیت پیدا ہوئی اس کا نام بھی بابری تھا یہ جذبہ قریب قریب دیوانگی کے درجے تک پہنچا کہ وہ اس کی یاد میں محو رہتا اور شعر کہتا تھا۔ لکھتا ہے کہ "قبل ازیں مجھے کسی کے ساتھ ایسی شیفتگی نہیں ہوئی۔ حالات روزگار نے عشق عاشقی کی باتیں سننے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ ان دنوں جو شعر میں نے لکھے ان میں ایک بیت بتاتی ہے کہ میں کس درجہ ذلیل و خوار عاشق ہوں۔ بابری میرے پاس کمرے میں آتا تھا تو شرم کی وجہ سے میں اس سے آنکھیں چار نہ کر سکتا تھا ؎

"میں معشوق کو دیکھ کر شرما جاتا ہوں،
لوگ مجھے دیکھتے ہیں، میں دوسری طرف دیکھتا ہوں"[۵]

میں برمحل باتیں کیا کر سکتا تھا کہ اس کا دل بہلے جب کہ خود اپنا دل قابو میں نہ ہوتا تھا۔ اس کے آنے کا شکریہ اور ٹھہرے رہنے پر اصرار تو اور بھی دشوار بات تھی۔ معمولی تواضع کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کی بھی مجھ میں طاقت نہ رہتی تھی۔ اسی شیفتگی سے مسحور ہونے کے زمانے میں ایک دن چند رفیقوں کے ساتھ گلی سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس کا سامنا ہو گیا۔ میں آنکھیں چار نہ کر سکا، کوئی بات میرے منہ سے نہ نکلی۔ شرمندگی اور کرب کی حالت میں برابر سے نکلا چلا گیا۔

جوانی کی دیوانگی اور جذبات کی اس طغیانی میں، میں کوچہ و بازار، باغوں، تاکستانوں میں برہنہ سر

---

۵ اصل فارسی شعر: شوم شرمندہ ہرگہ یار خود را در نظر بینم۔ رفیقاں سوئے من بینند من سوئے دگر بینم۔ مترجم

نہ پاپڑ بیلنا پڑتا تھا کبھی مجنونانہ باغوں اور مضافات شہر سے نکل کر پہاڑیوں میں چلا جاتا۔ یہ آوارہ گردی میرے اختیار کی چیز نہ
ورنہ چلنے یا ٹھہر جانے پر مجھے کوئی قابو تھا۔ دوستوں ملاقاتیوں کی تعظیم و تکریم یا اپنی خودداری کی ذرا پروا نہ رہی تھی۔

" شوق نے مجھے از خود رفتہ کر دیا، نہ جانتا تھا کہ یہ ایک پری چہرہ کے عشق کا کرشمہ ہے"

اسی شہر سے بابر نے لڑکے کے ساتھ اپنی شیفتگی دور کی اور پھر بظاہر ایسے جذبے نے کبھی اسے پریشان نہیں کیا۔
م اس نے عائشہ بیگم سے اسے محروم کیا جو ایک لڑکی کی ولادت کے بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ لڑکی چند مہینے میں فوت ہو گئی
عورتوں کے باب میں متوکلانہ بے پروائی سی بابر کے مزاج میں جگہ پا گئی حالانکہ وہ اس کے ساتھ گہری موانست رکھتی
ی۔ عرصے تک معلوم ہوتا ہے اس طرز عمل نے بچوں پر بھی جو دوسری بیویوں سے ہوئے، اثر ڈالا۔

عائشہ کے زمانہ حمل میں اس سے بے لطفی اور بابری سے شیفتگی ہی کے دوران میں نوجوان بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اس کا
بڑا طرفدار ہی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ اب آسن بیگم کی بار بار تنبیہ بھی خبردار کرنے کے لیے ضروری تھی کیونکہ
دان میں وہ علی دوست کی سیرت بخوبی سمجھ گیا تھا "میر علی دوست شاہی خاندان سے اور میری نانی شہزادی (ایسن
ن دولت) کے رشتے سے میرا رشتہ دار ہوتا تھا۔ اس کی فطرت میں مطلق العنانی تھی۔ اپنے باپ کے زمانے سے میں اس
ن پاس داری کرتا رہا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا کارگزار آدمی ہے لیکن سالہا سال جب وہ میرے ساتھ رہا
ے اپنے لیے اس کی کوئی کارگزاری نہیں دیکھی اسے مقناطیس پتھر سے سحر کرنے کا بھی ادعا تھا لیکن باز اڑانے کے
لوئی ہنر نہ جانتا تھا۔ زر ستانی، فتنہ انگیزی، ریاکاری، درشت گوئی، درشت روئی البتہ اس کی صفات تھیں۔"

ایک شخص بابر کا سچا وفادار تھا۔ وہ اور الیسان (ایسن) اندجان کے چھوٹے سے دربار میں علی دوست کی ریشہ دوانیاں
انے تھے۔ بابر کہتا ہے "اندجان میں پلٹ آنے کے بعد سے اس کا طرز عمل بدلا میری پُر مشقت چاولی جنگ کے رفیقوں کے
بدسلوکی کرنے لگا۔ ایک کو تو نکال باہر کیا۔ اور دوسرے (لاغری) کو قید میں ڈال کر مال اسباب چھین لیا۔ قاسم بیگ سے بھی اس نے چھینا
یا۔ ایک دفعہ اعلان کیا کہ خواجہ قاضی کا عزیز دوست خلیفہ شہید قاضی کے بدلے میں اسے (علی دوست کو) قتل کرنا چاہتا
دھر اس کے بیٹے نے وہ طور اختیار کیے گویا آئندہ بادشاہ ہونے والا وہی ہے۔ امرا کو باریاب کرتا، سب کو کھانے کھلاتا
لیے شاہی درباروں کے سے آداب ملحوظ رکھواتا تھا۔ باپ اور بیٹے کو یہ جرأت اس لیے تھی کہ تنبل کی پشت پناہی پر بھروسہ رکھتے تھے۔
واقعی تنبل کی فوجیں دریا پار پڑی تھیں کہ یہ صلح نامے کی شرطوں کے مطابق تھا۔ اس حالت میں بابر اپنے باقی وفاداروں کی مدد سے
دست کے درباری گروہ پر ضرب نہ لگا سکتا تھا اور نہ اندجان کو ایسی حالت میں چھوڑنے کا خیال کر سکتا تھا۔ "میرے لیے
ع کا نازک موقع تھا۔ علانیہ کوئی بات زبان پر نہ آتی تھی مگر میں مجبور تھا کہ باپ بیٹے کی اہانت آمیز حرکتیں برداشت کروں۔"

بابر یہ سب زیادہ مدت تک برداشت نہ کر سکتا تھا اور غالباً سازش کرنے والے بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے۔ انہیں بجا طور پر یقین تھا کہ علی دوست کے بیٹے کو تخت اندجان لینے کی تیاریاں کرتے دو دو چار ہفتے اور دیکھے گا اور پھر مزاحمت کیے بغیر نہ رہے گا اور یا اُن سے الگ ہو جائے گا۔ مگر بابر نے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کی بلکہ اسے اندجان سے ہٹانے کے لیے جو طعمہ دیا گیا تھا اسے قبول کر لیا ممکن ہے اس چال میں ایسان (ایسن) کی عیاری کا دخل ہو۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ "صلح کرتے وقت جو صورت میرے لیے پیش کی گئی تھی" میں سمرقند فتح کرنے کی کوشش کروں گا اور لشکر کشی کے لیے اپنے آدمیوں کو طلب کیا۔

ادھر سمرقند میں بھی کچھ اسی قسم کے واقعات پیش آئے جیسے بابر کے جانے کے بعد اندجان میں گزر رہے تھے سلطان علی کی ٹولی جس کا شہر پر قبضہ ہوا، وہاں کے اشراف سے طرح طرح سے ایذا پہنچ رہی تھی۔ پھر وہاں کے ممتاز خاندانوں کے پاس نواح کے باغ اور مزرعے تھے۔ وہ امیر تیمور کے زمانے سے ترخان کے لقب سے ملقب تھے۔ انہیں خاص مراعات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ یہ لوگ روپیہ اور زمین کے نقصان کے ساتھ بے عزتی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بعض جوان رئیس زادوں نے اپنی جاگیروں میں ہتھیار سنبھالے۔ ادھر سے مغل دستے نے جنگ میں حصہ لیا۔ سلطان علی کے سرداروں نے باغی ترخانوں کو شکست دی۔ (بابر لکھتا ہے کہ اپنے آخری زمانے میں شہزادہ سلطان علی نے صرف اسی چھوٹے سے معرکے کو اچھی طرح سر انجام کیا) باغی ترخانوں کو بابر کی سمرقند پر صدروزہ بادشاہی کی فیاضیاں یاد آئیں اور اب انھوں نے عاجلانہ قاصد دوڑائے کہ بابر آئے اور ان کی مدد سے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔

فریب اور سازشوں کی گرم بازاری میں قاصد یا ایلچی بھی ایسا درکار تھا جس کی بات کا یقین کیا جا سکے۔ سمرقند سے آخر میں جو ایلچی آیا وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ یعنی ایک خاندانی مغل سردار جو اندجان میں خواجہ قاضی کی حمایت میں لڑ چکا تھا۔ بابر نے بھائی جہانگیر میرزا کے پاس بھی اسی مغل سردار کو عاجلانہ ذاتی روانہ کیا کہ اس کٹ پتلی بادشاہ کو مطلع کر دے کہ قرارداد کے مطابق میں فرغانہ اسے دے کر سمرقند جا رہا ہوں۔" چنانچہ میں اپنے مسلح سپاہیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔" یہ جون کا مہینہ تھا۔ یہاں تک تو ہمارے شیر نے نانی کی نصیحت پر عمل کیا لیکن فوج پاس ہو تو اس سے دشمن پر حملہ کیے بغیر نہ رہا جاتا تھا اور ایسا صبر کرنا آئندہ بھی کبھی نہ آیا۔

یورپ میں نوجوان تلوار باز بیبار بھی اسی قسم کی جرأت دکھانے کا مادہ رکھتا تھا لیکن مغربی آئین شجاعت کے تحت میں اس کی تلوار حق کی راہ میں صرف بادشاہ کے حکم سے اٹھتی تھی۔ ایشیا کے مردان جنگ

اور بھی بڑی ذمہ داریوں کے تحت میں تھے۔ بابر کے فرائض کا تقاضا تھا کہ لشکر کے سپاہی اور وادی کے تاجیک باشندے، غرض اپنے سبھی متوسلین کی حفاظت کا یکساں خیال رکھے۔ ایک طرف مغول کی قدیم روایت اسے اپنے جدِ اعلیٰ چنگیز کے قانون یسا کو ابھی تک یاد دلاتی تھی اور دوسری طرف یسا سے بڑھ کر اسلامی قانون کی گرفت تھی۔ بے باک و سفاک امیر تیمور نے ان روایات کے باہمی اختلاف کا فیصلہ اس طرح کیا کہ رسمی طور پر دونوں کو تسلیم کیا لیکن اپنے عظیم مقاصد کو خود ہی پورا کر لیا اور وسط ایشیا میں ایک نیا مرکزِ تہذیب اپنے دارالسلطنت سمرقند کو بنا لیا۔ وہ متاخر سلطنت روما کی طرح اسے ایشیا میں وحشی اقوام کو روکنے کے لیے مستحکم حصار بنانا چاہتا تھا اور چینی اثر دھے کے اقدام سے بچانے کی بھی فکر تھی جسے وہ آخری ایام میں مغلوب کرنے چلا تھا کیونکہ چینی اثرات اس وقت کاشغر اور تبت تک نفوذ کر چکے تھے جو بابر کی وادی فرغانہ سے چند روز کی مسافت پر تھے۔

غرض بابر ایک طرف تو اعتقادِ صحیح سے خدا کی مرضی کے سہارے عمل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اپنے ملک اور "اپنے لوگوں" کی ذمہ داری کندھوں پر تھی (اگرچہ یہ لوگ کسی معنی میں ایک قوم نہ تھے) اور تیمور کی کھوئی ہوئی سلطنت یا ملک و تہذیب کو جس کا مرکز سمرقند تھا، بحال کرنے کی بھی دل میں لگن تھی۔ اسی لیے یہ شہر اس کے لیے پناہ گاہ سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا اور اب اپنی انفرادی آویزشوں سے دعوت دے رہا تھا کہ تیموری آرزوؤں کو بر لانے میں دوسرے اہلِ خاندان کی ناکامی کی تلافی وہ کرے۔ بابر نے مطلق نہ سوچا کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ بلکہ بے تامل اس طرف چل پڑا۔ اسی ماہِ جون میں سب سے خطرناک صحرائی یعنی اُزبک بھی مغرب کی طرف سے سمرقند پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ (اس زمانے میں وسط ایشیا کے القاب و خطابات عالیہ عہدہ و منصب کی بجائے زیادہ تر سابقہ تاریخ بتاتے تھے۔ "سلطان" کا لفظ عربی سے آیا ہے۔ "شاہ" اور "میرزا" فارسی سے اور "خان" ترکی مغلی سے۔ عام طور پر یہ محض اعزازی ہوتے یا خاندانی امارت کی نشانی اور یا انھیں کوئی از خود اختیار کر لیتا جیسے ایک مجہول الاحوال لقب جاتی ترک نے جو قندوز کا مالک بن بیٹھا تھا اپنا لقب خسرو شاہ بہ معنی بادشاہ فرماں روا، رکھ لیا۔ تاہم کسی مغل نام کے ساتھ "خان" کے معنی شاہی خاندان والے کے ہیں جیسے تیموریوں میں "میرزا" کے آگے "بیگ" یا "بک" کا مترادف ہم نے امیر یا سردار رکھا ہے۔ بابر ناموں کے ساتھ عموماً پورا خطاب دیتا ہے ہم نے اسے مختصر کر دیا ہے۔ مورخین کے

باب ہیں "خانم" اور "بیگم" شاہی خاندان ہونے پر دلالت کرتے ہیں، جن کا انگریزی میں پرنسس (شہزادی) ترجمہ کیا گیا ہے۔ لفظ منگول کو بابر موگل، مغل، منول تحریر کرتا ہے۔ ہم بھی آئندہ اوراق میں اسی کی پیروی کریں گے۔)

شیبانی خاں کا رحم

ہمارے شیر نے عقل مندی کی کہ اہل وعیال کو چھوڑ کر چپ چاپ اندجان سے نکل آیا۔ علی دوست کو جو اس کی نگرانی کر رہا تھا، خبر تک نہ ہوئی۔ صرف بھروسے کے ملازمین ساتھ لیے جن میں خواجہ اس کا کتاب دار اور فوج رکاب کے جوان تھے۔ اس قسم کے نمک حلال رفقا میں اس کا زرہ بکتر اتار کر سونا ممکن تھا کسی کی وفاداری جانچنے کے بارے میں اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا۔ ان سب احتیاطوں پر بھی اس کا ایک عسکری کھسک گیا کہ سمرقند میں سلطان علی کو اس کے آنے کی خبر کر دے

کاروانی شاہراہ پر اس کی لشکرگاہ چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ ہر ندی نالے کے پل یا گھاٹی سے گزرتے ہوئے تاڑنے والے اس کی جمعیت کا تخمینہ لگا سکتے تھے اور یہ خبر بھی مشتہر ہو چکی تھی کہ عمر شیخ میرزا کا بیٹا اپنے شمشیر زنوں کو بلوا رہا ہے۔ ہر رات پڑاؤ پر لوگ بھرتی ہونے آتے یا قاصدان رئیسوں کی طرف سے جو ابھی دور ہی رہنا مصلحت سمجھتے تھے، دوستی کے پیام سلام لاتے تھے۔ قاسم بیگ اپنی جمعیت لے کر آملا اور جنگ چپاولی کے پرانے رفیق جنھیں علی دوست نے تنگ کر کے نکالا تھا، ناخواندہ ہی آن آن کر شریک لشکر ہو گئے۔ پھر یکایک خود علی دوست اپنے بیٹے اور عملے کو لے کر ایک دن حاضر ہوا اور اسے محض حسن اتفاق پر محمول کیا۔ بابر جانتا تھا کہ یہ کہنا صحیح نہیں مگر خوش طبعی سے تائیداً کہا "ہاں کیا اتفاق ہے۔ تم اس طرح آئے گویا ملنے کی قرارداد ہو گئی تھی۔" اصل میں اب اس کے اور علی دوست کے درمیان قوت کا توازن برابر ہو گیا تھا۔

تنبر علی سلاخ کے "ننگے سر ننگے پیر" آنے پر بابر نے بہت مزہ لیا۔ یہ شیخی خورہ مشنت سے منل کے پاس تنہا اُخسی گیا تھا۔ اس نے پکڑ ڈالیا اور اس کی جاگیروں پر جا چڑھا۔ بابر نے ایک ترکی مثل نقل کی ہے جس کے معنی ہیں "دوست پر اتنا بھروسہ نہ کر کہ زہری کھال میں بھس بھر دے۔[1]"

---

[1] مصنف نے اسے بابر کا طبع زاد چوبولہ تحریر کیا ہے۔ ہم نے تزک، فارسی کا تتبع مناسب سمجھا۔ مترجم۔

سمرقند کے قریب ایک سردی میں منزل ہوئی تو وہاں پانسہ علی دوست کے خلاف پلٹ گیا۔ شہر کے ترخان اور امرا کا اپنے حامی موالی سمیت یہیں پڑاؤ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بزرگ خواجہ کو شہر میں چھوڑ آئے ہیں جو عام باشندوں کو طرف دار بنانے میں ساعی ہے۔ اتنی بات سب جانتے تھے کہ تیمور کے شہر کی فصیلوں پر حملہ کامیاب نہ ہو سکتا۔ اندر والوں کے مل جانے ہی سے راستہ مل سکتا تھا۔ لشکر گاہ میں بابر بار نگاکر اجلاس کرتا تھا۔ علی دوست میں بہرحال قوت تمیزی تھی وہ اندیشہ مند اور شاید شرمندہ ہوکر بابر کی خدمت میں آیا اور ملازمت سے علیحدہ ہونے کی اجازت مانگی۔ بابر نے بے تامل منظوری دی باپ بیٹے رخصت ہوکر تنبل کے پاس گئے اور اس کی ملازمت کر لی۔ وہاں باپ کے ہاتھ میں کچھ روز بعد سرطان کا پھوڑا نکلا اور وہ اسی سے مرا۔ بیٹا وہاں سے بھی نکل گیا تھا اور آخر ازبکوں نے پہاڑوں میں پچھا کر کے اسے پکڑا اور اندھا کر دیا۔ بابر کہتا ہے "نمک فلاں کس چشم ہائے او را گرفت" (یعنی کسی کے نمک نے اس کی آنکھیں پھوڑ دیں) بایں ہمہ اس موقع پر سمرقند اس کے ہاتھ نہ آیا کہ حالات سیر بین کے نظاروں کی طرح ذرا ذرا سی دیر میں رنگ بدلتے اور کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے ......

مغرب کی طرف سے اُزبک بڑھے آ رہے ہیں۔ خطرے کی پرچھائیں اس طرح پڑ رہی ہے جیسے میدان میں شاہین کا سایہ چڑیوں کو نظر آتا ہے۔ اس آوازے کے ساتھ کہ شیبانی خاں نزدیک ہے اہل سمرقند کے باہمی جھگڑے، نیز دوستی کے عہد و پیمان ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ سلطان علی میرزا کی ماں خود ہی اس آن بان والے ازبک رئیس کی زوجیت میں آنے کی درخواست کرتی اور سمرقند میں اُسے بلاتی ہے۔ سلطان علی ہچکچاتا ہے۔ پھر ایک کم زور بچے کی طرح ضد کر کے میدان کے باغ میں ازبک سے ملاقات کرنے چلا جاتا ہے۔ شیبانی کوئی خاص مہربانی نہیں کرتا۔ اپنی مسند کے بائیں میں بٹھاتا ہے اس کی سازشی ماں کو اپنے خیمے میں لے جاتا ہے۔ سلطان علی کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور وہ شیبانی سے بچ کر نکلنا چاہتا ہے لیکن چند آدمی اس کے ہمراہ کیے جاتے ہیں جو مرغ زاروں میں اس کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح ترخانوں کا حامی خواجہ یحییٰ ایک مٹرک پر دُور باہر لے جا کر ہلاک کیا جاتا ہے اگرچہ شیبانی کے ملازم سردار اس کے قتل سے انکار کرتے ہیں۔ بہرحال یہ بزرگ خواجہ اور تیموری شہزادہ سلطان علی معدوم ہو گئے تو اب فرماں دہی کے لیے صرف شیبانی خاں کی آواز رہ جاتی ہے۔

بابر، جنوب میں شہر سے دور راستے پر ہے، مگر یہ خبریں کہ شاہی کماؤں گشت کرتی اس تک پہنچی
ہیں۔ انھیں سن کر سربرآوردہ ترخان اس کا ساتھ چھوڑ کر خسرو شاہ کا آسرا تلاش کرتے ہیں جو پہاڑوں
کے دوسری جانب قندز اور حصار کا مالک اور تنہا وہی محافظت کرنے کے قابل رہ گیا ہے۔ بابر اس
کے پاس جانے سے انکار کرتا ہے اور اپنی وادی کی طرف پلٹتا ہے جس پر تنبل قابض ہو گیا ہے۔ وہ
اپنی چپاولی جتھے کے رفیقوں کے ہمراہ راستہ کاٹ کر کوہ سبزؔ کی پہاڑیوں میں ایک تنگ گھاٹی
سے گھسا جس میں خوفناک غار اور کراڑے تھے کہ آدمی یا جانور گرے تو وہیں ہلاک ہو جائے۔ آخر ایک
خوش فضا جھیل کے کنارے ان قبائل میں پہنچ جاتا ہے جنھوں نے پہلے بھی اسے پناہ دی تھی۔ یہاں اسے
ایک قلعہ ملتا ہے جو غیر آباد پڑا تھا۔ ساتھ والوں کی جن میں سلاخ بھی ہے، گنتی کی جاتی ہے تو دو سو چالیس
آدمی نکلتے ہیں۔ اب وہ بے گھر اور اس خطے میں تیمور کا اکیلا وارث شہزادہ رہ گیا ہے۔ پہاڑوں کے
نیچے ازبک شوارع عام سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی تعداد تین سے چار ہزار تک ہے۔ کچھ
مدت میں شیبانی سمرقند کی فصیلوں میں اور مستحکم ہو جائے گا۔ لیکن — میدان کے باغ سے خبر ملتی ہے
کہ۔ ابھی یہ ازبک سردار احتیاطاً شہر کے باہر پڑاؤ میں ہے۔ ہنوز سمرقند والے اس کی خاطر جنگ نہیں
کریں گے البتہ چند روز میں وہ ضرور شہر پر متصرّف ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر بابر کسی طرح اس وقفے کے اندر
سمرقند کے اندر پہنچ جائے تو ممکن ہے وہاں کے عوام پھر اس کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ اس
کے سردار پہاڑی قلعے میں یہ بحث مباحثے کرتے ہیں۔ بابر ان کی رائیں سنتا اور آخر جواب دیتا ہے
کہ "ایک دفعہ شہر پر قبضہ ہو جائے تو پھر اللہ مالک ہے جو چاہے کرے۔"

بابر نے بے خبر شہر کو جا لینے کے شوق میں جو حملہ کیا، اس میں خفّت اُٹھانی پڑی۔ بڑی فصیلوں
کی حفاظت پر سپاہی تعینات اور پورے چوکس تھے۔ قسمت آزمائی کرنے والوں کو جس تیزی سے آئے
تھے، اسی طرح اُلٹا جانا پڑا۔ اپنے پہاڑی مامن میں پہنچ کر بابر نے پھر حقیقت شناسی کے ساتھ اپنے
حال پر نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ اپنے حریف شیبانی خاں جیسے ہنرمند و آزمودہ کار حریف کے
مقابلے میں وہ ناتجربہ کار نوجوان ہے۔ اُزبک کا خوف شہر والوں کو اس کی مدد کرنے میں مانع ہے
قلعے کے پاسبان چوکنّے ہو گئے ہیں۔ اور دوسرا اچھا پا مارا گیا تو تیار رہیں گے۔

ؔ کوہ "سرہ تاؤ" مترجم۔

یہ سب تو تھا لیکن اب اس کے لشکر میں خوراک کم ہوتی جاتی تھی۔ ایک دن اس کے پاس چند سردار بیٹھے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کام نہ تھا نہ کوئی تجویز پیش نظر تھی۔ سمرقند کے حملے کے بارے میں غیبتیں کرنے کو رہ گئی تھیں۔ اتنے میں بابر نے بات کاٹ کر سوال کیا کہ "اچھا یہ تو کہو ہم خدا کی عنایت سے سمرقند کب تک لے سکیں گے؟" کسی نے کہا اگلی گرمیوں میں۔ یہ خزاں کے آخری ایام تھے۔ بعض نے چالیس، کسی نے تیس کسی نے بیس دن کہے۔ سردار کو کلتاش[1] نے کہا ہم چودہ دن میں اسے لے لیں گے۔ خدا نے اس کی بات سچ کر دکھائی۔ واقعی ٹھیک چودہ دن میں ہم نے سمرقند جیت لیا۔"

" اس گفتگو کے بعد ہی میں نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ سیّد اولیا حضرت (خواجہ عبید اللہ) احراری میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے استقبال کیا اور وہ اندر آ کر بیٹھے۔ ان کے لیے دسترخوان بچھایا گیا مگر اس میں کوئی بات حضرت خواجہ کے مزاج کے خلاف ہوئی۔ میں نے اشارہ کیا کہ یہ قصور میرا نہیں ہے۔ حضرت سمجھ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ ہم ایک مکان کے دالان میں ہیں۔ وہاں حضرت نے میرا ایک بازو پکڑ کر مجھے اتنا اُٹھایا کہ ایک پاؤں زمین سے اوپر اُٹھ گیا۔ پھر ترکی میں کہا " ایک ولی نے سمرقند تم کو دیا[2]"

" اس کے بعد اگرچہ ہمارا منصوبہ چھپا ہوا نہ تھا ہم نے خدا پر بھروسہ کیا اور دوبارہ سمرقند پر چلے خواجہ ابوالمکارم[3] میرے ساتھ تھے (شاید خواب میں جو اشارہ تھا، اس کی تعمیل کے لیے) ہم آدھی رات کو خیابان کی گہری خندق کے پل پر پہنچے اور وہاں سے ستر اسی آدمیوں کو سیڑھیاں دے کر بھیجا کہ غارِ عشاق کے مقابل فصیل پر چڑھ کر اندر سے فیروزہ دروازے کے پاسبانوں پر حملہ کریں اور قابو پا کر مجھے خبر بھیجیں۔ چنانچہ یہ جوان چڑھ گئے اور پاسبانوں کو خبر ہوئے بغیر اندر پہنچ کر پہرہ داروں کو مار ڈالا اور تبر سے قفل توڑ کر پھاٹک کھول دیا۔ لمحہ بھر میں مَیں پہنچا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ خانقاہ پر جا کر ٹھیرا تو احمد ترخان بھی کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں آ گیا۔ اکثر شہر والے پڑے سوتے تھے۔ مگر بعض دکانداروں نے دکانوں سے جھانک کر دیکھا اور مجھے دعائیں دیں۔ شہر بھر میں خبر پھیلی تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور میرے سپاہیوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر انھوں نے گلی گلی، کھائی کھائی ازبکوں کو

---

[1] بہ تصحیح مترجم۔ [2] فارسی تزک میں یہ الفاظ نہیں ہیں اگرچہ مراد لیے جا سکتے ہیں۔ مترجم۔

[3] یہ وہی درویش ہیں جو مرغینان کی دعوت ملنے سے پہلے بابر کو ملے تھے۔ مصنف نے وہاں نام نہیں دیا اور یہاں غلطی سے عبدالمکارم لکھا ہے۔ ہم نے صحت کر دی۔ مترجم۔

ڈنڈے اور تھپڑ مار مار کے اس طرح مار ا جیسے باولے کُتّے کو مارتے ہیں۔ اُزبک حاکم شہر خواجہ یحییٰ کے مکان میں رہتا تھا، وہ فرار ہو کر شیبانی خان کے پاس پہنچ گیا۔

میں خانقاہ کے دروازے میں ایستادہ تھا۔ صبح ہونے تک ہر طرف شور و غوغا مچتا رہا۔ بعض تاجر و عمائدِ شہر خوشی خوشی میرے پاس آئے اور جو کچھ کھانا میسّر تھا، لا کر پیش کیا۔ دن نکلے معلوم ہوا کہ آہنی دروازے کے پھاٹکوں میں ازبکوں نے پناہ لے رکھی ہے اور وہاں لڑائی ہو رہی ہے۔ کوئی پندرہ آدمیوں کو لے کر میں گھوڑے پر سوار اُدھر چلا۔ لیکن میرے پہنچنے سے پہلے شہر کے بلوائی جو لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، انھیں دروازے سے باہر نکال چکے تھے۔ سورج چڑھے شیبانی خاں رات کا ماجرا سُن کر گھوڑے پر سوار اُدھر آیا۔ کوئی سو ڈیڑھ سو آدمی اس کے ہمراہ تھے۔ موقع تو بہت اچھا تھا۔ مگر میرے پاس معدودے چند جوان تھے۔ شیبانی یہ دیکھ کر کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، اُلٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ آہنی دروازے سے میں قلعہ (ارک) میں اور محل کے باغ میں آیا۔ وہیں شہر کے معززین اور عمائد ملاقات اور مبارک دینے آئے۔

سمرقند قریب قریب ایک سو چالیس برس ہمارے خاندان کا پایۂ تخت رہا۔ ایک اجنبی، اُزبک (کیسی نسل کا ؟) دشمن اس میں گھس کر قابض ہو گیا تھا۔ بارے ہمارا یہ لُٹا کھٹا شہر پھر ہمیں واپس مل گیا۔۔ (میں نے جو دوسروں سے اسی قسم کے معاملات کا مقابلہ کیا، اس کا منشا) اوروں کی تنقیص اور اپنی خودستائی کرنا نہیں، صرف واقعات بیان کیے ہیں۔ شعرا نے اس فتح پر نظمیں لکھیں۔ ان میں یہ شعر مجھے یاد رہا؎

باز گفتا خرد کہ تاریخش

فتح بابر بہادر، است بداں (مترجم)

دراصل، بابر حسبِ عادت پھر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور یقین کر رہا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ اوج پر ہے۔ تمام ولایت سمرقند میں باشندے ازبک فوجوں کو جو قلعوں میں متعین تھیں نکال رہے تھے بابر ان فتوحات کو ایک ایک کر کے گنتا ہے۔ ادھر محتاط شیبانی فسادزدہ علاقے سے جانبِ مغرب ہٹ گیا۔ اب بابر کے اہلِ محل بھی سمرقند میں اس کے پاس آ گئے۔ اس کی دلہن عائشہ کے ہاں یہیں لڑکی پیدا ہوئی اُسے کہ چند ہی مہینے زندہ رہی فخر النسا کا نام دیا گیا تھا۔ بہن خانزادہ بیگم محل سرا میں اس کے ساتھ ساتھ گشت لگایا کرتی تھی گویا منحرف بھائی (جہانگیر) کی جگہ پُر کرنا چاہتی ہے۔ اسی زمانے میں خبر آئی کہ شمال سے ایک قافلہ ازبکوں کے لعبد پڑاؤ میں آیا اور شیبانی اور اس کے سرداروں

کے اہل و عیال کو لے آیا ہے جس کے معنی یہ تھے کہ ازبک ان علاقوں میں ڈٹے رہیں گے۔ بابر اور اس کے رفیقوں کی سمجھ میں آگیا کہ یہ مستقل خطرہ ہے۔ چنانچہ موسم سرما میں انھوں نے عمر شیخ میرزا کے دور دور کے رشتہ داروں اور عزیزوں کو تاکیدی پیام بھیجے کہ دشمن ازبک کے مقابلے میں بابر کے گرد پوری جمعیت کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ واقعی یہ ان کے لیے اتحاد کرنے کا وقت تھا۔

شیبانی خاں، جیسا بابر لکھتا ہے، پردیسی یا اجنبی ضرور تھا لیکن اس کا نسب کچھ غیر معروف تو نہ تھا۔ وہ چنگیز کے سب سے بڑے بیٹے جوجی کے ایک فرزند کا ہم نام تھا۔ اس کا جدّ امجد ذی شان باتو "التون اُردو" (لشکر زرّین) یعنی مغول کی صدر عسکری تنظیم کا مالک رہا تھا جس کی عمل داری روس کے شہروں سے وسط ایشیا کی کوہستانی فصیل تک وسیع تھی اگرچہ زیر نظر عہد میں اس کے اجزائے پراگندہ صرف کنار روالگا سے بحر اسود کے سواحل تک باہمی جنگ میں مبتلا رہ گئے تھے (مذکورہ بالا اقطاع میں منگول تاتاری جاگیرداروں کا تو ہمارے زمانے سے کچھ پہلے تک دور دورہ رہا) یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بابر کے زمانے میں انتشار پذیر التون اُردو کا جزو کبیر انہی ازبکوں کے دم سے قائم تھا۔ شیبانی کے دادا کے ماتحت ان کی ایک بدوی قسم کی سلطنت حدودِ چین سے موسکو تک جو آئندہ ملک روس کا مرکز سلطنت بنا، صحرائی اقطاع میں قائم ہو گئی تھی۔ پھر ان سے قزق (بہ معنی آوارہ گرد) قبائل ٹوٹ کر شرق کی طرف کٹ گئے۔ ایک جنگ میں یونس خاں نے وحشی ازبکوں کو شکست دی اور شیبانی کے باپ کو قتل کیا۔ خود شیبانی جوانی میں بابر ہی کی طرح قسمت آزمائی کرتا پھرتا تھا۔ ازبکوں کے صدر گروہ پر ان سے بھی زیادہ جنگلی قزاق اور جاہلی (کفار) کرغیز دباؤ ڈال رہے تھے۔ انہی کے دباؤ سے بچا کر شیبانی اپنے جنگجو قبائلی جتھے کو بحیرہ ارال کی شمالی چراگاہوں سے عمداً جنوب کی طرف لے آیا تھا۔ دیکھ بھال کی ابتدائی تاختوں میں جو تیموری شاہزادوں کی سرسبز ولایات پر کی گئیں، شیبانی ان کی کمزوری سے آگاہ ہو گیا اور اب اپنی پوری قوم کو ان جنوبی اقطاع پر چڑھا لایا جو تیموری سلطنت کا قلب تھے۔ مشہور مزاروں کے شہر بخارا پر اس کا قبضہ جم چکا تھا۔ اُزبک جنگ آزماؤں کے بیوی بچوں کی آمد بابر کے لیے پیشگی اطلاع تھی کہ اب وہ سمرقند کو بھی فتح کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ کچھ خبر نہ تھی کہ شیبانی حملہ کس طرح کرے گا۔

پُل کا معرکہ

بابر کے ایک نوجوان عزیز میرزا حیدر نے اُزبک شیبانی کی نسبت یہ عجیب سی بات کہی کہ "وہ بڑا آدمی ہے مگر درباری یا کاروباری آدمی نہیں ہے" شیبانی خاں دربار میں کسی کو برائے بادشاہ بٹھائے رکھنے کی اور دو مردوں کو بازار میں داد و ستد کرنے کی اجازت دیتا اور خود کشورکشائی سے شغف رکھتا تھا۔ سنت والجماعت مولویوں نے اسے تعلیم دی اور وہ تین زبانیں جانتا تھا۔ بظاہر شہری عورتیں اسے پسند کرتی تھیں اور بابر کا اُسے وحشی کہنا درست نہ تھا۔ وہ فوراً فیصلہ کرتا، اپنے اصلی مقصد کو چالاکی سے چھپاتا اور سفاک آدمی تھا۔ اس کے خطرناک ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ وہ وحشیوں کا تعلیم یافتہ سردار تھا مگر اس بات کی اُسے پروا نہ تھی کہ اس کے جنگلی قبائل شہروں کو تاراج کر کے اپنی صحرائی مملکت تیار کریں گے۔ وہ چنگیز خاں کے سچے وارث ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور فی الواقع بعض تاریخ نویسوں نے اس کی سلطنت کو خانہ بدوشوں کی آخری حکومت قرار دیا ہے۔

موسم بہار کے آغاز (اپریل ۱۵۰۱ء) میں بابر اپنے مختصر لشکر کو لے کر چلا کہ ازبکوں کے پڑاؤ پر حملہ کرے یہ بات اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ سمرقند کی بڑی فصیلوں کے اندر کوئی فوج ایسی حالت میں گزارہ نہ کر سکتی تھی جب کہ نواح میں جہاں اجناس خوردنی کے کھیت تھے، دشمن چھایا ہوا ہو۔ بابر کو لوگوں نے ہوشیار کر دیا تھا مگر اس نے دانستہ اغماض کیا۔ رشتہ داروں سے اُسے محض اظہار خیر سگالی کے طور پر تھوڑی سی کمک بھیجی گئی تھی۔ یعنی ماموں محمود خاں نے چار پانسو سوار، دو ہزار بھیجے۔ جہانگیر میرزا اب بروئے معاہدہ حلیف اور حاکم فرغانہ تھا۔ اس کی طرف سے تنبل کی دعائے فتح کے ساتھ سو جوان آئے۔ بعید مغرب کے تیموری شہزادوں نے ہرات جیسے بڑے شہر سے، ہمت افزائی کا پیام تک نہیں بھیجا۔ نہ خسرو شاہ نے جو ترخانوں کا بڑا حامی بنتا تھا، کوئی کمک بھیجی کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ بابر اس سے بائسنغر کے قتل کا انتقام لے گا تاہم کئی ترخان اپنی جمعیتوں کے ہمراہ بابر سے آ ملے۔ خاصی بڑی فوج ہو گئی۔ پھر اُسے اپنے طالع پر بھی اعتماد تھا۔ غلطی یہ کی کہ مزید کمک پہنچنے کا انتظار نہیں کیا۔ بابر نے اس غلطی کا اقرار کیا ہے اگرچہ بعد از وقت فوج باغ سمرقند سے نکلے بہاں کرتے آگے چلے اور اس ندی تک پہنچے جو سمرقند سے بہ کر بخارا کے قریب سے گزرتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ازبک ندی کے کنارے پڑے ہیں۔ ان کے مقابل لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ حفاظت

کے لیے خندق کھودی اور شاخوں کی باڑ لگا دی۔

ہمارے نشیر نے اب دوسری غلطی کھائی۔ قنبر علی سلاخ باڑ کے پیچھے چپ رہنے اور جنگ میں دیر کرنے کا شاکی تھا۔ ادھر نجومیوں نے بتایا کہ دُبِ اکبر کے آٹھ ستارے آج کل فریقین کے وسط میں آسمان پر قائم ہیں، لیکن چند روز بعد اُزبکوں کی طرف چلے جائیں گے۔ بابر خود بعد میں اقرار کرتا ہے کہ یہ سب واہیات باتیں تھیں مگر اس وقت تو فوج کو باہر نکال کر دریا کے پُل کی طرف لے چلا جہاں ازبک انتظار میں تھے۔

لڑائی شروع ہوئی تو بابر کی میدان کے ہر حصے پر نظر تھی لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالم خواب میں ہے اور بالارادہ کوئی حصہ نہیں لیتا بلکہ ہر طرف جو ہزیمت ہو رہی ہے اس میں اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ رہا ہے۔ سب سے اگلی صفِ جنگ میں قاسم بیگ اور سمرقند کے چیدہ جوان بڑھے تھے کہ ازبکوں کے قلب میں گھس جائیں۔ بابر اور باقی سپاہ اس پُرجوش قراول کے عقب میں تھی جو دشمن کی صفیں توڑ دینے کا داعیہ رکھتا تھا۔ اوّل اوّل ایسا ہی ہوتا نظر آیا کہ تصادم ہوتے ہی سمرقندی مارتے کاٹتے ہوئے آگے چلے لیکن ان کا جھکاؤ دائیں طرف زیادہ تھا۔ اسی رُخ دشمن پسپا ہوتا معلوم ہوا، مگر پھر لڑائی پھیل کر سمرقندی صفوں کے بیسار پر ہونے لگی اور ادھر سے دشمن گھیرا دے کر اُن کے پیچھے نکل آیا۔ بابر کو اپنے قریبی سواروں کو پیچھے مڑنے کا حکم دینا پڑا۔ لیکن اس طرح پلٹنے سے اس کی فوج اپنے قراول سے جو شجاعانہ آگے چلا جا رہا تھا، جُدا ہو گئی اور اوجھل میں آ گئی۔ اب وہ سمجھا کہ یہ ازبکوں (مغلوں) کی مشہور جنگی چال "تولغمہ" تھی جس میں دائیں بازو کا بعید چیدہ رسالہ یکبارگی سرپٹ گھوڑے دوڑا کر تیر مارتا ہوا دشمن کے عقب میں پہنچتا اور اسے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ شیبانی خاں نے اس موقع پر اپنے ایک بازو کو اسی لیے پیچھے ہٹایا تھا کہ بابر کے دوسرے پہلو پر جا پڑ اور اسے گھیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ قبل اس کے کہ قاسم بیگ اور اس کے ساتھ بڑھ جانے والے جنگ آزما اصل حقیقت کو سمجھیں، برق رفتار سواروں نے جنگ ختم کر دی تھی اور سمرقندی لشکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں لڑ بھڑ کر اس مقتل سے نکلنے اور ندی کے کنارے پہنچنے کی جدوجہد کر رہا تھا:

"میرے پاس اب دس یا پندرہ آدمی رہ گئے تھے۔ کوہک ندی قریب تھی جس طرح ہو سکا ہم اس تک پہنچے اور اگرچہ پوری طرح مسلح، زرہ پوش تھے لیکن گھوڑوں سمیت ندی میں در آئے۔ آدھی دُور تک گھوڑوں کے قدم ٹکے رہے پھر تیر کر پار کرنا پڑا۔ ساز و یراق سے لدے پھندے تھے۔ ندی سے نکل کر گھوڑوں کے بھاری ساز کو کاٹ کر پھینک دیا اور شمالی کنارے پر دشمن سے دُور ہو گئے۔ مغل جو میری مدد کرنے آئے تھے،

اب لڑائی چھوڑ کر میرے جوانوں کو گھوڑے سے اُتار کر کپڑے اُترو انے لگے۔ یہ پہلا موقع نہ تھا کہ انھوں نے ایسا کیا۔ ان کم بخت مغولوں کا طریقہ یہی ہے۔ اگر دشمن پر غالب آئے تو سب سے پہلے وہی اُسے لوٹنا شروع کرتے ہیں اور اگر شکست ہوئی تو خود اپنے حلیفوں کو لوٹ کر چل دیتے ہیں۔ اس موقع پر ابراہیم ترخان اور بہت سے اچھے اچھے جوانوں کو انھوں نے گھوڑوں سے اُتارا اور قتل کر ڈالا۔"

بعد میں بابر نے یا اور کسی نے تزک کے اس صفحے پر یہ شعر بھی لکھ دیا تھا کہ:

"مغول اگر فرشتے کی نسل سے ہوں تو وہ نسل بُری ہے،
مغول کا نام آبِ زر سے لکھا جائے تو وہ بھی بُرا ہی رہے گا"

اپنے بزرگوں کی نسل کو اس طرح قلم زد کرنے کے بعد، بابر نے پل کی لڑائی ہارنے پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ "وہ جو شتاب کاری کرتا ہے آخر میں اسے انگشت تاسف چبانی پڑتی ہے۔" اس کا رنج و ملال حقیقت میں گہرا اور ناقابل تسلی تھا۔ چند ہی روز پہلے وہ ایک عظیم حصار بند شہر میں تخت نشین ہوا۔ اہل شہر نے جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا۔ امدادی فوجیں ہر طرف سے آرہی تھیں۔ اگر چند روز اور خندق سے محفوظ پڑا رہتا کہ اس کی فوجی جمعیت بڑھتی اور ازبک مجبور ہوتے کہ حملے کا خطرہ مول لیں!

آیندہ پھر کبھی بابر نے اجنبی سپاہیوں پر اعتماد نہیں کیا اور نہ نجومیوں کو اجازت دی کہ اس سے کوئی فیصلہ کرائیں۔ علیٰ ہٰذا وہ صحرائی سواروں کے اس خوفناک جھپٹے (تولغمہ) کو بھی نہ بھولا جس نے اس کے لشکر کو پیچھے سے آگھیرا تھا۔ کیونکہ اس جنگی چال کے سامنے اچھے سے اچھے گھوڑے اور اسلحہ یا ذاتی شجاعت کام نہ دے سکتی تھی۔ اسی حملے کی وجہ سے اس کے بہت سے جاں نثار ساتھی اور بہترین سپاہی دریا کے کنارے مارے گئے۔ پھر سمرقند کی طرف ماراماری پسپائی میں اس نے باقی ماندہ فوج کا انتشار معائنہ کیا۔ مغل کمکی تو ظاہر ہے اپنی لوٹ کے ساتھ سب چل دیے تھے۔ لیکن بعض طاقتور سردار بھی آئندہ مصائب کے آثار دیکھ کر ایسے گئے کہ پھر سمرقند کی صورت نہ دیکھی۔ قنبر علی آیا بھی تو صرف اس غرض سے کہ اپنے بال بچوں اور مال اسباب کو لے کر نکل جائے اور خسرو کا دامن تھامے ۔ (یہاں بابر لاؤ ابالی سلاخ کی مغل نژاد کو یاد کرتا ہے۔) ایک اور سردار دیدہ دانستہ واپس آیا کہ بابر کے جلسۂ مشاورت میں شریک ہو لیکن اپنے اہل و عیال کو دوسری جگہ بھیج کر آیا تھا۔ اور اس کا مطلب بابر سے مخفی نہ رہا۔

وہ اس بات پر بھی حیران نہیں ہوا کہ اس نے اپنے حاکم رشتہ داروں سے مدد کی جو التجا کی تھی وہ اس

نازک وقت میں بے اثر رہی۔ کیونکہ کامرانی کے زمانے ہی میں اسے بہت کم مدد ملی تھی تو اب شکست کھانے کے بعد وہ اس کی کیا امید کر سکتا تھا۔ پھر بھی یہ سن کر وہ پیچ و تاب کھائے بغیر نہ رہا کہ لعبہ ہرات کے سلطان[1] نے دوستانہ سفارت روانہ کی تو وہ اس کے پاس نہیں، بلکہ شیبانی خاں کے پاس بھیجی گئی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود بابر نے ٹھان لی کہ جب تک جان ہے سمرقند کی مدافعت کی جائے۔ قاسم بیگ اور خواجہ ابوالمکارم جان نثاری سے مشورے میں شریک تھے اور اپنی بچی کھچی جمعیت کے ذریعا اعتماد جوانوں کی کمک ہر جگہ لے جانے پر آمادہ ہوئے۔ تجویز یہ ہوئی کہ فصیل کی نگرانی اہل شہر کریں ... یہ جوان روز ... مدد کو پہنچ جائیں۔ شہر پناہ اتنی مستحکم تھی کہ تھوڑی دیر تک اس پر حملہ آوروں کو روکا جا سکتا تھا۔ اس اثنا میں بابر کی نومولود لڑکی فوت ہو گئی اور عائشہ بیگم چلی گئی تھی۔ خانزادہ جنگ و جدال میں بے بس تھی، اپنے دالان میں پڑی کڑھتی رہتی تھی۔

پناہ گزینوں کا شغل فراری رہ گیا

ہزیمت اٹھانے کے بعد شیر نے بہادری سے کام لیا۔ اس کا عزیز میرزا حیدر لکھتا ہے کہ "بابر دلیری میں اپنی ساری قوم میں بڑھا چڑھا تھا اور اس کی قوم والوں میں کسی نے ایسے عجیب تذبذب و فراز نہ دیکھے تھے۔"

ازبک نواح شہر پر قابض اور ہاتھ پاؤں بچا کے فصیلیں دیکھتے پھرتے تھے۔ بابر کو معلوم ہوا کہ محاصرے میں ایک بڑا مسئلہ شہر والوں کو داؤ پیچ سکھانا تھا۔ انھیں کوئی چشم زخم نہیں پہنچا تھا اور جہالت کی دلیری دکھا رہے تھے لکھتا ہے:

"میں نے اپنا خیمہ مدرسہ الغ بیگ کی بڑی محراب کے نیچے لگوایا۔ بازاری عوام گلی کوچوں سے نکل نکل کر محراب تک آتے اور درود و صلوٰۃ کے نعرے لگاتے تھے۔ جب یہ جتھہ کی بھیڑ باہر نکل جانے لگی تو شیبانی خان نے احتیاطاً ان پر حملہ نہیں کیا بلکہ چند روز میں بڑھ کر دروازہ آ ہنی تک ... نعرہ ... گیا۔ بازاری لوگ زیادہ دلیر ہو گئے تھے۔ دو ... آگے چلے۔ میں نے بازگشت کی حفاظت کے لیے سواروں کی ایک ... نویان کو کل تاش کی قیادت میں روانہ کی۔ اس میں چند اور کوکہ اور میرے ملازمان خاص شامل تھے۔ ازبکوں نے گھوڑ ... دوڑا

---

[1] مراد: سلطان حسین میرزا۔ مترجم۔

سے اُتر کر یورش کی اور عوام کو دروازے کے اندر دھکیل دیا۔ پناہ گزینوں کو سوائے فرار کے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ البتہ میرے آدمیوں نے تلواریں سونت کر اُزبکوں پر حملہ کیا تو عوام رک کر داد دینے لگے۔ میں دروازے کی چھت سے کمان چلا رہا تھا۔ ایک دن اس کمان سے میں نے شرط باندھ کر ایسا تیر مارا کہ ایک ہی زخم سے ایک ازبک سردار کے گھوڑے کو ہلاک کر دیا.....

ازبک یلغار کرتے کرتے دروازے کے قریب آ گئے اور فصیل کے نیچے قدم جما لیے۔ میں اس قدر جنگ کرنے میں مشغول تھا کہ شہر پناہ کے دوسرے حصے کی حفاظت کا خیال نہ رکھا۔ شیبانی خاں نے ظاہر میں آہنی دروازے پر حملہ کیا لیکن آہستہ آہستہ ازبکوں نے سیڑھیاں چھپا کر دوسری طرف سے حملہ کرا دیا۔ بایں ہمہ قوچ بیگ اور بعض دوسرے بہادروں نے دوڑ کر انھیں روکا اور چڑھ آنے والوں کو مار مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ سب سے بڑھ کر قوچ بیگ نے بہادری دکھائی اور کار نمایاں انجام دیا..... ایک اور موقع پر قاسم بیگ دروازہ سوزن گراں سے جھپٹ لے کر نکلا اور کئی ازبکوں کو گھوڑوں سے گرا دیا۔ چند سر کاٹ کر لایا۔"

ذاتی بہادری فصیلوں کا دفاع کر سکتی تھی لیکن محصور شہر کے مصائب دور نہ کر سکتی تھی۔ تجربہ کار ازبکوں نے ایسی آویزشوں کو چھوڑ کر محاصرے کا دائرہ تنگ کیا اور راتوں کو ڈھول دمامے بجا بجا کر مدافعین کو تنگ کرنا شروع کیا جو تھکے ماندے بستر چھوڑ چھوڑ فصیلیں بچانے کو بھاگ کر آتے تھے۔ مزید برآں اب انھیں بھوک ستانے لگی تھی۔ فصلیں تیار ہو گئی تھیں۔ مگر شہر میں کوئی نیا غلہ نہ لاتا تھا۔ لوگ بہت تنگ ہو رہے تھے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ کتوں اور گدھوں کا گوشت کھانے لگے تھے۔ گھوڑوں کا دانہ چارہ نہیں رہا تھا۔ درخت کے پتے کھلائے جا رہے تھے۔ ان میں شہتوت اور درخت "قرالیفاچ" کے پتے بہتر کام دیتے تھے۔ بعضوں نے درختوں کی چھال پانی میں بھگو کر کھلائی۔ باہر سے کوئی کمک نہیں آئی کہ ہم کو محاصرے سے نکالتی۔

پرانے لوگوں کا قول تھا کہ قلعے کی حفاظت کے لیے ایک سر، دو ہاتھ دو پاؤں درکار ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سر یعنی سردار، فوج اور کمک دو ہاتھ اور قلعے کے اندر خوراک اور پانی یہ دو پاؤں ہیں۔ ہم مدد کے لیے اردگرد نظر ڈالتے تھے تو جو مدد دے سکتے تھے ان کی توجہ دوسری طرف تھی۔ سپاہی اور شہری دونوں کی آس ٹوٹ گئی اور دو دو چار چار کر کے ساتھ چھوڑنے لگے...... میرے ذاتی

ملازمین، معتبر اشخاص تک فصیل سے خود کو گرا کر فرار ہونے لگے۔ اب محاصرے سے نجات ملنے کی بالکل امید نہیں رہی۔ سامان خوراک کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔

شیبانی خاں کو ہمارے مصائب کا علم تھا۔ اب وہ آگے بڑھا اور غار عاشق میں اپنا پڑاؤ ڈالا۔ ادھر میں نے بھی اس کے سامنے کوتہ پایاں ہونا اختیار کیا۔ انہی دنوں اوزون حسن (مغلوں کا ایک سابق سردار) دس پندرہ آدمیوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا۔ وہ جہانگیر میرزا کی بغاوت کا، جس کی وجہ سے مجھے پہلے سمرقند سے نکلنا پڑا، سرغنہ تھا۔ اس بار پھر [illegible] آنا بڑی جرأت کی بات تھی۔ شیبانی خاں نے [illegible] کی وساطت سے صلح کی گفتگو کی۔ اگر کہیں سے بھی ذرا سی کمک یا امید ہوتی تو میں اس کی طرف بالکل اعتنا نہ کرتا۔ مگر مجبوراً کرنی پڑی اور بری بھلی صلح کی شرطیں طے ہو گئیں۔ آدھی رات کو میں شہر کے شیخ زادہ دروازے سے سمرقند سے نکل آیا۔ میری ماں خانم بھی میرے ساتھ تھی لیکن گڑبڑ میں بڑی بہن خانزادہ بیگم رہ گئی اور شیبانی کے ہاتھ آ گئی۔" (مگر بابر کے [illegible] توں کے خلاف حیدر میرزا کا بیان ہے کہ خانزادہ بیگم ازبک کے حوالے کر دی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بلند ارادہ شہزادی خود شیبانی کے ہاں چلی گئی۔ اگرچہ جہاں تک ممکن تھا برابر اپنے بھائی کے لیے کام کرتی رہی۔ [illegible] نانی نے بھی سمرقند میں رہ جانا پسند کیا اور ان دو خاتونوں نے اس حال میں بھی موہوم امید دل کو نہ چھوڑا)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو شیبانی کے وعدے پر کہ انہیں بخیر و سلامت جانے دیا جائے گا، بھروسہ نہ تھا اور اس کی مختصر جماعت رات کے وقت کھلے میدان کی بجائے دریا کی طرف سے نہر بہول کے کنارے کنارے روانہ ہوئی۔" ان نہروں میں ہم راستہ بھول گئے۔ نماز فجر کے قریب قریب صرف قارابوغ کے ٹیکرے تک پہنچے۔ راستے میں قنبر علی اور قاسم بیگ سے میں نے گھڑ دوڑ کی اور دونوں سے آگے نکل گیا۔ انہیں دیکھنے کے لیے زین پر سے مڑا تھا کہ خود زین اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور تنگ ڈھیلا ہونے کے باعث میں سر کے بل زمین پر گرا۔ ہرچند اسی وقت اچھل کے پھر سوار ہو گیا لیکن شام تک دماغ صاف نہیں ہوا اور اس عرصے میں جو کچھ گزرا، وہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خواب کے واقعات ہیں۔ شام کو ہم ایلان اوتی میں گھوڑوں سے اترے۔ ایک گھوڑا ذبح کیا۔ گوشت بھونا۔ پھر سوار ہو کر چل پڑے ...... دزاخ میں ہمیں فربہ گوشت، میدے کے عمدہ نان، کثرت سے خربوزے اور اعلیٰ درجے کے انگور ملے۔ ایسی [illegible]

کے بعد بہ افراط اور کیسی کچھ سختی کے بعد یہ امن و راحت نصیب ہوا۔ شعر:

موت کا خوف دل سے ہو گیا دُور

بھوک کی آگ ہو گئی کافور

ایسا آرام و سکون ساری عمر ہم نے نہ دیکھا۔ شادمانی وہی بہت خوب ہوتی ہے جو رنج و تکلیف کے بعد میسر ہو۔ آئندہ زندگی میں چار پانچ دفعہ ہی مصیبت کے بعد ایسی راحت مجھے ملی مگر یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک موذی دشمن سے مجھے نجات ملی تھی دو تین روز تک ہم نے آرام لیا اور لطف اُٹھایا۔"

ہمارا شیر پھر پہاڑیوں میں گلہ بانوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ سردیاں چھپنے سے قبل اس نے اپنی دوسری جلا وطنی کے معاملات کا انتظام کیا اور بیمار ماں کو لے کر تاشقند میں اپنے ماموں محمود خاں سے رہنے کے لیے کوئی بستی مستعار مانگی۔ اس نے جو مقام دیا وہ محض ایک گاؤں دہ کت[1] تھا۔ ایک اونچے پہاڑ کے بازو میں یہ چرواہوں کے ٹھکرے تھے۔ خجندی شاہراہ یہاں سے نظر آتی تھی۔ دہ کت میں کئی سرداروں نے جن میں جُل بلا قنبر علی شامل ہے، اور جو اس طرح بھیڑ بکریوں میں کہ کہیں ہاتھ مارنے کا موقع نہ تھا، رہنا پسند نہ کرتے تھے۔ بابر سے اندجان کی نواح میں اپنے اہل و عیال کے پاس جاڑے گزارنے کی اجازت مانگی بابر نے انھیں جانے دیا۔

بُرے بھلے ہر حال میں وقت کو اچھی طرح گزارنے کا اس میں مادّہ خداداد تھا۔ سمرقند میں ملک و مال سب کچھ ہاتھ سے دے کے راتوں رات ماں کے ساتھ کھائیوں اور نالوں کے راستے بچتا بچاتا نکلا تو صبح کو راستہ نظر آتے ہی گھڑ دوڑ کی سوجھی تھی۔ اب غربت میں ان ٹھکروں میں گشت ہی لگانا شروع کیا اور اپنی دلچسپی کے سامان ڈھونڈ لیے۔ لکھتا ہے:

"یہاں کے باشندے اگرچہ (فارسی بولنے والے) سرتے ہیں لیکن ترکوں کی طرح بھیڑوں، گھوڑیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ گلے پالتے ہیں۔ اسی گاؤں کی بھیڑوں کی تعداد ۴۰ ہزار ہوگی۔ ہم یہاں کسانوں کے گھروں میں مقیم ہوئے۔ میں چودھری کے مکان میں اُترا جو بہت سن رسیدہ کوئی اسی سال کی عمر کا ہوگا۔ مگر اس کی ماں زندہ اور اس کی عمر ایک سو گیارہ سال کی تھی۔ کتنی طویل زندگی اسے ملی۔ کہتی تھی، اس کا کوئی رشتہ دار ہندوستان فوج کشی میں امیر تیمور کی سپاہ میں تھا۔ اسے یہ بات خوب یاد تھی اور مجھے سنایا کرتی تھی۔" بابر نے

---

[1] مصنف نے اس کا ترجمہ TEN TOPS لکھ دیا ہے اصل تزک سے صحیح نام یہاں لکھا گیا۔ مترجم۔

حسب عادت حساب لگایا کہ گلّہ بانوں کی یہ بزرگ خاتون تیمور کی فتح ہندوستان کے وقت پانچ سال کی ہوگی اسی عمر میں بابر نے سمرقند کے محل میں تیموری فتح کی تصویریں دیواروں پر بنی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ عروج رفتہ کا مبہم سا اشارہ تھا۔ شیر نے ان خیالات میں کھو جانا تضیع اوقات سمجھا۔ مگر بالفعل یہ بات بھی ذہن میں نہ تھی کہ وہ آئندہ کیا کرے گا۔ لہٰذا اور کچھ نہیں تو اس نے صد سالہ بڑھیا کی اولاد کا حساب لگانا شروع کیا:

"اسی گاؤں کے علاقے میں اس کی اولاد (یعنی بیٹے، پوتے، پڑپوتے، سڑپوتے ۹۶ موجود ہیں۔ مرنے والوں کو بھی شمار کیا جائے تو اس کی اولاد کی کل تعداد دو سو نکلتی ہے۔ اس کے پوتے کا ایک پوتا ۲۵، ۲۶ برس کا گھبرو جوان تھا۔ بھری داڑھی سیاہ تھی۔"

حسب معمول بابر نے پہاڑی ٹیلوں میں گھومنا شروع کیا۔ اکثر کسی خواجہ (مذہبی آدمی) کے ساتھ اور اس سے باتوں میں وہ منہمک رہتا تھا:

"عام طور پر میں ننگے پیر چلا کرتا تھا۔ اس عمل سے پاؤں کے تلوے ایسے سخت ہو گئے تھے کہ روڑی پتھر کی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح کے گشت لگاتے میں ایک دن عصر و مغرب کے درمیان ہمیں ایک آدمی ملا کہ پگ ڈنڈی پر گائے لیے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کھلا راستہ کدھر ہے؟ کہنے لگا اس گائے کے پیچھے چلے آؤ۔ اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دو یہاں تک کہ وہ بڑے راستے پر پہنچ جائے۔ میرے ساتھ خواجہ (اسد) تھا۔ ہنس کر کہنے لگا "بھلا گائے راستہ بھول گئی تو ہم غافل انسانوں کا کیا بنے گا؟"

"ان سردیوں میں قاسم بیگ بار بار کہتا تھا کہ آپ کے آدمی اندجان جا رہے ہیں۔ شہزادہ جہانگیر مرزا کو آپ کوئی تحفہ ضرور بھیجیں۔ میں نے اپنی قاقم کی ٹوپی ہدیۃً بھیجی۔ قاسم بیگ نے کہا تنبل کو بھی کچھ بھیج دیجیے تو کیا مضائقہ ہے۔ میرا جی نہ چاہتا تھا مگر اس کے اصرار پر (بہ تصحیح مترجم) نوبان (نوئیں)، کوکل تاش نے سمرقند میں جو بھاری تلوار بنوائی اور میں نے لے لی تھی تنبل کو بھیج دی۔ اگلے سال یہی تلوار خود میرے سر پر چلائی گئی جیسا کہ آگے بیان کروں گا۔

چند روز بعد میری نانی الیسان (ایسن) دولت بیگم جو میرے سمرقند چھوڑنے کے وقت وہاں رہ گئی تھی، اپنے بھاری اسباب، چند متعلقین اور کچھ ننگے بھوکے آدمیوں سمیت میرے پاس آ گئی۔ "بس بڈھی نانی کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ سمرقند کی خبریں آئیں۔

"شیبانی خاں نے دریا (سیحوں) کو خجند پر منجمد جگہ سے عبور کیا اور مضافات کو لوٹ رہا تھا۔ ہم نے

یہ دشمن اگرچہ تعداد میں قلیل ہونے کے باوجود اس کے تعاقب میں گھوڑے دوڑا دیئے۔ ہم خجند کے نیچے تک آئے بلا کی سردی پڑ رہی تھی اور رہرو وقت ہوا ایسی تند و تیز تھی جیسی ہادِ درویش میں چلتی ہے ریگ کا ردانی شاہراہ کے صحرائی ٹکڑے کا وہ مقام ہے یہاں مشہور تھا کہ آندھی میں چند بے نوا فقیر "یا درویش، یا درویش" پکارتے پکارتے ہلاک ہوئے۔ وہاں کی تیز ہوا ضرب المثل ہو گئی تھی، شدّت سرما کی وجہ سے ہمارے دو تین ساتھی ضائع ہو گئے۔ مجھے غسل کی حاجت ہوئی۔ ایک نہر میں جس کے کنارے کا پانی یخ بستہ مگر بہاؤ کے باعث بیچ[1] میں برف نہ تھی، میں نے غسل کیا۔ سولہ غوطے لگائے۔ سارے جسم کے اندر سردی سرایت کر گئی دوسری صبح ہم بھی خجند کے قریب برف پر سے دریا پار ہوئے لیکن شیبانی خاں گاؤں لوٹ کر جا چکا تھا۔"

واپسی کے سفر میں بابر کو ایک صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ اس کا عزیز ترین رفیق نویان کوکلتاش جو ایک نظامی ضیافت میں پیچھے رہ گیا تھا، پہاڑی سے جہاں ضیافت ہوئی ، ناؤ نوش کے وقت عجیب طور پر کھڈ میں گرا اور مر گیا۔ بابر کو سخت رنج اور شبہ ہوا کہ ایک ہرجائی نوجوان[2] جو اس سے دلی کینہ رکھتا تھا اس حادثے کا باعث ہوا لیکن مرنے والا مر چکا۔ سوائے اس کے کہ شدنی کہہ کر صبر کرے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

آمد بہار نے پہاڑوں پر برف کی مُہر توڑ دی۔ ایک روز ہمارا شیر کنارِ آب ایک دلکش پتھر پر چند حکیمانہ اشعار کندہ کروا کے خوش ہو رہا تھا کہ خبر ملی ازبک خود اس کے گاؤں کی طرف شارع عام پر دیکھے گئے۔ کوکلتاش کا صدمہ ابھی تازہ تھا۔ پریشانیوں میں خیال آیا کہ اس طرح بے در بے گھر بلا ملک و وطن پہاڑوں میں پڑے پھرنے سے کیا حاصل ہوگا۔" میں نے دل میں کہا بہتر ہے کہ ہم خان کے پاس تاشقند چلیں۔" قاسم بیگ اس رائے کے سراسر خلاف تھا۔ اس نے سزا دے تین چار مغل قتل کرائے تھے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اب وہ ان کے ہم وطنوں میں جانے سے اندیشہ مند ہوا اور میرے کہنے سننے سے بھی رضا مند نہ ہوا اور اپنے بھائی بند، رفیقوں سمیت رخصت ہو کر حصار و خسرو شاہ کا سرحدی مقام چلا گیا..... میں خان کے پاس تاشقند کو روانہ ہوا۔"

عید رمضان ہونے تک ٹھہر کر بابر چلا تو ملازم خاص کے سوا صرف تین چار آدمی ساتھ چلنے کا ساز و سامان کر سکے۔ ماموں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کوئی مناسب تحفہ نہ تھا لہٰذا ایک رباعی لکھی اور تراش خراش کر کے ماموں کو سنائی۔ پہلا مصرعہ تھا کہ" آفت زدہ کی دوسرا کوئی خبر نہیں لیا

---

[1] بہ تصحیح مترجم۔ [2] تزک میں نام مومن ہے۔ مصنف کا قول کہ وہ مفعول تھا بلا سند اور غلط ہے یا بہ کہ کوکلتاش کے غم میں

کرتا۔ اللہ خود آفت زدہ نے سوچا تھا کہ خان اس کے واسطے کیا کر سکتا ہے۔

چنگیزی جھنڈوں کے ساتھ

محمود خاں نے بھانجے کا محبت سے خیر مقدم کیا۔ صحرائی قبائل کی مخلصانہ مہمان نوازی کی۔ اگرچہ وہ خود تھوڑی بہت شاعری کیا کرتا تھا مگر مغلوں کے رسمی رئیس اعلیٰ نے ازراہِ احتیاط التجا آمیز رباعی کو سن کر کچھ نہیں کہا۔ بابر افسردہ ہو کر لکھتا ہے" بظاہر خان بھی کلام کے حسن و قبح سے زیادہ واقفیت نہ رکھتا تھا "

اسی احتیاط کے ساتھ اس نے بابر کی تازہ تجویز کہ وہ دونوں مغلوں کا لشکر لے کر چلیں اور باغی تنبل کو مزا دے کر ملک چھین لیں، قبول کی۔ طاقتور ازبک کی نسبت تنبل بہر حال کمزور حریف تھا اور محمود خاں کے تجویز قبول کرنے میں اور مصلحتیں بھی تھیں جن کا اس نے اظہار نہیں کیا۔ لشکر کا کوچ خاص دھوم دھام کی رسموں سے ہوا اور بابر کو معلوم ہوا کہ جنگی جھنڈوں کو برکت دینے کی قدیم رسم میں اسے بھی حصہ لینا ہوگا؛

" ساری فوج باقاعدہ ایک بڑا دائرہ بنا کر کھڑی ہوئی۔ قدیم قاعدے کے مطابق تُرہیاں (نفیریں) بجیں۔ خان اپنے گھوڑے سے اُترا۔ اس کے سامنے نو جھنڈے لائے گئے جن سے گھوڑوں کی دُمیں لٹک رہی تھیں۔ ایک مغل نے لمبی سفید چادر کے سرے سے بیل کی ران کی ہڈی کو باندھا۔ وہ اسے تھامے رہا۔ دوسرے نے تین ایسی ہی چادریں جھنڈوں کی بلیوں پر دُموں کے نیچے باندھیں اور پھر چادروں کا نچلا سرا کھینچا یا کہ خان اس کا بیٹا اور میں ان کے اوپر کھڑے ہو جائیں۔ اب جس مغل نے چادریں باندھی تھیں، اس نے بیل کی ہڈی اپنے ہاتھ میں لی اور جھنڈوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ اشارے کر کے بعض الفاظ کہے۔ خان اور اس کے گرد کھڑے ہونے والوں نے پیالوں میں گھوڑی کا دودھ لے کر تھوڑا تھوڑا جھنڈوں پر چھڑکا۔ پھر سب نقارے اور بوق تُرہیاں یکبارگی بجائے گئے اور پوری فوج نے جھنڈوں کی طرف منہ کر کے تین دفعہ جنگی نعرے لگائے۔ اُچھل اُچھل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور تین دفعہ جھنڈوں کے گرد سرپٹ دوڑایا اور نعرے مارتے رہے۔

" چنگیز خاں نے جیسے قاعدے بنا دیئے تھے ٹھیک اسی کے مطابق یہ مغل آج تک عمل کرتے ہیں۔

ہر شخص کی صفوں میں دائیں بائیں وہی جگہ مقرر ہے جہاں اس کے باپ دادا کھڑے ہوا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ بھروسے کے لوگ یمین و یسار کے سروں پر دور دور کھڑے ہوتے ہیں ...... دوسری صبح پھر فوج نے بڑا دائرہ بنایا لیکن یہ شکار کھیلنے کی غرض سے تھا۔"

صحرائی جنگ آزماؤں کی ان قدیم رسوم سے بابر کو زیادہ دلچسپی نہ ہو سکی۔ وہ مہمان کے طور پر شریک ہوا اور چونکہ یونس خاں کا نواسہ تھا، اس کی ان تقریبات میں عزت و توقیر مرعی رکھی گئی۔ پھر بھی اگلے دن گیاہ زار میں شکار کھیلا گیا تو پہلی مرتبہ اس نے شکار میں شرکت سے اجتناب کیا اور اس میں شریک ہونے کی بجائے ایک غزل تیار کرنے میں مشغول رہا جس کا مطلع تھا:

"جان کے سوا کوئی دوست مجھے نہ ملا،
بجز اپنے دل کے کسی کو میں نے محرم راز نہ پایا"

لشکر میں اس کی پیٹی کا طلائی حلقہ چوری ہو گیا تو اسے حد سے زیادہ ناگواری ہوئی۔ اگلے دن دو تین مغل لشکر سے فرار ہوئے تو اس نے دل میں انہی سے چوری منسوب کی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ مہم محض اس کی خاطر مشق کے طور پر چلائی گئی تھی۔ لکھتا ہے کہ "خان نے کوئی قلعہ نہیں لیا۔ کسی دشمن کی گوشمالی نہیں کی۔ بس باہر گیا اور واپس آ گیا۔"

تاشقند واپس آکر بابر کو کوئی آرام و اطمینان میسر نہ ہوا۔ میدانی علاقے کے اس بزرگ شہر میں جو دریائی شاخوں کے درمیان آباد اور فصیل بند کیا گیا تھا جامع مسجد میں دور دور کے لوگ نئی نئی شکلیں جمع ہوا کرتی تھیں۔ بابر کو ان سے کوئی سروکار نہ ہو سکتا تھا۔ سمرقند کے کاروان گھنٹیاں بجاتے دور شاہراہ سے گزرتے تو وہ آوازیں اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ یہیں سے بھاری مال کے قافلے مشرقی پہاڑوں کی نیل گوں بلندیوں کی طرف مڑ کر چین کی بڑی شمالی شاہراہ پر پڑ لیتے تھے۔ تاشقند میں کوئی تاخت و تاراج نہیں ہوئی لیکن اہل علم سے جو شہر کی جان ہوتے ہیں، خالی تھا۔ باہر چراگاہوں میں گھوڑوں اور مواشی کی کمی نہ تھی۔ لوگ پیٹ بھر کے اچھا گوشت، خشک میوے، تازہ گرم نان کھاتے تھے۔ گلی کوچوں میں زندگی کے لطائف و عجائبات پر زبان کھولنے والا کوئی شاعر نہ تھا۔ البتہ تقریر دانے جیبیں کتے پھرتے تھے۔ سو انھیں دینے دلانے کے لیے بابر کے پاس ملکانہ تھا۔ خان کے دربار میں وہ جاتا تو دو تین آدمی سے زیادہ جلو میں نہ ہوتے جن سے توقیر ظاہر ہو۔ اسے اس طرح بسر کرنا دو بھر ہو گیا

تھا۔ اپنی افتادِ مزاج کے مطابق اسے آرزو تھی کہ گھوڑا لے اور اس مصیبت سے نکل جائے۔ زیادہ دن کس طرح
ٹھیر سکتا تھا کہ لوگ اس کی بے سروسامانی پر انگلیاں اُٹھائیں۔ سوچتا تھا کہ کسی ایسے ملک میں نکل جائے
جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ چین کے راستے جانے والے قافلوں کو سامان لادتا دیکھ کر دل میں گدگدی ہوتی
کہ وہ بھی اسی طرف نکل جائے۔ حسبِ معمول اس نے دل ہی دل میں اس منصوبے پر بحث کی کہ کوئی حتمی
فیصلہ کر سکے۔ کیا وہ ہمیشہ سے سیر و سفر کا شائق نہ تھا جس سے فرغانہ میں بادشاہ ہو جانے کی ذمہ داریوں
نے اسے باز رکھا؟ اب وہ بادشاہی توقصہ ماضی ہوئی۔ اس کی ماں، اپنی ماں اور چھوٹے بھائی (محمود خاں)
کے پاس حفاظت سے رہتی ہے۔ علیٰ ہذا اس کی چھوٹی بہنیں محفوظ ہیں۔ بڑی بہن، اس کے حق میں اچھا
ہو یا بُرا، بہرحال شیبانی خاں کی تحویل میں ہے۔

شیبانی کا دھیان آتے ہی بابر کو ماموں کا گھر چھوڑنے کی ایک تدبیر سوجھی اگرچہ عملاً خان کے گھرانے
کا فرد بن جانے کے بعد اب الگ ہونا سہل نہ تھا۔ تاہم وہ فوراً اپنے مخلص اور دین دار مشیر (بہ تصحیح مترجم)
خواجہ ابوالمکارم کے پاس گیا اور دونوں نے مل کر خاصی معقول وجہ سوچ لی جسے خان کے سامنے پیش کیا
جائے۔ وہ تھی شیبانی۔ یہ ازبک بابر کے ترکوں اور محمود کے مغول، دونوں کا مشترک دشمن تھا۔ ضروری تھا
کہ اس کی قوت اور زیادہ مستحکم ہونے سے پہلے، آج اس کا تدارک کیا جائے۔ آگ کی آنچ نکلنے کے ساتھ
ہی اسے بجھا دیتے ہیں ورنہ بھڑک اُٹھنے کے بعد وہ قابو میں نہیں رہتی۔ بابر نے برمحل ایک قطعہ تیار کیا
جو اس کا ماموں بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس کا آخری شعر یہ تھا:

مگذار کہ زہ کند کماں را
دشمن کہ بہ تیر می تواں دوخت

تجویز تو مرتب ہو گئی، اب سوال تھا کہ وہ کس طرف جائے؟ خیال آیا کہ کیوں نہ مشرق میں
اپنے چھوٹے ماموں کے دربار کا رُخ کیا جائے۔ بابر اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ اب مشہور ہوا کہ اسے
ازبک کے مقابلے میں شریک کرنے کے لیے تاشقند لانے کی غرض سے جا رہا ہے۔ یہ چھوٹا ماموں
چین کی شاہراہ پر تھا۔ بابر نے اپنے بلا چین کو چلے جانے کی بات کسی کو، غالباً ابوالمکارم کو بھی نہیں
بتائی تھی۔ اس کی ماں ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی اور باقی ساتھی رفیق بھی ساتھ چھوڑ کر چل دیتے۔ مگر شیر
کے ماموں کے ہاں سے نکل جانے کی یہ ایچ پیچ کی چالیں، چل نہ سکیں۔ خواجہ ابوالمکارم نے اس کے حسبِ ایما

رچھوٹے ماموں کے پاس جانے کا زبانی سے ذکر کر دیا اور جیسی توقع تھی فوراً خان تک خبر پہنچ گئی اس نے
خواجہ کو طلب کیا اور پوچھا کہ بابر سے ایسا نا روا برتاؤ کیا گیا ہے کہ وہ اس طرح جانا چاہتا تھا؟
صریحاً خان کو بُرا معلوم ہوا۔ اس نے بھانجے کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس طرح چین کی طرف نکل
جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ پھر ایک بات ایسی پیش آئی کہ وہ بالکل ختم ہو گیا۔ بابر صفائی سے تزک
میں اقرار کرتا ہے کہ "میرا منصوبہ یونہی رہ گیا"۔ اصل میں ایک قاصد خبر لایا تھا کہ شمالی بڑی شاہ راہ سے
اس کا چھوٹا ماموں الچہ خاں[1] خود تاشقند آ رہا ہے۔ (الچہ خاں یعنی قتّال)۔ اس رسمی اطلاع کے بعد
دوسرا ہرکارہ آیا اور بتایا کہ خان تاشقند کے قریب پہنچ گیا ہے۔

یہ محض حُسنِ اتفاق نہ ہو گا۔ قرینہ غالب یہ ہے کہ بڑے خاں کو بابر اور ازبکوں کے مسئلے پر غور
کرنے سے وہی تجویز مناسب معلوم ہوئی جو بابر نے اپنے چین جانے کا حیلہ کرنے کے لیے بنائی تھی۔
یعنی کہ دونوں خان بھائی ملاقات کریں اور اپنی فوجی اور دماغی طاقت جوڑ کر ایسی تدبیریں نکالیں
جس میں بابر کے لیے کچھ کیا جائے اور اسی کے ساتھ خود ان خان بھائیوں کا بھی فائدہ ہو۔ دوسری طرف
یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بابر نے اس واقعے کی ایسی کوئی توجیہہ نہیں کی وہ اس عمر میں واقعات کی علّت پر
توجہ نہیں کرتا تھا۔ بنا بر اس نے الچہ خاں کے آنے کو اتفاقی ہی سمجھا مگر کام کرنے پر فوراً تیار ہو گیا۔

شہر میں اس کی آمد کا غل غلہ سا مچ گیا تھا۔ پچیس سال سے تاشقند والوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔
حقیقت میں وہ پہاڑوں کے اس عظیم جھرمٹ کے پیچھے، جو ہندوکُش سطح مرتفع تبت اور جانب شرق
کوہستان تھیان شان کے ملنے سے بنا ہے، چھپ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ آخری نام تک
جس کے معنی آسمانی پہاڑ ہیں، غیر ترکستانی یعنی چینی ہے۔ اس کی چراگاہیں "ارضِ مغول" کہلاتی تھی۔ قتّال کا
عرف اس بنا پر پڑا کہ بد وضع قزق گروہوں کو جو ازبک جتھے کو چھوڑ آئے تھے، اس نے کئی میدانی معرکوں
میں شکستیں دیں۔ وہ اپنے آبا و اجداد کے اصلی جنم بھوم، طلوعِ آفتاب کی سرزمین مشرق سے آ رہا تھا۔
چنغتے کا سچا وارث وہی تھا اگرچہ عمر میں چند سال بڑے ہونے کی وجہ سے یہ منصب برائے نام محمود خاں
کو مل گیا۔ دونوں خانوں کی ماں دوڑی دوڑی پھر رہی تھی۔ الچہ کے ہمراہ کتنے آدمی ہیں۔ اب کتنی دُور
رہ گیا ہے؟ انتظامات کے احکام دینے میں مصروف تھی کہ کیا کیا کھانے کھلائے جائیں گے۔ کہاں

---

[1] انگریزی متن میں ALASHA لکھا ہے۔ اصل تزک میں الچہ (الاچی بہ معنی قتال) ہے اور یہ عرف ہے۔ اصلی نام
[illegible]

اتارا جائے گا۔ پھر فرودگاہ کی درستی، شاگرد پیشوں کو جمع کرا رہی تھی۔ فرصت ملتے ہی بہنوں بیٹیوں کو ہمراہ لے کر، خود بھی بیٹے کو لانے اسی راستے پر روانہ ہو گئی۔ مغلوں کا دستور تھا کہ مہمان کی عزت و توقیر کا اندازہ اس فاصلے سے لگاتے تھے جتنی دور میزبان اس کے استقبال کو آئیں ۔ اور خان کو چک نے آنے کی اطلاع بھی تو بہت دیر میں کرائی تھی۔

شہر بانو بیاں آگے تک گئیں۔ مگر بابر اُن سے بھی آگے گیا۔ دل کہتا تھا کہ اسے اپنے انجانے ماموں سے اوروں سے پیشتر ملنا اور گفتگو کرنی بہتر ہے۔ لکھتا ہے کہ بیگمات کو ایک گاؤں میں چھوڑ کر میں بعض مقابر دیکھنے کے لیے آگے علاقے میں نکل گیا" یکایک چھوٹے ماموں سے راستے میں آمنا سامنا ہوا۔ میں رُکا، اس نے بھی باگ روکی۔ وہ کچھ سٹ پٹایا کیونکہ غالباً گھوڑے سے اُتر کر قاعدے قرینے سے ملاقات کرنی چاہتا تھا۔ ان رسمیات کا وقت نہ تھا۔ میں خود گھوڑے سے کودا۔ گھٹنوں پر جھکا اور بغل گیر ہونے سے پہلے سیدھے ہو کر رُو در رُو کھڑا ہوا۔ انھوں نے فوراً مضطربانہ اپنے لڑکوں کو جو تیرہ چودہ برس کے تھے آواز دی کہ مجھے آداب بجالائیں اور گلے لگیں۔ پھر میں سوار ہو کر انھیں شاہ بیگم (والدہ) کے پاس لایا۔ وہ سب آپس میں ملے۔ بہنوں کو خان نے اتنے دن میں دیکھا، پہچانا پھر سب بیٹھ کر آدھی رات تک اپنی رام کہانیاں سناتے رہے۔

خان کو چک قوی الجثہ بہادر آدمی تھے۔ ان کا دل پسند ہتھیار تلوار تھی۔ کہا کرتے تھے کہ گرز و تبر لگے بھی تو ایک ہی جگہ لگتے ہیں، ز بہ نصیبِ مترجم، تلوار سر سے پاؤں تک کاٹ جاتی ہے۔ چنانچہ تلوار ہمیشہ باندھ میں یا کمر سے بندھی رکھتے اور کبھی جدا نہ کرتے تھے۔ چونکہ دور دست دیہات میں پرورش پائی تھی گفتار و اطوار میں کس قدر درشتی تھی"۔

لیکن یہ رسم پرست مغل بھانجے سے پہلی ملاقات کا بے ڈھنگا پن نہیں بھولا۔ دوسرے دن باقاعدہ مغل دستور کے مطابق اس نے بھانجے کو تحفہ تحائف دیے، حالانکہ بیچارے بابر کے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ نذر کرتا،

" اس نے مجھے خود اپنے ہتھیار، ایک گھوڑا مع زین اور پورا خلعت دیا جس میں اُونی مخملی ٹوپی، چینی اطلس کارچوبی کام کی قبا اور چینی زرہ بکتر شامل تھے۔ رسم قدیم کے مطابق بائیں طرف خریطہ لٹکایا گیا جس میں پتھر (چقماق) کی تختی اور ایک بٹوا تھا اور دائیں جانب تھیلی میں عورتوں کی انگوٹھیاں

چھوٹی عطردانی کی وضع کی نھیں۔"

اس عرصے میں بڑے خان چار فرسخ تک بڑھ کر آئے اور بھائیوں میں ملاقات پوری رسوم و آداب کے ساتھ کہ دورافتادہ دیہات کے مغول کو بھی شکایت کی گنجائش نہیں رہی، انجام پائی۔ سڑک کے کنارے شامیانہ ڈال کر محمود خاں مسند پر متمکن ہوا۔ خان کوچک گھوڑے پر سیدھا وہاں تک آیا دائیں سے بائیں کو گرد چکر کاٹا پھر سامنے گھوڑے سے اُترا اور آداب گاہ تک بڑھ کر نو دفعہ جھکا۔ پھر آگے بھائی سے بغل گیر ہونے چلا۔ فوراً بڑا خان اُٹھا آنکھیں چار ہوئیں، اور بڑی دیر تک بھائی کو گلے سے لگائے رکھا الگ ہو کر دوبارہ خان کوچک نے آداب گاہ پر نوبار تعظیمی رکوع کیا اور اسی طرح تحائف گزرانتے وقت۔ پھر وہ آکر بھائی کے پاس بیٹھا...... جب میں اس مغلی خلعت وغیرہ کو پہنے ہوئے چھوٹے ماموں کے ہمراہ تاشقند میں آیا تو خواجہ ابوالمکارم تک نے مجھے نہیں پہچانا۔ پوچھنے لگے یہ کون سا سلطان ہے؛ جب مَیں نے بات کی تب اس نے پہچانا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ماموؤں کی ان جدید رسموں میں بابر کوئی موزوں حصّہ دار نہ ہو سکا اور ان کے مشوروں سے بھی الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ تاہم جب انھوں نے اپنی مسلح فوجوں کو صف بندی کرا کے باہمی ملاپ کی رسم مغلی طرز میں ادا کی تو وہ خوش ہوا۔ اس جائزے میں اس نے دیکھا کہ خان کوچک صرف دو ہزار شمشیر زن لایا تھا۔ پوری سپاہ کا تخمینہ تیس ہزار سوار مسلح ہوتا تھا۔ اس طرح فوجی جمعیت اور اقتدار کے لحاظ سے بھی بالادستی بڑے خان کو حاصل تھی۔ وہ مل کر تنبل کی مزاحمت کا بہ آسانی خاتمہ کر سکتے تھے اور انھوں نے کہا بھی یہی کہ اس باغی کو فرغانہ سے نکال باہر کریں گے جس وقت بابر کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کے آگے بھیجا گیا تو وہ بہت مسرور ہوا اور عالم سرور میں اتنا بھی نہ سوچا کہ جو فوج اس کے ماتحت چلی وہ اس کے ساتھ کوئی وابستگی نہ رکھتی تھی۔ بلکہ محض دونوں خانوں کے حکم سے، جو ساتھ میں نہ آئے تھے، لڑنے نکلی تھی۔

اندھیرے میں تیر چلانا

بابر نے تو فوراً کوچ شروع کیا اور حد سے سوا محتاط ماموؤں کو دریا کے ایک طرف چھوڑ کر دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ ماموں بہت دیکھ بھال کرتے ہوئے شمالی کنارے پر تنبل کی فوج کی طرف بڑھ رہے

تھے اور وہ اسی حزم و احتیاط کے ساتھ خندقیں کھود کر مضبوط مورچے لگائے ان کی آمد کا منتظر تھا۔ خان جو دعوے کرتے تھے کہ تنبل کو جاتے ہی روند ڈالیں گے، صرف گھیرا ڈالنے پر قانع رہے۔ مگر بابر ایسا تساہل کہاں کر سکتا تھا۔ تولریوں کا شبک پا لشکر زیر قیادت اور اپنی مرضی کا مالک ہوتے ہی اس نے جنوبی کنارے پر یلغار کی۔ صبح ہوتے ایک قصبے کی محافظ فوج پر چھاپا مارا۔ بستی پر قبضہ کر لیا۔ بستی والے خوش ہو گئے۔ وادی کے لوگ اس کے جانے سے رنجیدہ ہوئے تھے۔ اب جو واپسی کی خبر قافلوں کے ذریعے ہر مسجد اور سرائے میں قریہ بہ قریہ پھیلی تو قلعہ والوں نے دروازے کھول دیئے۔ خانہ بدوش قبائل گھوڑوں پر چڑھ چڑھ کر اس کے لشکر میں آملے۔ پرانے رفیقوں کو بھی ہمت ہوئی کہ اپنی اپنی جمعیتوں کو لے کر پھر حاضر ہو جائیں۔ وادی کے سرے پر اندجان والے بھی اس کے مشتاق تھے۔ تنبل ان سے بہت دور تھا۔ لا محالہ بابر کو اپنے اصلی شہر میں جا پہنچنے کا خیال آیا۔ اس نے ٹھیر کر یہ بھی نہ سوچا کہ اب اس کے بردو میں فرغانہ کے جنگ آزما اور بیرونی مغل دونوں بھرے ہوئے ہیں۔ لکھتا ہے "میرے ذہن میں آیا کہ راتوں رات اندجان کے قریب پہنچ کر وہاں کے شیوخ اور عمائد کے پاس کسی آدمی کو بھیجا جائے کہ شہر والے مجھے قلعے میں پہنچانے کی کوئی تدبیر بنائیں۔ چنانچہ ایک شام کو میں اوش سے چل کر آدھی رات کے قریب اندجان کے دروازوں سے کوئی دو میل فاصلے پر بہ مقام چہل دختران آیا اور قنبر علی اور چند سرداروں کو آگے بھیجا کہ چپکے سے ہمارے قاصد کو شہر میں پہنچا کے وہاں کے عمائد کو اطلاع دے دیں۔ خود ہم اسی جگہ ان کے انتظار میں گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہے۔ رات کی تیسری گھڑی تک بعض کو اونگھ آئی۔ زینوں پر جھک گئے۔ بعض سو گئے۔ یکایک جنگی نعروں اور طبل جنگ کی آواز آئی۔ میرے آدمیوں کو جو غافل اور غنودہ تھے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ دشمن کی تعداد کتنی اور ہم سے کتنے فاصلے پر ہے۔ صف بندی کرنے کی بجائے گھبرا کر بھاگ پڑے جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر ہی کا راستہ لیا۔ مجھے ان کے درمیان جانے کی فرصت نہ تھی۔ سیدھا دشمن پر جھپٹا حالانکہ صرف تین سوار میرے پیچھے رہ گئے تھے۔ تھوڑی دور بڑھا تھا کہ دشمن تیر چلاتے، نعرے لگاتے ہم پر آپڑے۔ ایک سوار جس کے گھوڑے کی پیشانی سفید تھی میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے گھوڑے کے تیر مارا کہ وہ گر کر مر گیا۔ دوسروں نے باگ روک لی۔ میرے ساتھیوں نے کہا، بڑا اندھیرا ہے، خبر نہیں ہمارا مقابلہ کتنوں سے ہے۔ بہتر ہے کہ پلٹ کر پہلے اپنے سپاہیوں کو جمع کریں۔ ہم الٹے پھرے۔ اپنے آدمیوں کو جا لیا۔ بعض کے چابک بھی مارے مگر انھیں

ٹھہرانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لہٰذا پھر ہم چار تعاقب کرنے والوں کی طرف پلٹے اور تیر برسائے۔ وہ ذرا رکے لیکن دوسری تیر باری کے بعد سمجھ گئے کہ ہم صرف چار آدمی ہیں تو پھر بھاگنے والوں پر ڈٹ پڑے اور انھیں گھوڑوں سے گرانے لگے۔ ہم نے تین چار دفعہ حملہ آوروں سے اپنے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی۔ کوئی چھ میل تک اسی طرح بچاؤ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ قرابوق کی پہاڑی پر پہنچے۔ وہاں مبشر ہم سے آ ملا۔ ہمیں نے کہا دشمن کی تعداد زیادہ نہیں ہے آؤ ان پر ایک اور دھاوا کریں۔ ہمارے اس حملے نے ان کو بڑھنے سے روک دیا (وہ لڑائی روکنے کے لیے پکارتے رہے) اس پر ہمارے منتشر سپاہی بھی ادھر ادھر سے آ کر جمع ہو گئے۔ پھر بھی بہت سے آزمودہ کار جنگ آزما اوش تک کہیں نہ ٹھہرے۔ اکھڑتے ہی رہے۔

”یہ افسوسناک واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خود ہمارے لشکر سے ایوب بیگ چک کے (دستے کے) کچھ مغل دوشن سے کھسک آئے اور اندجان کی نواح میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ جب ہمارے لشکر کی آمد اور شور کی آوازیں سنیں تو دبے پاؤں قریب آئے اور پھر قول بولنے میں غلطی ہو گئی۔ اس رات ساری فوج کے لیے قول کے دو لفظ ”تاشقند“ اور اس کا جواب ”سیرام“ یا پہلے سیرام کہیں تو اس کا جواب ”تاشقند“ مقرر تھا۔ ان مغلوں کی ہمارے چراولوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی جن کا سردار محمد علی (غالباً بابر کا سپہ دار تھا) مغلوں نے ”تاشقند“ کا لفظ پکارا۔ محمد علی تاجیک تھا۔ اس کے منہ سے گھبراہٹ میں ”تاشقند تاشقند“ نکلا۔ یہ مغل سمجھے یہ کوئی دشمن کا لشکر ہے۔ نعرۂ جنگ اور گھوڑوں کے طبل بجا کر تیر مارنے شروع کیے۔ اس طرح سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ میرا منصوبہ پورا نہ ہوا۔ ہم سب اوش واپس آ گئے۔“

اپنا باپ کے تخت جسے کئی سال سے نہ دیکھا تھا، واپس لینے کا پہلا اقدام تو جھوٹا خوف پیدا ہو جانے سے ناکام رہا لیکن دوسری دفعہ کی قسمت آزمائی میں وہ پھر خلاف احتیاط کام کرنے کی وجہ سے دائمی خطرے میں مبتلا ہوا۔ مغلوں کے سبب یا لشکر کے اندجان کے قریب پہنچ جانے سے تنبل کو خواہی نخواہی محاصرہ اٹھا کر کے شہر کی حفاظت کو واپس آنا پڑا۔ راستے میں اس کی فوج کے کچھ سپاہی بھی ٹوٹ ٹوٹ کر بابر کی طرف آ گئے۔ مغل لشکر میں آنے سے تنبل کے کمزور ہو جانے کی خبر سن کر بابر ہی نے یلغار کی اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بے تحاشا اپنی فوج کی ایک فوج پر جا پڑا اور انھیں بھگاتا ہوا شہر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ جہاں اس کے آزمودہ کار سرداروں نے اسے روکا۔ انھیں پسند نہ تھا کہ رات کے وقت قلعہ بند

شہر کے اندر داخل ہو جائیں۔ بابر کی یہ رائے نہ تھی مگر سن رسیدہ مشیروں کی بات حسب معمول قبول کر لی اگرچہ تزک میں یہ لکھے بغیر نہیں رہا کہ ایسا کرنا غلط تھا جس کی وجہ سے تمام مغل سواروں کو نواح شہر سے سمٹ کر شب گزاری کے لیے کوئی پڑاؤ ڈھونڈنا پڑا۔

"عشا کے قریب ہم ایک ندی اُنز کے موضع رباط زورق کے نزدیک خیمہ زن ہوئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ تنبل اس وقت بڑے راستے سے اندجان جا رہا ہے لیکن میری جوانی کی ناتجربہ کاری سے ایک چوک یہ ہوئی کہ ہم گاؤں کے قریب ہموار میدان میں اُتر پڑے بجائے اس کے کہ ندی کے کنارے اُترتے جو ہماری حفاظت کرتی۔ مزید برآں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر قراول، یا طلایہ کے پہرہ دار تک مقرر نہیں کیے اور سب سو گئے۔ ہم خواب راحت کے مزے ہی لے رہے تھے کہ طلوع آفتاب سے ذرا پہلے قنبر علی گھوڑا دوڑاتا، اور پکارتا ہوا آیا کہ "اُٹھو، اُٹھو دشمن آ گیا"۔ آواز دے کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اپنی کفتان (زرہ) پہنے ہوئے سویا تھا اور زمانہ امن میں بھی میرا معمول یہی تھا۔ فوراً اُٹھا، تلوار باندھی ترکش سنبھالا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میرا نشان بردار بھی سوار ہوا اور چونکہ جھنڈے کو اس کی بیٹھک میں جانے کی فرصت نہ تھی، ہاتھ ہی میں اٹھائے ہوئے چلا۔ ہم دشمن کی طرف بڑھے تو دس بیدرہ سپاہی میرے جلو میں تھے۔ دشمن کے قراول سے ایک تیر کے پرتاب پر شاید صرف دس آدمی میرے ہم راہ رہ گئے۔ ہم نے جھپٹ کر حریف کے سپاہیوں پر تیر باری کی اور دباتے ہوئے چلے۔ وہ ہٹ گئے تو ایک بار اور تیروں کی باڑ مار کر ہم دشمن کے قلب لشکر کے سامنے پہنچ گئے۔ احمد تنبل سو آدمیوں کے ساتھ اسی جگہ تھا۔ وہ اور ایک اور شخص صف کے آگے کھڑے پکار رہے تھے "مارو، مارو، انھیں مارو"۔ لیکن اس کے آدمی کھڑے ہچر مچر کر رہے تھے گویا دل میں کہہ رہے ہیں کہ بھاگ جائیں یا نہ بھاگیں؟

اس عرصے میں میرے پاس فقط تین آدمی، ناصر دوست، قلی کوکلتاش اور ترکمان رہ گئے تھے۔ میں نے وہ تیر جو انگوٹھے کے نیچے دبا رکھا تھا تنبل کے خود کے جھبے کا نشانہ لے کر چلا دیا۔ ترکش میں ہاتھ ڈال کر دوسرا تیر کھینچا تو بجائے تیر کے مرمت کی نئی میمرا گوشہ گیر جو خان کو بابا نے دی تھی، نکلی۔ میں نے جھنجلا کر اُسے ترکش میں واپس ڈالا۔ اس میں اتنی دیر لگی کہ دو تیر چلا سکتا تھا تیر کمان میں جما کر میں پھر آگے جھپٹا تو میرے ساتھی تینوں پیچھے ٹھٹک رہے اور مقابلے میں سامنے سے دو سوار آئے۔ ان میں آگے خود تنبل تھا۔ ہمارے درمیان شارع عام کی پٹی تھی وہ اس کے ایک کنارے پر چڑھا

اور مَیں دوسری طرف سے بڑھا کہ اس کا سیدھا ہاتھ مجھ تک اور میرا اس تک پہنچ سکتا تھا۔ تنبل پوری طرح مسلح تھا۔ میرے پاس کمان اور صرف تلوار تھی۔ مَیں نے تیر جوڑ کر کمان کان تک کھینچی اور تیر چلا دیا۔ اسی لمحے ایک تیر اور چلا دیا۔ اسی لمحے ایک تیر میری دائیں ران پر لگا اور اندر تک گھس گیا۔ میرے سر پر خود کی بجائے گدہ دار کلاہ (طاقی) تھی۔ تنبل کی تلوار اس پر ایسی پڑی کہ مَیں سُن ہو گیا۔ کلاہ ذرا نہیں کٹی لیکن سر میں سخت ضرب آئی۔ تلوار کو صاف نہیں کیا تھا، وہ زنگ کی وجہ سے جلد کھینچ نہ سکی۔ تامل کا وقت نہ تھا، دشمن مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ مَیں نے باگ موڑی اور ایک اور تیر میرے ترکش پر لگا۔ سات آٹھ قدم ہٹا۔ میرے تین ساتھی قریب آ گئے اب کے تنبل نے ناصر دوست کے تلوار ماری۔ ہم پلٹ کر چلے تو انھوں نے ایک پرتاب تیر تک ہمارا پیچھا کیا۔

ہم ندی کی بڑی دھار پر آئے جو گہری اور چوڑی تھی۔ صرف کہیں کہیں سے اُترنا ممکن تھا، مگر خدا نے صحیح راستہ دکھایا اور ہم وہاں پہنچ گئے جہاں کنارا نیچا اور پار اُترنے کا موقع تھا۔ مگر یہاں ناصر دوست کا گھوڑا تھک کر گر پڑا۔ ہم نے اُتر کے اُسے کھڑا کیا اور پار ہو کے اوش کی بٹیا پر پڑ لیے۔ ٹیکرے پر چڑھے تو مزید طغیانی آ ملا۔ وہ بھی زخمی تھا اور اگرچہ تیر ٹانگ کے پار نہیں ہوا تھا مگر مشکل سے اوش تک آ سکا۔ اس روز غیر مسلح ہونے کی وجہ سے میرے کئی بہترین رفیق مارے گئے یا گھوڑوں سے گرا لیے گئے۔"

بابر زخم کی مرہم پٹی کرا رہا تھا کہ اُسے یہ سُن کر پریشانی ہوئی کہ ماموؤں نے تنبل کے سیر دریا کے پار اُتر جانے سے خوشی خوشی بڑھ کر فرغانہ کا رُخ کیا اور خان کو چک نے اندجان کے باہر اور بڑے نے "ایسن دولت بیگم کے باغ میں جسے "قوش تنگبریاں" (چڑیا چکی کا باغ) کہتے تھے، ڈیرے ڈالے اور فوراً بابر کو ملوایا:

"میں اوش سے آ کر بڑے ماموں سے ملا تو انھوں نے وہ سب مقام (رب تصحیح مترجم) جو پہلے مجھے دیے تھے، اس عُذر سے خان کو چک کو تفویض کر دیے کہ شیبانی جیسا دشمن سمرقند پر قابض اور روز بروز قوی تر ہوتا جاتا ہے [بابر نے اپنے چین جانے کے لیے خود بھی یہی سبب پیش کیا تھا] دوسرے یہ کہ چھوٹے خاں کے پاس یہاں کوئی علاقہ نہیں، مناسب ہے اس کے لشکر کے لیے سیر کے اِدھر کا علاقہ اور اندجان بھی اسے دے دیا جائے۔ شمالی کنارے پر اخسی کے اضلاع مجھے دینے کا وعدہ کیا۔ پھر یہ بھی کہا کہ فرغانہ کا بندوبست کر کے سمرقند پر فوج کشی کریں گے وہ تم کو دیں گے اور فرغانہ کا

پوری ولایت خان کو چک کے حصے میں آئے گی۔ غالباً یہ سب مجھے بہلانے کی باتیں تھیں مگر قبول کرنے کے سوا میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ بڑے خان سے مل کر میں چھوٹے خان کے ڈیرے کو جا رہا تھا کہ راستے میں قنبر علی سلاخ ملا اور کہنے لگا "تم نے دیکھا کہ جو علاقہ تمھارا تھا وہ بھی انھوں نے ہتیا لیا...... یہ تمھارے کام نہ آئیں گے۔ بہتر ہے کہ اوش میں قلعہ بندی کر کے تم تنبل سے صلح کر و اور ان مغلوں کو مل کر پہلے یہاں سے دفع کرد۔ پھر چھوٹے بڑے بھائی کے حصے لگانے کی بات کرنا...... میں نے جواب دیا "خان میرے رشتہ دار ہیں ان کی نوکری کرنا تنبل کے ساتھ مل کر بادشاہی کرنے سے بہتر ہے۔ قنبر یہ جواب سن کر پچھتایا۔ پشیمان ہوا اور تین چار دن بعد چپکے سے اندجان چلا گیا۔

میں چھوٹے ماموں کے پاس گیا تو پہلی ملاقات کی تلافی کے لیے اس مرتبہ وہ مجھے لینے خیمے کے باہر تک دوڑے ہوئے آئے۔ میں ٹانگ کے زخم سے بہ مشکل چل سکتا تھا۔ خان نے مجھے گلے لگایا اور کہا "اے بھائی تجھے تو سب بہادر اور سورما کہہ رہے ہیں؟" پھر مجھے بازو پکڑے پکڑے لے گئے۔ خیمہ قزاقانہ وضع کا چھوٹا سا تھا اور کچھ آراستہ یا صاف ستھرا بھی نہ تھا۔ یہاں انھوں نے مجھے خربوزے اور انگور کھلائے...... میں رخصت ہو کر اپنے خیمے میں آیا تو انھوں نے اپنا مغل جرّاح میرے علاج کے واسطے بھیجا۔ وہ نہایت حاذق اور "اتیکہ بخشی" (یعنی طبیبوں کا چھوٹا باپ) کہلاتا تھا۔ کہتے ہیں کسی کا سر پھٹ کر بھیجا نکل آتا تھا، تو بھی وہ اس کا تدارک اور معالجہ کر سکتا تھا۔ اس نے بہت سے عجیب علاجوں کا مجھے حال سنایا جو ہمارے (مہذب) ولایات میں نہیں ہو سکتے۔ میرے زخم پر پھلوں کی خشک چھال اور لومڑی کی ٹانگ کی کھال باندھ کر پٹی بندھوائی۔"

اس کرامانی پٹی سے زخم کو کیا فائدہ پہنچا، یہ تو معلوم نہیں مگر چند ہی روز میں ہم شیر کو گھوڑے پر سوار نہایت طولانی راستہ طے کرتے دیکھتے ہیں۔ اس کے ماموں نے دوبارہ اسے اخسی پر حملہ کرنے کو مضبوط جمعیت دے کر روانہ کر دیا اور خود اندجان ہی میں رہے۔ پھر اس کے سن رسیدہ سرداروں نے دشمن پر جا پڑنے سے اسے روکا۔ تزک میں لکھتا ہے کہ اکثر یہی ہوا ہے۔ حالانکہ جب ارادہ کر لیا تو جو کچھ کرنا ہے کر گزرنا چاہیے۔ وقت نکل جانے کے بعد پچھتانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اس عرصے میں ایک خلاف گمان صورت پیدا ہوئی۔ اخسی کا قلعہ دار تنبل کا چھوٹا بھائی شیخ بایزید تھا۔ ازبک کے مقابلے میں بابر کو سمرقند میں تنبل نے جو مختصر فوج اظہار دوستی کے طور پر بھیجی تھی، اس

کا سردار بایزید ہی تھا۔ اب اس نے ایک راز دار قاصد کو بھیج کر بابر سے درخواست کی کہ بلا تاخیر خفیہ قلعہ اخسی میں آجائے اور بایزید کو اپنی خدمت وجاں نثاری میں لینا قبول کرے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ایک مستحکم قلعہ ہاتھ آجائے۔ بابر نے اس پیشکش پر غور کیا۔

"اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے چالاکی سے ماموؤں سے توڑ لیا جائے۔ میرے ان سے الگ ہو جانے کے بعد وہ اس وادی میں کچھ نہ کرسکتے تھے۔ عجب نہیں کہ مجھے بلانا اپنے بڑے بھائی تنبل کے اشارے سے ہو اور مغل خانوں سے دور بلا کر وہ میرے ساتھ کوئی عہد نامہ کرنا چاہتے ہوں لیکن میں نے خانوں کو اس بلاوے کی اطلاع کر دی۔ انھوں نے کہا: "تم ضرور جاؤ اور جس طرح ہو سکے بایزید کو پکڑ لو" مگر ایسی فریب کاری میری خصلت نہ تھی خصوصاً جب عہد و پیمان کرنے ہوں، میں بدعہدی نہیں کرسکتا تھا تاہم مجھے فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح اخسی پہنچ جاؤں۔ یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے شیخ بایزید بھائی سے ٹوٹ کر میرے ساتھ ہو جائے۔ پھر کوئی مناسب صورت نکل آئے اور یا وہ اپنی قسمت میری قسمت سے وابستہ کر دے۔"

زندگی کے تلخ تجربے بھی عمر شیخ میرزا کے بیٹے کو یہ سبق نہ دے سکے تھے کہ ساز باز کرنے میں صرف اپنی سمجھ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ حسب عادت اس مرتبہ بھی جو کام کرنے کو دل چاہتا تھا اس کے حق میں حجت نکال کر فیصلہ کر لیا اور جب فیصلہ کر لیا تو پھر اس جال کی طرف دھیان بھی دینا چھوڑ دیا جو اسے پھانسنے کے لیے بچھایا جا رہا تھا۔

"غرض میں نے اپنا ایک آدمی بھیجا اور اس نے بایزید سے قول و قرار کر لیے۔ پھر بایزید کے بلانے پر میں خود چلا گیا۔ وہ استقبال کرنے باہر آیا اور میرے سب سے چھوٹے بھائی ناصر میرزا کو ساتھ لایا۔ ہم اس کے ساتھ قلعے میں گئے اور اس نے مجھے میرے باپ کے محل میں ٹھیرا دیا۔"

یہی وہ مکان تھا جہاں کبوتر خانہ گرنے سے عمر شیخ میرزا کی وفات ہوئی تھی۔ یہ پہاڑی پر سنگین قلعے کی فصیل کے اندر بنا تھا۔ قلعے ہی میں بایزید کی سکونت تھی۔ یہ بات اندیشے سے خالی نہ تھی مگر بابر کو اس گھر کو دیکھ کر دوازدہ سالہ طفلی کی یادیں آ رہی تھیں۔ پائیں باغ میں باپ کی قبر تھی۔ فصیل کے طاقوں کنگوروں پر کبوتر اسی طرح غٹرغوں کر رہے تھے۔ قدیم خدمت گار آ آ کر خوشی خوشی قدم چوم رہے تھے۔ بہت سی باتیں چھوٹے بھائی کو سنانی تھیں۔

اب یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ بابر رواں دواں ساعتوں میں زندگی گزارنے کا ایک خاص مزاج رکھتا تھا اور اس کے لیے قریبی ماحول میں غضب کی دلکشی تھی۔ اتفاقیہ صاف راستہ سامنے آیا تو گھڑدوڑ شروع کردی۔ سایہ دار مرغزار میں ندی نظر پڑی تو گھوڑے سے کود کر تھوڑی دیر اس کے کنارے لطف اٹھانے بیٹھ گیا۔ شب خونوں کے تلاطم میں بھی اس کے گھوڑے کے آس پاس جو کچھ گزرتا وہ اس کی ایسی صاف تفصیلات قلم بند کرتا ہے کہ تاریخ میں اور کوئی شخص ایسی کیفیات نہیں لکھ سکا۔ اپنے اس پرانے گھر میں چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے میں اپنے ماموؤں سے رسل رسائل کرنا بھی یاد نہ رہا اور نہ وادی کے عام حالات کی زیادہ خبر رہی۔ بیزید اس کا ہم عمر، متواضع آدمی تھا اس کا مہمان بن کر اس بات کی بھی فکر نہ ہوئی کہ قلعے اور بستی کے پل پر بایزید کا پہرہ ہے بجالیکہ بابر کے رفقا منڈی کے چوک یا بیرونی پڑاؤ میں الگ الگ مقیم ہیں اور خود وہ پہاڑی کے کنارے پر ٹکا ہوا ہے۔ غرض پھندا اس طرح لگایا تھا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

ادھر جب تنبل اندجان میں زچ ہوا تو اس نے ازبکوں کو مدد پر بلایا۔ چنانچہ شیبانی خاں سمرقند سے چل پڑا تھا۔ اس کی آمد کی خبر نے وادی کے حالات کا رنگ ایک دم بدل دیا، جیسے سیر بین کی تصویریں بدل جاتی ہیں۔ بابر تو دور جا چکا تھا۔ یہاں دونوں خانوں نے مغلی حفظ ماتقدم سے عاجلانہ کام لیا اور دریا دسیر اتر کے اخسی کے راستے جانے کی بجائے نیچے کے رخ خجند کے معبر سے پار ہو گئے۔ خان کو جیک بذات خود منصف مزاج، دین دار آدمی تھا لیکن اس کے قلعہ دار حسب عادت لوٹ مار کرتے رہے۔ اب جو مغل پسپا ہوئے تو غضب ناک باشندے مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مغلوں سے لوٹ کا مال اگلوایا۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی دانش مند ازبک نے تیموریوں اور مغول پر اس وقت تلوار اٹھائی جب کہ وہ باہمی نفاق و شقاق میں مبتلا تھے۔

بابر کو ازبکوں کی پیش قدمی کی خبر ملی تنبل کئی ہزار آدمی لے کر اخسی پر چل پڑا تھا اس کے بعد بھی چالاک بایزید نے ایک اور داؤ یہ کھیلا کہ بابر کے منحرف بھائی جہانگیر میرزا کو بھی جو اپنے کیے پر نادم تھا یہیں لے آیا۔ یہ ایک نئی اور بھاری ذمہ داری ہو گئی، عمر شیخ کے تینوں بیٹے اب پہاڑی قلعے کے گوشے میں جمع کر لیے گئے تھے۔ کسی جلاد کی تین ضربیں ان تینوں کا اور عمر شیخ کے نرینہ وارثوں کا خاتمہ کر سکتی تھیں، جیسے ان کے عم زادوں کا ہو چکا تھا ــــ مگر خود بابر کو خلاف توقع سے نہایت مسرت ہوئی۔

دو کھوجیوں کا موت کی تاک لگانا

"میں حمام میں تھا جب کہ جہانگیر مرزا تنبل کی حراست سے نکل کر آیا۔ میں باہر نکلا، اسے دیکھا اور گلے سے لگایا۔ بایزید بہت گھبرایا، حیران تھا کیا کرے کیا نہ کرے؟ جہانگیر اور اس کے ساتھی سردار ابراہیم بیگ چاپوق نے مشورہ دیا کہ بایزید کو پکڑ کر قلعے پر قبضہ کر لینا چاہیے اور سچ یہ ہے کہ عقل کا تقاضا یہی تھا۔ میں نے کہا میں اس کے ساتھ عہد کر چکا ہوں، عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ ہماری گفتگو کے وقت بایزید باہر حصار میں گیا ہوا تھا۔ ہمیں اس کے پل پر پہرہ دار مقرر کرنے لازم تھے مگر دیکھ بھال تک نہ تھی۔ یہ سنگین غلطیاں ہماری ناتجربہ کاری سے ہوئیں۔ پھر دم تنبل آیا اور دو تین ہزار پیدل مسلح لشکریوں کو لیے ہوئے پل اتر کر وہ بھی حصار (ارک) کے اندر آ گیا۔ میرے پاس شروع میں ہی تھوڑے سے آدمی تھے۔ انھی میں قیام ہوا تو کچھ سپاہی بیرونی اضلاع یا تھانوں میں بھیج دیے گئے۔ سو کے قریب میرے پاس رہ گئے تھے۔ ہم نے انہی کو سوار کرا کے مختلف کوچوں کے سروں پر متعین کیا اور جنگ کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ بایزید قنبر علی، نوجوان محمد دوست گھوڑے دوڑاتے ہوئے تنبل کے پاس سے صلح کا پیام لائے۔ میں نے پہرے کے جوانوں کو اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود ان لوگوں کو لیکر باپ کی قبر پر آیا گھوڑے سے اتر کے جہانگیر مرزا کو بھی بلوا لیا۔ شیخ بایزید اور قنبر علی پاس بیٹھے۔ دوست محمد حصار کو واپس چلا گیا۔ ہم مقبرے کے جنوبی کمانچے میں گفتگو کر رہے تھے۔ جہانگیر مرزا نے ضرور ابراہیم چاپوق سے مشورہ کر لیا ہوگا، اب میرے کان میں کہا کہ ان دونوں کو پکڑ لینا چاہیے۔ میں نے کہا جلدی نہ کرو۔ پکڑنے کا وقت گزر چکا ہے۔ بات سن لینی چاہیئے۔ شاید کوئی نتیجہ گفتگو سے نکل آئے۔ ہماری تعداد کم اور وہ بہت زیادہ ہیں۔ پھر وہ قلعے میں اور ہم اس کی بیرونی فصیل پر ہیں۔ شیخ بایزید اور قنبر علی اس دوران میں منتظر بیٹھے رہے۔ جہانگیر نے ابراہیم کو ارادے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ یا تو غلط سمجھا اور یا اس بہانے کہ غلط سمجھا تھا۔ بایزید کو لپٹ گیا۔ اچھا نہ کیا۔ ہمارے آدمی جھپٹ کر آئے اور بایزید و قنبر دونوں کو زمین پر گرا دیا۔ صلح کی بات چیت ختم ہوگئی۔ میں نے حکم دیا کہ ان دونوں کو حراست میں رکھا جائے اور لڑائی کے لیے گھوڑے پر سوار ہوا۔

بہت سی نے شہر کی ایک سمت پر جہانگیر کو متعین کیا۔ اس کے اپنے آدمی کم تھے اس لیے کچھ اپنے آدمی

بھی اس کو دیئے۔ پہلے اسی کا حصّہ دیکھنے گیا۔ پھر دوسرے محلوں کا معائنہ کیا۔ شہر کے وسط میں ایک مسطح کھلا میدان ہے۔ یہاں کچھ سپاہی متعین کیے اور آگے چلا۔ اتنے میں دشمن کے ایک بڑے گروہ سلطان پر ہجوم کیا اور دھکیل کر ایک تنگ گلی میں ہٹا دیا۔ اسی وقت میں پلٹ کر اُدھر گیا، اور اپنے مسلح جوانوں کو بڑھا کر دشمن کو وہاں سے نکالا۔ جس وقت ہم چوک خالی کرا رہے تھے، میرے گھوڑے کی ٹانگ میں تیر لگا۔ وہ اُچھلا اور اس طرح الف ہوا کہ میں عین میدان جنگ میں زمین پر گرا۔ اُٹھا تو میرے صاحب قدم رار دلی آکاہی نے اپنے مریل سے ٹٹو سے اُتر کر اُسے میرے سامنے پیش کیا۔ میں سوار ہوا۔ اپنے آدمیوں کی پورے چوک میں صف بندی کرائی اور دوسرے کوچے کی طرف گیا۔ سلطان محمد لاغری نے دیکھا کہ میں بہت مریل گھوڑے پر سوار ہوں، تو اپنا گھوڑا مجھے دے دیا۔ میں اس پر سوار ہوا ہی تھا کہ قاسم بیگ کا بیٹا زخم کھائے ہوئے آیا اور خبر دی کہ تھوڑی دیر قبل جہانگیر میرزا پر ایک بڑی جمعیت نے حملہ کیا اور وہ مضطرب ہو کے بھاگا شہر سے نکل گیا۔ میرے سُن کر حواس گم ہو گئے۔

اسی وقت سیّد قاسم جسے ایک دُور کے قلعے پاپ میں تعینات کیا تھا، قلعہ چھوڑ آیا۔ یہ اور نامناسب بات ہوئی کیونکہ اس نازک وقت میں بڑی ضرورت تھی کہ کہیں تو کوئی مضبوط قلعہ ہمارے ہاتھ میں رہے۔ میں نے ابراہیم بیگ سے کہا اب کیا کرنا چاہیے؟ اس کے زخم خفیف آیا تھا اس کی تکلیف کے باعث یا ہمت ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ کے رہ گیا۔ میرے دل میں آیا کہ لڑ کر پل پر سے رستہ نکالیں اور پار ہونے کے بعد پل توڑ دیں۔ ایک اور جبوُرٹ بابا شیرزاد[1] نے بڑے کام کی بات کہی کہ ہمیں سب سے قریبی دروازے سے لڑ کر نکل جانا چاہیے۔ میں نے یہ رائے قبول کی اور ہم دروازے کی طرف چل پڑے ہم ایک کوچے میں داخل ہوئے۔ عقب کی حفاظت سیّد قاسم اور ناصر دوست نے کی اور دشمن کے) باقی خیر سے خوب لڑے ابراہیم اور (بہ تصحیح مترجم) میرزا قلی کوکلتاش میرے ساتھ تھے۔ دروازۂ شہر پر پہنچے تو دیکھا اُدھر سے بایزید دگلا پہنے دو تین کو ساتھ لیے اندر آ رہا ہے۔ وہ صبح کو میری مرضی کے خلاف گرفتار کیے جانے کے بعد جہانگیر میرزا کی حراست میں تھا۔ میرزا اسے لے کر چلا تو بعض لوگوں نے بایزید کو قتل کرنا چاہا لیکن دوسروں نے اسے چھوڑ دیا۔ دروازے میں داخل ہو رہا تھا کہ میرا سامنا ہُوا۔ جو تیر میری شست

---

[1] مصنف نے اس نام کا بھی صرف انگریزی ترجمہ لکھ دینا پسند کیا تھا۔ یہاں اصل نام تزک سے نقل کیا گیا ہے۔ مترجم۔ [2] ایضاً۔ مترجم۔

میں دبا ہوا تھا، میں نے پورا کھینچ کر چلا دیا۔ نشانہ بہت اچھا تھا لیکن اس کی صرف گردن کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ وہ بدحواس ہو کر دائیں کو مڑا اور ایک گلی میں بھاگا۔ میں پیچھے چلا۔ کوکلتاش نے ایک پیادے پر بھاری لٹھ مار کر فرش کر دیا۔ وہ آگے چلا تو قریب ایک اور پیادے نے ابراہیم بیگ پر تیر کا نشانہ باندھا۔ ابراہیم نے "ہے ہے" کا نعرہ لگا کے اسے ڈرا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ تب اس پیادے نے اتنے قریب سے جتنی ڈیوڑھی کی سیڑھی ہوتی ہے، وہ تیر مجھ پر چلایا اور میری بغل میں لگا۔ میں قلماقی زرہ پہنے تھا، اس کے دو پترے کٹ گئے۔ وہ بھاگا۔ میں نے اس پر تیر چلایا۔ اسی لمحے فصیل پر ایک پیادہ بھاگا ہوا جا رہا تھا۔ میرے تیر نے اس کی ٹوپی کی چندیا چھید کر اسے کنگورے سے چپکا دیا۔ وہ کھلتی پگڑی کو سنبھالتا ہوا بھاگا چلا گیا۔ پھر ایک سوار بایزید کے پیچھے دوڑتا جا رہا تھا، میرے قریب سے گزرا۔ میں نے تلوار ماری۔ اس کی نوک گدی پر لگی وہ جھکا اور گلی کی دیوار سے ٹکرا کر بمشکل فرار ہوا۔ اس طرح ہم نے دشمن سے دروازہ خالی کرا لیا۔ وہیں جمع ہوئے لیکن صلاح مشورے کی گنجائش نہ تھی۔ ہم کوئی دو سو آدمی تھے اور حصار کے اندر دشمن کی تعداد دو ہزار سے کم نہ تھی۔ میرے آدھے آدمی جہانگیر کے ساتھ جا چکے تھے اور اسے گئے اتنی دیر ہو چکی تھی جتنی دیر میں دودھ میں ابال آتا ہے۔ پھر بھی میری ناتجربہ کاری دیکھیے کہ ایک ہرکارا اس کے عقب میں دوڑایا کہ اگر تم قریب ہو تو واپس آؤ۔ پھر مل کر حملہ کریں گے۔" حالانکہ اس کا وقت نکل چکا تھا۔ ابراہیم بیگ یا تو اس لیے کہ گھوڑا بہت تھک گیا تھا اور یا اپنے زخم کی تشویش کی وجہ سے کہنے لگا "میرا گھوڑا تو ختم ہوا۔" اس پر منبشر کے ایک ملازم نے بڑی ہمت کی کہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور اسے ابراہیم بیگ کو دے دیا۔ کسی نے اس سے کہا نہ تھا کہ یہ کرے۔ اوروں نے بھی اس وقفے میں کہ ہم دروازے پر استادہ تھے۔ دلیری دکھائی یہاں تک کہ جہانگیر میرزا کے لیے جو ہرکارا گیا تھا واپس آیا اور بتایا کہ دیر ہوئی وہ دور نکل چکا ہے۔

"اب ہم روانہ ہوئے۔ حقیقت میں اتنی دیر ٹھیرنا ہی غلط فیصلہ تھا۔ ہم چلے تو دشمن کے بہت سے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے پل کے سرے تک آ گئے۔ میرے جلو میں بیس تیس رفیقوں سے زیادہ نہ تھے ایک پہلو سے قاسم کے بیٹے نے ابراہیم بیگ کو آواز دی کہ اپنی سپہ گری کی بہت شیخیاں بگھارا کرتے ہو، آؤ میرے ساتھ چلو، یہ موقع تلوار کے ہاتھ دکھانے کا ہے۔" ابراہیم بیگ نے جواب دیا "کس نے منع کیا ہے تجھے، آ جا۔" یہ دیوانے اس ہزیمت کی حالت میں بھی اپنی دلاوری دکھانا چاہتے تھے۔ یہ مہلت آزمائی

کا کہ ہم سب کو چلنے میں دیر ہو، بھلا کیا وقت تھا؟ ہم نے باگیں اُٹھائیں۔ پوری رفتار سے گھوڑے چھوڑ دیے۔ مگر دشمن بھی دباتا چلا آتا تھا اور ایک ایک کرکے ہمارے سواروں کو آلیتا تھا۔

"اخسی سے دو میل کے اندر گنبدِ چمن ایک مقام ہے۔ اس سے گزر رہے تھے کہ ابراہیم بیگ نے مجھے مدد کے لیے پکارا۔ مڑ کر دیکھا تو بایزید کے ایک خانگی غلام سے وہ لڑ رہا تھا۔ باگ کھینچ کر پلٹنا چاہتا تھا کہ قلی خان نے جو پہلو میں تھا، باگ پکڑ لی اور کہا یہ وقت پلٹنے کا نہیں ہے اور مجھے تیز تیز بڑھاتے ہوئے لے چلا۔ اخسی سے چار میل مقام سنگ تک پہنچے۔ میرے اکثر ساتھی گر گئے۔ جا چکے تھے (اتفاقاً) یا لا پتہ ہو گئے، شمالی پہاڑوں کی سرحد کی طرف جا رہے تھے جہاں سے سنگ ندی نکلی تھی۔ اس کی بالائی گھاٹی پر پہنچ کر محفوظ ہو جاتے اور بائیں کو مڑ کر تاشقند کا راستہ پکڑ سکتے تھے۔ دونوں خان بھی تاشقند کو بھاگ رہے تھے) سنگ کے قریب کوئی پیچھا کرنے والا نظر نہ آیا تو ہم اس گاؤں کے قریب سے ندی کے کنارے کنارے چلنے لگے اب ہم کل آٹھ رہ گئے تھے۔ ناصر دوست، قاسم بیگ کا لڑکا۔ میرزا قلی کوکلتاش اور چار اور تھے۔ ندی کے علاوہ ایک بٹیا پہاڑیوں میں بل کھاتی شارع عام سے دور، چلی گئی تھی۔ اس پر چلتے رہے یہاں تک کہ ندی کو دائیں پر چھوڑا اور دوسرے راستے سے چل کر مسطح میدان میں آئے۔ عصر کے قریب کا وقت تھا۔ اتنے میں مجھے ایک طرف دور سیاہی سی نظر آئی۔ ساتھیوں کو آڑ میں کرکے میں بلندی پر چڑھا کہ دیکھوں کیا چیز ہے۔ یکایک ہمارے عقب کے راستے سے کچھ سوار ہم پر ٹوٹ کر گرے بغیر دیکھے کہ کتنے ہیں، ہم گھوڑوں پر چڑھ کر نکل گئے۔ حقیقت میں وہ بیس یا پچیس سوار تھے اور ہم آٹھ تھے کہ اگر پہلے ٹھیک معلوم ہو جاتا تو جم کر مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن ہم سمجھے ان کے عقب میں بڑی جمعیت ہو گی۔ دوڑے چلے گئے۔ سچ یہ ہے کہ بھاگنے والے زیادہ ہوں تو بھی کم تعداد پیچھا کرنے والوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مشہور ہے، ع

صفِ مغلوب را ہُوئے بسند است

(بہ تصحیح)، خان قلی نے کہا ہم اس طرح نہیں چل سکتے۔ سب کے سب پکڑے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ دو گھوڑے چن لیں اور آپ اور میرزا قلی کوکلتاش ایک، ایک گھوڑا کوتل لے کر تیز تیز نکل جائیں۔ شاید بچ جائیں۔ یہ اچھا مشورہ تھا۔ کیونکہ سب مل کر بھی مقابلہ تو کر نہ سکتے تھے۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ ہم دو ان سے بہت آگے نکل جائیں جیسا اس نے کہا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ دشمن کے راستے میں

دو کو پیدل کر جاؤں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ایک کر کے خود ہی گرتے چلے گئے۔

"میرا گھوڑا تھک چلا تھا۔ خان قلی اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اسے میرے حوالے کیا۔ میں اچھل کے اس کے گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ میرے گھوڑے پر۔ اسی وقت دشمن نے ہمارے دو اور آدمیوں کو جو پیچھے رہ گئے تھے گرا لیا۔ خان قلی بھی پیچھے چھوٹ گیا۔ اسے مدد دینے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ ہم جو باقی رہ گئے تھے جس قدر تیز ہو سکتا تھا گھوڑے دوڑاتے چلے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی مضمحل ہو گئے۔ ناصر دوست بیگ کا بھی گھوڑا تھک کر رک رہا۔ میرا گھوڑا بھی تھکنے لگا۔ قاسم بیگ کے بیٹے نے اپنا گھوڑا مجھے دیا، میرے پر خود سوار ہو گیا۔ خواجہ حسینی لنگڑا تھا اس نے ٹیکروں کا رخ کیا۔ اب میں اور میرزا کوکلتاش رہ گئے اور ہمارے گھوڑے بھی سرپٹ نہ دوڑ سکتے تھے۔ پوربیا ہو گئے اور اس کا اور بھی سست چلنے لگا۔ میں نے اس سے کہا "تجھ سے الگ ہو کر کہاں جا سکتا ہوں۔ ہمارا مرنا جینا ساتھ ہو گا، جیسا بھی ہو۔ چلا آ۔" میں اسے مڑ مڑ کے دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کہا "میرے گھوڑے میں دم نہیں رہا۔ تم میرے ساتھ رکو گے تو خود بھی نہیں بچ سکتے۔ بہتر ہے کہ بڑھے جاؤ۔ شاید سلامت رہ جاؤ۔" میری عجیب حالت ہوئی آخر وہ بھی پیچھے چھوٹا اور میں تنہا رہ گیا۔

دشمن کے بھی اب دو ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ ایک (بہ تصحیح مترجم) بابائے سیرامی، دوسرا بندہ علی۔ میرے گھوڑے کے مضمحل ہونے سے وہ نزدیک تر آ رہے تھے۔ پہاڑ ابھی کوس بھر دور تھا۔ سامنے ہی چٹانوں کا ایک ٹیکرا نظر پڑا۔ میں نے سوچا گھوڑا تھک چکا ہے، پہاڑ ابھی فاصلے پر ہے، اب کیا کیا جائے؟ میرے ترکش میں کم سے کم بیس تیر تھے۔ خیال آیا اس ٹیکرے پر اتر جاؤں اور یہاں سے جب تک تیر باقی ہیں مقابلہ کروں۔ پھر سوچا کہ پہاڑوں تک پہنچ گیا تو گھوڑا چھوڑ کر تیر کمر بند میں لیے ہوئے اوپر چڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے چڑھنے کی قوت پر بھروسہ تھا۔ اسی خیال سے آگے بڑھے گیا۔

اب گھوڑا دلکی بھی نہ چل سکتا تھا اور پیچھا کرنے والے دونوں سوار تیر کے پرتاب پر آ گئے تھے۔ میں تیر بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ ان پر نہیں چلایا اور وہ دونوں بھی احتیاطاً دور دور ہی سے پیچھا کرتے رہے۔ سورج غروب ہونے میں پہاڑ کے قریب آ گیا۔ یکایک انھوں نے پکار کر کہا "اس طرح تم کہاں جاؤ گے؟ جہانگیر میرزا کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں، ناصر میرزا بھی قید میں ہے۔" یہ کلمات سن کر مجھے سخت پریشانی ہوئی اور سمجھا کہ اگر ہم تینوں پکڑے گئے تو یہ نہایت خطرناک بات ہو گی۔ میں نے جواب نہ دیا اور پہاڑ کے پہلو پر چلتا رہا۔

خاصی دُور چلنے کے بعد انھوں نے پھر آواز دی اور اس مرتبہ گھوڑوں سے اتر کے ذرا ادب سے بات کی۔ میں نے کوئی توجہ نہ کی اور ایک نالے میں گھس کر اوپر چڑھنے لگا۔ عشا کی نماز کے وقت ایک بڑی چٹان ملی جو خاصے مکان کے برابر تھی۔ اس کے عقب میں ایسے پیچ نکلے ہوئے تھے کہ گھوڑا ان پر نہ چل سکتا تھا۔ اب ان پیچھا کرنے والوں نے گھوڑوں سے اُتر کر پھر زیادہ خادمانہ ادب کے ساتھ مجھ سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا "اس اندھیرے میں، بغیر راستے کے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور منشا کیا ہے؟ احمد تغلق آپ کو ج کے تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔" انھوں نے قسم کھائی کہ یہ سچی بات ہے۔ میں نے کہا "مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ میں ان کے پاس نہیں جا سکتا۔ اگر تم واقعی میری کوئی خدمت کرنی چاہتے ہو تو ایسا موقع سالہا سال تک نہیں ملے گا۔ تم مجھے وہ راستہ بتا دو جس سے میں خالوں کے پاس جا سکوں۔ اگر تم ایسا کر دو گے تو میں تمھاری خواہش سے بڑھ کر سلوک کروں گا۔ لیکن یہ نہ کر سکو تو پھر جدھر سے آئے ہو، اُدھر ہی واپس چلے جاؤ۔ یہی اس وقت میری خدمت ہوگی۔" انھوں نے کہا "کاش کہ خدا ہمیں یہاں نہ لاتا مگر جب آ گئے ہیں تو آپ کو ایسی جگہ تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو جہاں آپ جائیں، ساتھ چلیں گے۔" میں نے کہا "قسم کھاؤ کہ سچ کہتے ہو۔" انھوں نے حلفیہ عہد کیا اور مجھے بھی قدرے اعتبار آیا۔ میں نے کہا "اس نالے کے قریب مجھے بڑا راستہ بتایا گیا تھا مجھے اس پر لے چلو۔" ان کے حلف کرنے کے باوجود میں نے ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا بلکہ انھیں آگے رکھا اور خود پیچھے چلا۔ کئی میل چل کر ایک پہاڑی ندی کی گزرگاہ ملی۔ میں نے کہا "میدان کا رستہ یہ نہیں ہو سکتا۔"

وہ ذرا ہچکچائے۔ پھر ہٹ کر بولے "وہ آپ کی شاہراہ تو بہت دور پڑے گی۔" حالانکہ ہم اس راستے پر فی الواقع پہنچ گئے تھے۔ مگر انھوں نے مجھ سے اصل بات چھپائی اور ہم پھر آدھی رات تک چلتے رہے۔ ایک اور ندی آئی تب وہ کہنے لگے "ادھو! ہم سے غلطی ہوئی۔ میدان کو جانے کا راستہ پیچھے چھوٹ گیا۔" میں نے کہا "پھر اب کیا کرو گے؟" کہنے لگے "غوا کا راستہ ذرا آگے ہے، اس سے چل کر ہم فرکت پہنچ سکتے ہیں۔"

چنانچہ پھر چلتے رہے اور تین پہر رات گزر چکی تھی جب [illegible] ان کے نالے پر جو غوا سے آتا ہے پہنچے تو ایک آدمی نے کہا "آپ یہاں ٹھیریں، میں غوا کی پگڈنڈی کا پتا لگا کر آتا ہوں۔" پھر تھوڑی دیر میں واپس آ کر کہنے لگا "مجھے اس راستے سے کئی آدمی جاتے نظر آئے۔ آگے والا سلّی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

اس راستے ہم نہیں جا سکتے۔" یہ بات سن کر میں بہت گھبرایا۔ صبح قریب تھی اور ہم ابھی مطلوبہ سڑک سے بہت دور کھیتوں ہی میں تھے۔ میں نے کہا "دن کو چھپے رہنے کی کوئی جگہ مجھے بتا دو۔ رات کو گھوڑوں کے دانہ چارہ کھلانے کے بعد خجند کے گھاٹ کی طرف لے چلنا وہاں سے دریا اتر کر ہم دوسرے کنارے پر خجند پہنچ جائیں گے۔" ان میں سے ایک نے کہا "پہاڑی کے ادھر جانب چھپنے کی جگہ مل سکتی ہے۔"

بندہ علی کرنان میں داروغہ (کوتوال کا) داروغہ تھا۔ کہنے لگا "خود کچھ کھائے اور گھوڑوں کو کھلائے بغیر تو ہم سفر کر نہیں سکتے۔ میں کرنان جا کر دیکھتا ہوں کہ کھانے کی کیا چیز مل سکتی ہے۔" غرض ہم پھر چلتے رہے اور کرنان سے کوئی ایک کوس کے فاصلے پر ٹھیرے۔ بندہ علی ہمیں چھوڑ کر کرنان گیا اور بڑی دیر میں صبح ہوتے ہوتے جلدی جلدی تین نان لے کر آیا۔ مگر گھوڑوں کے لیے کچھ نہ لایا۔ ہم ایک کرشکر پر چڑھے ہر ایک نے ایک ایک روٹی جیب میں دبائی۔ گھوڑوں کو پانی کے گڑھوں کے قریب باندھ دیا اور خود اوپر الگ ہو بیٹھے کہ ایک دوسرے کو دیکھتا رہے۔

قریب دوپہر احمد قوشچی (باز شکاری) غوا کی راہ پر تین اور آدمیوں کے ساتھ اخسی کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ خیال آیا اُسے آواز دے کر بلاؤں اور وعدے وعید کر کے اپنے گھوڑے اسے دے دوں جو دن رات چل کر تھک گئے تھے اور دانہ چارہ نہ ملنے سے بالکل بے دم ہو رہے تھے۔ اور ان کے عوض میں اس سے گھوڑے مانگ لوں۔ مگر پھر مذبذب ہو گیا اور اس پر مع ہمراہیوں کے اعتماد نہ جما۔ البتہ ہم نے آپس میں رائے قائم کی کہ یہ سوار ضرور کرمان میں رات بسر کریں گے۔ اس وقت ہم اندھیرے میں جا کر ان کے گھوڑے نکال لا سکتے ہیں۔

دوپہر کو گھوڑے پر ایک چمکتی چیز دور سے جاتی ہوئی نظر آئی۔ پہلے تو ہم سمجھ نہ سکے لیکن پھر دیکھا کہ وہ (بہ نقیب) محمد باقر بیگ تھا۔ وہ اخسی میں میرے پاس رہا اور ہمارے شہر چھوڑنے پر جو افراتفری مچی اس میں بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا اور کہیں چھپ جانے کی فکر میں تھا۔ [یہ بات بابر کو بعد میں معلوم ہوئی ہو گی۔ وقت کے وقت تو وہ اپنے دو ساتھیوں اور کھوج لگانے والوں کی وجہ سے خلجان میں پڑا ہوا تھا]

"بندہ علی اور بابا سیرامی نے کہا "دو دن سے گھوڑوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نیچے وادی میں چل کر انھیں چرنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے۔" چنانچہ ہم سوار ہو کر نیچے آ گئے اور گھوڑوں کو چرنے چھوڑ

دیا۔ نمازِ عصر کے قریب ایک سوار اسی ٹیکرے کے نیچے سے گزرتا نظر آیا، جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ غوا کا کھیا قادر بردی ہے۔ میں نے کہا، اسے آواز دو۔ اور ہماری آواز سن کر وہ نیچے ہمارے پاس آگیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی وغیرہ سے تا امکان استمالت کر کے میں نے کہا ہمیں ایک رسّی، درانتی، کلہاڑی، دریا سے اترنے کا کوئی سامان مہیا کر دو اور ہمارے گھوڑوں کے لیے خوراک اور ممکن ہو تو ایک تازہ دم گھوڑا لا دو۔ قرار پایا کہ نمازِ عشا کے وقت تک یہ سب چیزیں اسی جگہ ہمیں مل جائیں۔

مغرب کے بعد ہمیں ایک سوار کرنان سے غوا کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں نے آواز دی کون ہے؟ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ اصل میں وہی بافر بیگ تھا جو دوپہر کو نظر آیا تھا اور اب اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑ کر، رات ہونے پر کسی اور جگہ جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آواز ایسی بنائی کہ گو برسوں میرے پاس رہا تھا، میں بالکل نہ پہچان سکا۔ ورنہ اسے روک کر اپنے ساتھ لے لیتا۔ اب تو اس کا ادھر سے گزرنا دیکھ کر الٹی پریشانی پیدا ہوئی۔ میرے دونوں ساتھی قادر بردی کی طرف سے بھی بدگمان ہوئے۔ بندہ علی نے کہا، کرنان کی نواح میں کئی غیر آباد باغ ہیں ہمیں وہاں جا کر قادر بردی کو اطلاع دینی چاہیے کہ اسی جگہ ہم سے آملے۔ یہی قصد کر کے ہم سوار ہو کر کرنان کے نواح تک آئے۔ سردی کا موسم اور بڑی سردی ہو رہی تھی۔ بھیڑ کی کھال کی ایک پرانی پوستین جس کے اندر اونی استر تھا، وہ میرے لیے کہیں سے لے آئے اور میں نے اسے پہن لیا۔ ارزن (جوار یا باجرہ) کے آٹے کی پکائی ہوئی آش کا ایک پیالہ بھی مجھے لا کر پلایا جس سے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے پوچھا: "تم نے قادر بردی کے پاس کسی کو بھیجا؟" بندہ علی نے جواب میں یقین دلایا کہ آدمی بھیجا ہے۔ حالانکہ ان نمک حرام گنواروں نے تنبل کے پاس انھی قاصد بھیجا تھا۔

ایک پختہ مکان ملا جس میں اندر جا کر ہم نے آگ جلائی، میں تھوڑی دیر سو دیا۔ یہ مردک خیر خواہی دکھانے کے بہانے کہنے لگے "جب تک قادر بردی کا جواب نہ آئے ہمیں یہاں سے کہیں جانا نہ چاہیے لیکن یہ مکان نئی مکانوں کے بیچ ہے ... کے باغ ... اگر ہم ان میں چلے جائیں تو کوئی شبہ تک نہ کرے گا۔" ... آدھی رات کے ... ہم سوار ہو کر باہر ایک باغ ... گئے۔ ... چھت پر بیٹھ کر نگہبانی کرتا رہا۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب وہ کوٹھے سے اُتر کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا "یوسف داروغہ آ رہا ہے۔" مجھے بہت تشویش ہوئی۔ میں نے کہا، معلوم کرو کیا وہ میرے یہاں ہونے کی خبر پا کر آ رہا ہے؟ بابا گیا اور کچھ دیر باتیں کر کے واپس آیا اور کہا "یوسف داروغہ کہتا ہے کہ ایک پیادہ سپاہی نے اخسی کے دروازے پر مجھے خبر دی کہ بادشاہ کرنان میں اسی جگہ موجود ہے۔ میں نے کسی اور سے یہ بات نہیں کہی بلکہ خود اس پیادے کو ولی خزانچی کی حراست میں دے آیا ہوں۔ یہ ولی اخسی کی جنگ میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پھر میں سیدھا یہاں گھوڑے پر چلا آیا ہوں۔ اخسی کے حکام کو کچھ خبر نہیں ہے۔

میں نے پوچھا "تو تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے کہا "وہ سب آپ کے نوکر ہیں آپ کو ان کے پاس جانا مناسب ہے۔ وہ سوائے اس کے کہ آپ کو بادشاہ بنائیں اور کیا کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا، "انھوں نے تو بغاوت کی۔ مجھ سے لڑتے رہے۔ اب میں کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں؟"

میری بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خود یوسف آ گیا اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل گر کے پکارا: "میں سچی بات آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔ تنبل کو تو آپ کے یہاں ہونے کی خبر نہیں، مگر بایزید آگاہ ہو گیا ہے اور اسی نے مجھے بھیجا ہے۔" یہ سن کر عجب اضطراب مجھے ہوا۔ خوفِ جان سے بدتر کوئی شے دنیا میں نہیں۔ میں نے کہا، "ٹھیک ٹھیک بات کہہ دے اگر اور بُری صورت پیش آنے والی ہے تو میں باوضو ہو جاؤں؟" یوسف قسمیں کھاتا رہا کہ جو کچھ کہا صحیح ہے۔ لیکن میں نے مطلق اعتنا نہ کی۔ جانتا تھا کہ میری حالت کیسی نازک ہے۔ اُٹھ کر باغ کے ایک گوشے میں گیا اور سوچنے لگا کہ آدمی سو برس چھوڑ ہزار سال زندہ رہے تو بھی انجام کار ...."

اس مقام پر فرغانہ کے مفرور بادشاہ بابر کی داستان ناگہاں منقطع ہو گئی ہے اور پھر کہیں دو سال بعد کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اوراق یا تو اس کی آوارہ گردی کے زمانے میں کسی پانی کی طغیانی میں یا آئے دن کی برق وش بھاگ دوڑ میں ضائع ہوئے اور یا ممکن ہے بھول کر کسی اور صندوق میں حفاظت کی غرض سے رکھے گئے اور پھر یاد نہ رہے۔

بہر حال عجیب موقع پر سلسلہ ٹوٹتا ہے۔ اصل ترکی سے فارسی ترجمے کے کاتب نے حاشیے پر بخطِ شکستہ یہ الفاظ لکھ دیے ہیں:

"سال کے باقی ماندہ واقعات ـــ خدا کرے کہ وہ ہاتھ آ جائیں۔"

ترکی متن کے ایک اور کاتب نے بابر کو مذکورہ بالا یاس انگیز حالت سے نکالنے میں نعبا ہر خود طبع آزمائی کی۔ اس کی روایت کی رو سے جب بابر نے یقین کر لیا کہ موت آگئی ہے تو ندی میں جا کر شرعی غسل کیا۔ نماز پڑھی پھر ذرا دیر کو سو گیا تو خواب میں دیکھا آقا سے قدسیاں آئے اور انھوں نے اسے نجات دلائی۔ یہ دیکھ کر تازہ قوت آئی اور اس نے نیزہ اٹھا بازوں کو جو اسے گھیرے ہوئے تھے روکے رکھا۔ اتنے میں گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو اس کے دو جاں نثار عسکری باغ کی دیوار توڑ کر آپہنچے۔ اس لیے کہ انھوں نے بھی اندجان میں جہاں بابر کے دونوں ماموں تھے خواب میں دیکھا تھا کہ اس نیمے بابر پادشاہ کرزان نام کے گاؤں میں ہے۔" اس طرح کی بروقت نجات پانے کا یہ قصہ الف لیلہ کے قصوں سے ملتا جلتا ہے اور اسی قدر یقین کے لائق ہے۔ دونوں ماموں بھی محض تھم کی ہیں۔ بابر کے خان ماموں اندجان میں نہ تھے اور نہ اب اپنی سلامتی کے لیے وہ اس شہر کا رُخ کر سکتا تھا پھر اس واقعے کے کئی برس سال گزرنے تک اس نے پادشاہ کا لقب بھی نہیں اختیار کیا تھا۔ مزید براں بابر نے گوشۂ باغ میں غور و فکر کی غرض سے جانے تک جو کیفیت لکھی ہے اس میں اپنے نمک حرام رفیقوں سے مُشت مُشت کرنے کی کسی کوشش کا ذکر نہیں آتا اور نہ وہ ایسے شخص کو قتل کرنے کا خطرہ مول لیتے جو بادشاہ تھا اور زندہ رہنے کی صورت میں انھیں دولتِ کثیر انعام میں ملنے کی توقع تھی۔ انگریز مترجم فاضل بیوریج نے یہ بھی جتایا ہے کہ ہرچند الحاقی عبارت ترکی زبان میں ہے لیکن ایسے شخص کی نہیں ہے جو بابر کی طرح سوچتا بھی ہو ترکی زبان میں۔ دوسرے وہ دو مفروضہ بچانے والے جو عین وقت پر آگئے تھے، ان کا اس کی مستند تحریر میں کہیں نام نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ پھر بابر اس دن باغ سے کس طرح بچ کر نکلا۔ وہ آیندہ اوراق میں اس واقعے کا دوبارہ کہیں ذکر نہیں کرتا۔ ان دو سالہ مصائب میں وہ کوئی چھ مرتبہ اسی طرح گھرا، لہٰذا یہ موقع غیر معمولی نہیں تھا۔ بایں ہمہ اس زمانے کے آخری ایام کی جو کیفیت لکھی ہے، اس میں بعض اشارے مل سکتے ہیں۔ یاد ہوگا کہ تین دن دوران میں وہ صرف تھوڑی دیر کے لیے، وہ بھی بے اختیار ہو سو سکا تھا۔ ان واقعات کو اس نے صدیرِ بابا سیرامی اور بندہ علی کو پوری طرح قابو میں آجانے کے کچھ دیر بعد ہی تحریر کیا ہوگا۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ محمد باقر بیگ (اس کا مخلص دوست جو چھپتا پھرتا تھا اور خود بابر کے گھیرنے والے اس سے بچنا چاہتے تھے) وہ بہت جلد اس سے آملا تھا۔

علاوہ ازیں حقیقت میں بابر امداد سے بالکل محروم نہیں ہو گیا تھا، جیسا کہ اس نے کمال اضمحلال کی حالت میں خیال کیا۔ قریبی بابا اور بندہ علی نے جو اُسے یقین دلایا کہ جہانگیر میرزا بھی پکڑا جا چکا ہے، یہ جھوٹی بات تھی۔ جہانگیر بابر کی باقی ماندہ جمعیت کے ساتھ سیر دریا کے دوسری جانب اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ خان ماموؤں کا تنگی لشکر قریب ہی سرحدی پہاڑیوں پر چڑھ رہا تھا اور مغول خانہ بدوشوں سے کچھ بعید تھا کہ ان کی ٹولیاں بلا اطلاع دیہات میں گشت لگاتی پھریں۔ فی الواقع ان کے بعض گروہ اخسی کے آس پاس اسی زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ بابر کے کرزان کے باغ میں چھپنے کی خبر ضرور دریا کے کنارے تک پھیل گئی ہوگی۔

بہرحال وہ بہت جلد چھٹکارا پا کے باقر بیگ کے ہمراہ تاشقند کے رُخ چل پڑا تھا۔ یہاں دونوں سے ملاقی ہوا جو شیبانی کے مقابلے میں مغلوں کے آخری دفعہ جم کر لڑنے کی تیاری کر رہے تھے اور اخسی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ اگرچہ وہ میدان میں آنے سے بچتے رہے لیکن آخرکار سخت معرکہ پڑا، جس نے فرغانہ اور بابر کے مستقبل کا بھی (جون ۱۵۰۳ میں) فیصلہ کر دیا۔

یہ شیبانی خاں کا کام تھا۔ دوسرے ماخذ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے ازبک جنوب میں کوہستان سیاہ کے ان شہروں کو ٹٹول رہے تھے جن پر جابہ طلب خسرو شاہ کا عمل دخل تھا، کہ اندجان سے تنبل نے انھیں مدد کے لیے بلایا۔ شیبانی نے فوراً لبیک کہی لیکن وہ سمرقند ہوتا ہُوا آیا کہ فرغانہ کے اُلجھے ہوئے معاملات کا پہلے سے اندازہ کر لے۔ کچھ عرصہ بعد ہم اسے خجند میں جہانگیر میرزا کے مختصر لشکر کو گھیرے میں لیتے دیکھتے ہیں۔ اس میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہ آئی۔ البتہ خانوں کی فوجی تیاریاں اور اخسی کے اوپر پہاڑیوں پر قبضہ سن کر اس نے تامل کیا (بابر بھی اس وقت ماموؤں سے آملا تھا) پھر یکایک بھیڑیے کا سا کاوہ کاٹ کے وہ انھیں ایک طرف چھوڑ کر غیر محفوظ تاشقند میں جا پڑا۔ شاہی بیگمات کو گرفتار کر لیا اُنہی میں بابر کی ماں کہ پہلے ہی بہت تکلیفیں جھیل چکی تھی، اور خانوں کی ماں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد اُزبک سپہ سالار سرعت سے مشرق کی طرف مڑا اور کم تعداد مغل فوجوں کو صف بندی کی بھی مہلت نہ دی، بلکہ بلا مبالغہ گردِ راہ کے ذرّوں کی طرح انھیں پراگندہ کر دیا۔ بڑا خان اس معرکے میں اسیر کر لیا گیا۔ چھوٹے نے کسی طرح بچ کر بالآخر اپنے ملک کی راہ لی، جہاں سے دراصل اسے آنا ہی ناسازگار رہا تھا۔ پھر وہ اسی رنج میں جان سے گزر گیا۔ اس ہزیمت آفرین جنگ میں ایک دستہ بابر کے ماتحت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ

اتوا "ارض مغول" کی طرف چلا تھا لیکن تھوڑی مدت بعد ہی ہم اسے وادیٔ فرغانہ سے گزرتے دیکھتے ہیں۔

شیبانی کو اپنی قوتِ قاہرہ کے ساتھ رحم و کرم کے کرشمے بھی دنیا کو دکھانے کا شوق تھا۔ محمود خاں کو اسی غرض سے سلامت رہنے دیا تھا۔ چنانچہ اس کے مداح نظم "شیبانی نامہ" کے مصنف کے قول کے مطابق اس نے مغل خان سے کہا کہ "میں نے تمھیں گرفتار کیا لیکن قتل نہیں کروں گا۔ میری جوانی کے زمانے میں تم نے ایک بار میری مدد کی تھی۔ میں بھی تم کو رہا کر دوں گا۔" لیکن کہاں جانے کے لیے؟ شیبانی کے سوار پیچھے کھچے مغل قبائل کو مشرق میں بہت دور، تھیان شان کے دروں تک، خاقانِ چین کی سرحدی چوکیوں کے سامنے تک دھکیل چکے تھے۔ ان دیدبانی کے چینی برجوں اور بخارا کے مزارات و مقابر کے درمیان تمام راستوں پر اب ازبکوں کی عملداری تھی۔ کچھ مدت تک جس کا صحیح تعین نہیں ہو سکا، محمود خاں صحرائی راستوں پر ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس کا سارا غرور خاک میں مل چکا تھا اسی حال میں اسیر ماں کے نام ایک "نفیس خط" تاشقند لکھ کر بھیجا۔ وہی تاشقند، جہاں علیش و حکومت کے لطف اٹھائے تھے۔ پھر کچھ ایسے سامان ہوئے کہ ویران صحرا چھوڑ کر خجند آنے کی ترغیب ہوئی۔ مگر یہاں اس کے پہرہ داروں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ سب بیٹے بھی ہلاک کر دیے گئے۔ ان میں وہ بڑا بیٹا بھی قتل ہوا جو مغل جھنڈوں کی سلامی کی رسم ادا ہوتے وقت بابر کے ساتھ سفید فرش پر الیستادہ تھا۔ شیبانی اُن کے قتل کے وقت موجود نہیں تھا لیکن یہ خبر سن کر کچھ کہا تو یہ کہ دشمن کو دوسری بار زندہ چھوڑنا بیوقوفی کا کام ہے۔ حقیقت میں اس نے جدید مقبوضات میں حکمران طبقے یا مرتبے کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑا۔ تنبل نے اخسی یا ارشیان کی جنگ میں شیبانی کو تھوڑی کمک فوج بھیجی تھی لیکن اس کا بھی بہت جلد چکلے سے اور گویا بالا ہی بالا کام تمام کر دیا گیا۔

اب سارا فرغانہ بلکہ دریا پار تک کا علاقہ بلا شرکت شیبانی کے زیر نگیں تھا۔ اس نے اپنی خانہ بدوش قوم کی ایک سلطنت قائم کر لی تھی اور نیم ویران سمرقند میں امیر تیمور کے تخت پر خود متمکن ہو گیا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے سلسلے میں بڑے بڑے تیموری خاندان کے افراد کا بری طرح استیصال کر دیا تھا۔ اس کے تعلق کے ساتھ ملک میں حضرت کی بجائے بدعت بڑے پیمانے پر زراعت [illegible] اور فنون تعلیم و تعلم کی بجائے ازبک سپہ سالاروں کی عسکری خدمات کو فروغ حاصل ہوا تھا۔

شیبانی نے آئندہ جہانگیر میرزا کی کچھ فکر نہ کی جس کا کردار کم زور، اور جمعیت پراگندہ ہو چکی تھی۔ البتہ سبک پا بابر اور خواجہ ابوالمکارم کی تلاش و تعاقب کا حکم دیا۔ علی دوست کا ایک بیٹا زندہ رہ گیا تھا۔ اسے ازبکوں کے کھوجی پہلے ہی پکڑ وا چکے تھے، خواجہ بیکار بیٹھنے والا نہ تھا۔ تاشقند کے قید خانے سے نکل بھاگا بھیس بدلا، حتیٰ کہ ڈاڑھی تک منڈوا دی تھی لیکن ضعیفی کے باعث زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ ایک مخبر نے دغا دی شیبانی سے اس مرد بزرگ کا سامنا ہوا تو اس نے پوچھا آپ کی ڈاڑھی کیا ہوئی؟ فاضل خواجہ نے جواب میں فارسی شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ

"خدا نے اگر چراغ جلایا تو جو اس کو پھونک مار کر بجھائے گا

وہ اپنی ڈاڑھی کو آگ لگائے گا۔"

بابر بچ کر نکل گیا اگرچہ بڑی مشقت اُٹھانی پڑی۔ بظاہران پہاڑی پگ ڈنڈیوں سے گیا جنھیں خوب جانتا تھا۔ ایک بار پہاڑ کے درے سے مارا مار نکلتا ہوا دیکھا گیا جسے تھوڑی ہی دیر میں برف نے بند کر دیا۔ ایک مدت بعد لکھتا ہے کہ میں نے قریب قریب ایک سال پہاڑیوں میں بڑی تکلیف سے گزارا۔

حیرت ہے کہ شیبانی خاں نے عورتوں کے بندی خانے سے جہاں بابر کی بارُعب نانی ایسن (ایسان) دولت بیگم مرض الموت میں پڑی تھی، بابر کی ماں کو آزاد کر دیا۔ ازبک کمینہ فطرت نہ تھا۔ بلکہ خواتین کے معاملے میں خاصی عالی ظرفی دکھاتا تھا۔ علی بیگ کی ماں، بابر کی بہن خانزادہ اور محمود خان کی ایک بیوی کو نکاح میں لا چکا۔ کیا اسے امید تھی کہ بیمار ماں بابر کے ساتھ ہوئی تو اسے ڈھونڈنے میں جس کی ہلاکت کا خاص طور پر خواہاں تھا آسانی ہو جائے گی؟ اور یا خانزادہ بیگم نے کہہ سُن کر اپنی ماں کو رہائی دلوائی؟ اس سوال کا جواب تزک بابری کے گم شدہ اوراق کے ساتھ گم ہو گیا۔

زیر نظر سال میں آل تیمور کی اپنی قدیم سلطنت میں خانہ جنگی اور فتح و شکست کے واقعات پر پردہ پڑ گیا تھا۔ عمر شیخ اور اس کے بھائی بھتیجوں کا پُرآشوب گرما گرم دور ختم ہو سمرقند پر ازبک قبضہ رہا تھا۔ چند سال میں کچھ اور متروک ہونے پر محض قصّہ ماضی بن جانے والا تھا۔ جون ۱۵۰۲ء میں جب سورج بُرج سرطان میں داخل ہوا ہمارے شیر نے از خود اور تنہا ایک ارادہ کیا۔ اس وقت وہ کوہستان سفید کے قبائل اِیماق میں تھا۔ اس کی ماں اور باقی ماندہ

ما کے اہل و عیال بھی ساتھ تھے۔ یہ اس کے وطن مالوف کی جنوبی سرحد تھی؛ "پھر میرے دل میں آئی کہ فرغانہ کو خیر باد کہنا چاہیئے جس ملک میں پاؤں لٹکانے کی جگہ نہ ہو اسے چھوڑ کر کہیں بھی چلے جانا بہتر ہوگا"۔

یہ فیصلہ یقیناً بہت گراں گزرا ہوگا۔ دس برس تک برابر سخت جدّ و جہد کرتا رہا کہ آبائی علاقے میں کہیں ٹھکانا میسر آ جائے۔ ان سنین میں بار بار "بے ملک، میری رعایا" کے الفاظ زبان پر آتے رہے۔ یہ تصوّرات دل میں جمے ہوئے اور محو ہونے والے نہ تھے۔ لیکن اب پہلی دفعہ اس نے اپنی وادی، سیر دریا، قدیم دارالسلطنت سمرقند سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ اس کے مختصر ارادہ میں جو خاندان یا ان کے نام لیوا باقی رہ گئے تھے، ان کے لیے کہیں نہ کہیں کوئی ملجا و ماویٰ تلاش کیے بغیر نہ رہے گا، اس طرح عزم ارادہ کر لینا بابر کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ پھر اسے کوئی چیز متغیر یا متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ اس استقامت کے ساتھ اقتدار طلبی کا نادر جذبہ بھی وہ شامل کر لیتا تھا۔ اس کے ذہن میں نئی سرزمین بعید کوہستانوں میں صرف پناہ گاہ ہی نہ ہوگی۔۔ چنانچہ ایک ایسے مقام پر وہ اپنی مہاجرت کے دوران میں بغیر ٹھہرے جلد آگے بڑھ گیا۔۔ بلکہ وہاں بھی کوئی دریا، کوئی شہر ایسا ہوگا جس کے گرد سمرقند جیسے باغ تیار کیے جا سکیں گے۔

پچیس برس بعد اس نے حکومت کرنے کے لیے ایسا ملک پا لیا جہاں اس کے سب متوسلین کے اہل و عیال کو بھی پناہ مل گئی اور شہر بنانے کا بھی آغاز کر دیا اگرچہ وہ ایسی جگہ تھی جہاں اسے تعمیر کا کوئی خیال نہ تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس وقت اس نے ملک چھوڑ کر بے نوا ہو جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت وہ اس کے حق میں پلٹ گئی۔ دراصل میں بابر کو خدا ہی نے طالع آزما بنایا تھا۔

باب سوم

کابل کی بادشاہی

دریائے زخار کے پار

"فرغانہ سے نکل کے ہم ولایت حصار کی گرمائی چراگاہوں میں داخل ہوئے۔ یہاں میری عمر ۲۳ سال کی ہوئی اور میں نے پہلی مرتبہ ڈاڑھی استرے سے منڈوائی۔ وہ لوگ جو ابھی تک مجھ سے امید رکھتے تھے، چھوٹے بڑے دو سو سے زیادہ تین سو سے کم تھے۔ ان میں زیادہ تر بے سواری کے پیدل، چمڑے کے موزے پہنے، لاٹھیاں ہاتھ میں، بھیڑ کی کھال کے کوٹ شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ ہماری بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ ہمارے پاس صرف دو خیمے تھے۔ اپنا خیمہ میں نے والدہ کو دے دیا تھا۔ دوسرا جس کی چوبوں پر کمل باندھ لیے تھے، رات کو میرے واسطے نصب کر دیا جاتا تھا۔"

بابر وطن چھوڑ کر مقررہ راستے ہی سے جا رہا تھا، یعنی پہاڑی پٹیوں سے جو خانہ بدوش ایماق قبائل کے پڑاووں سے گزرتی تھیں اور وہ رات کے وقت اپنے معزز مگر بے نوا مہمانوں کو کھانا لا دیتے تھے۔ وہی اگلی منزل تک جہاں کوئی پہاڑی ندی بل کھاتی گزرتی، پہنچانے کی غرض سے رہنما ساتھ کر دیتے تھے۔ اندواہ کے کوہستانی غاصبانہ تاردل نے بابر کا نام اور زوال کا قصہ ایماق قبائل میں پہلے سے پہنچا دیا تھا۔ وہ رات کے وقت اس کے دو خیموں کے لیے پاسبان مقرر کر دیتے تھے کیونکہ یہ قبائلی عزت کا معاملہ تھا کہ ان کے یک شبہ مہمانوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ وہی بابر کو پیچھے کی بادیلی کی خبریں لالا کے سناتے تھے۔ بعض نوجوان جنگ آزما اس کے نداہی لشکر میں بھی شامل ہو گئے۔ جب معمول بابر ان بالائی چراگاہوں میں لوگوں کے دل موہ رہا تھا۔ علی بدا خسرو اس کا دشمن

نئی زمینوں کی ایک ایک چیز پر متوجہ تھا۔ اس کے وطن کے دریا سیر (سیحوں) کے سرچشمے اور پھوٹ گئے اور اب وہ آمو (دریائے زخار جیحوں) کے منابع سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق کی جانب سے بہتے ہیں، جہاں لاجوردی پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان بوسی کرتی نظر آتی تھیں۔ اس نے یہ بات بھی ذہن میں محفوظ کر لی کہ یہاں قدرتی حصار موجود ہے جو از دست رفتہ وطن کے گویا سر پر چھایا ہوا تھا۔ اسی کو ایماق قبائل کے سردار بدخشاں موسوم کرتے تھے یہ لوگ چمکتے ہوئے کہربائی ٹکڑے بابر کے پڑاؤ کے الاؤ پر لاتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ بدخشاں میں لاجورد، زمرد اور سرخ آتشیں پتھر یعنی یاقوت کثرت سے ہوتا ہے۔ "البتہ" وہ یہ قسم کھتے کہ "سردیوں میں تلے اوپر تین دن تین رات تک سورج نہیں دکھائی دیتا"۔ یہ بات بھی انھوں نے چپکے سے بتائی کہ ان پہاڑوں کے اندر سے ایک چوڑا راستہ ندی کے کنارے کنارے جو کوہ پامیر کی برفانی ڈھلانوں سے بہ کر کاشغر گئی ہے، مشرق میں نکل جاتا ہے۔ اسے سن کر بابر کی رائے ہوئی کہ یہ چھپنے کی بہت محفوظ جگہ ہو سکتی ہے اور اس نے اسے یاد رکھا۔

سردست کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کے وسائل اسے میسر نہ تھے۔ پہلی دفعہ ڈاڑھی منڈانے کی تقریب میں کوئی جلسہ ضیافت ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وہ اپنی غربت و افلاس میں اس کا خیال تک نہ کر سکا۔ اگرچہ اپنے علاتی بھائی جہانگیر میرزا کی شادی انہی دنوں کی تو اس رسم کو منانے کا کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کیا۔ اس بھائی کی مخالفت سے جو چرکے دل کو لگے تھے انھیں بابر بھول جانے کی کوشش کرتا تھا اور جہانگیر کے چھوٹے موٹے ساز باز کو بھی اپنے ہی تک رکھتا تھا۔ نوجوان شہزادے کو ایسی سازشیں رات کو شراب کے نشے میں سوجھا کرتی تھیں جو وہ غم غلط کرنے کے لیے پینے لگا تھا۔ اس سے بھی چھوٹا بھائی ناصر میرزا بابر کے لیے ایک اور درد سر بن گیا تھا واضح رہے کہ یہ دونوں ازبکوں سے جان بچا کر بھاگے اور بابر کے پاس آ گئے تھے۔

خوف انگیز ازبک سواروں کی ٹولیاں فراریوں سے کچھ زیادہ دور نہ تھیں۔ یہ تو ٹھیک معلوم نہیں کہ ان کے قراول پہاڑی ٹیلوں میں بابر کا پیچھا کر رہے تھے یا نہیں مگر شیبانی کے صحرائی جنگ آزماؤں پر شکست خوردہ خانوں کے تیس ہزار مغل سپاہی آ ملے تھے اور اب یہ ٹڈی دل جنوب کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا۔ جنوبی پہاڑوں میں خسرو شاہ کا عمل دخل تھا، شیبانی اس کی سرکوبی کی تیاریاں کر رہا تھا جب کہ مغل خانوں سے لڑائی چھڑ گئی لیکن اب تاشقند کا بندوبست کرنے کے بعد اس نے دوبارہ جنوب کا رخ کیا۔ جہاں تک

اہماق ان واقعات پر نظریں لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ اطلاعیں بابر کو پہنچائیں۔

حقیقت میں آمو دریا کے بالائی کناروں پر سبھی کی آنکھیں آنے والے طوفان پر لگی تھیں۔ اسی حالت منتظرہ میں خانوزار نک، سب سے پہلے بابر کے آنکلنے کا واقعہ پیش آگیا۔ مگر اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہی ایک ایسا تیموری شہزادہ تھا جو بہادری سے شیبانی کے خلاف لڑا اور سلامت رہ گیا۔ تیزرو آمو کے معبر پر باقی بیگ منتظر ملا۔ وہ یہاں کی چوڑی پٹی کا حاکم اور خسرو شاہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے بڑی تعظیم و تکریم سے تیمور کے اس خانماں وارث کا خیر مقدم کیا اور اس کی رفاقت میں رہنے کی پیش کش کی۔ اپنے اخلاص کے ثبوت میں اپنے اور اپنے عمائد کے بال بچوں کو بھی مصلحت اندیش باقی بیگ بابر کی لشکرگاہ میں لے آیا۔ یہ جنوبی لوگ لباس فاخرہ میں ملبوس، درباریوں کے ظریفانہ طرز میں خوب باتیں بناتے تھے۔ بلکہ باقی کے طور طریق دیکھ کر تو بابر کو علی دوست کی یاد تازہ ہوگئی جو اس طرح بے نشان مارا گیا کہ کوئی رونے والا تک اُسے نہ ملا۔ باقی نے آتے ہی، اگرچہ تمیز کے ساتھ جہانگیر میرزا کے ہمراہ رہنے پر بھی اعتراض کیا۔ اس نے سعدیؒ کا قول بھی سنایا کہ "دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"۔ بابر کلام سعدی سے واقف تھا۔ اسے پورا قطعہ یاد آیا کہ:

نیم نانے گر خورد مرد خدائے — بذل درویشاں کند نیمے دگر

ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ[1] — ہمچناں در بند اقلیم دگر

تاہم وہ جہانگیر کو چلتا کر دینے پر آمادہ نہ ہوا۔

وہ دریا دریا سفر کر رہے تھے کہ ایک پُرانا مگر بے مروت دوست قنبر علی سلاخ آملا۔ معلوم ہوتا ہے وہ اور علیٰ ہذا باقی بیگ اپنی سلامتی اسی میں سمجھے کہ ازبکوں کی آمد آمد پر خسرو شاہ کو چھوڑ کر بابر کے پاس آجائیں۔ مگر سلاخ کی بیہودہ گوئی جسے بابر برداشت کرتا تھا، باقی بیگ کو بہت ناگوار ہوئی اور آخر سلاخ کو رخصت کر دیا گیا۔ اس مرتبہ سلامتی کی تلاش میں وہ ایسا گیا کہ پھر اس کا پتا نہ چلا۔

جنوب میں آگے بڑھے جانے میں خود بابر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے پاس خاصا بڑا لشکر جمع ہو رہا ہے۔ پُرانے پُرانے مصاحب چلے آرہے تھے۔ خود خسرو شاہ کے مغل سپاہیوں کی طرف سے ایک پیام بہ صیغۂ راز میں پیام لایا کہ "لشکر مغل بادشاہی کے سچے وارث کا خیر طلب ہے۔ خسرو کی فوج کا تار و پود بکھر رہا ہے۔ بابر بہ سرعت آجائے۔ ہم سب اس کی ملازمت قبول کرتے ہیں۔" پھر زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ "لشکر مغل" کے کئی ہزار سوار فی الواقع بابر کے روز افزوں اُردو میں آملے۔

---

[1] مصنف نے ایسے شعر لکھا ہے (مترجم)

لیکن دن صبح کو خیمے کے باہر قدیمی سردار قاسم بیگ باربانی کا منتظر نظر آیا کہ اپنے آقا سے خطا بخشوائے بابر کی عمر ہلالی حساب سے ۲۲ برس کی تھی (کہ شمسی تقویم کے ۱۲ سال کچھ مہینے ہوتے ہیں) پھر تلخ تجربوں نے اسے سبق دیا تھا کہ وہ آنے والے رضا کاروں کی اس ایکا ایکی طغیانی کی علت پر غور کرے۔ آموکی اس عریض ادبی میں یہ علت کچھ چھپی ہوئی بھی نہ تھی۔ اس کے عقب میں ازبک سند آہنی کی تنگ گھاٹی سے گزر چکے تھے اور یہ درہ ممالک سمرقند سے ممالک ہند کو جانے کا قدرتی دروازہ تھا۔ شیبانی خان قلعہ حصار پر بڑھ رہا تھا۔ اس نازک وقت میں مغل سپاہیوں کو بوڑھے خسروشاہ کی نسبت نوجوان بابر اور باقی بیگ کی قیادت میں آنا بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ان سب باتوں پر طرّہ یہ ہوا کہ خود خسروشاہ کا ایلچی آیا اور اعلان کیا کہ خسرو ان تمام ولایات کا اصلی وارث بابر بادشاہ کو تسلیم کرتا اور اس کی وفادارانہ خدمت پر تیار ہے، صرف اس شرط پر کہ اس کی جان اور مال محفوظ رہے گا۔ فی الواقع ممالک جنوبی کا یہ والی، بادشاہ کی اطاعت کا اقرار کرنے کے لیے اس طرف روانہ ہو چکا ہے۔

بابر اس وقت ندیوں کے ایک سنگم کی جانب کوچ کر رہا تھا وہاں خیمے نصب کرا کے، سمرقند کے اس سابق وزیر اور اپنے نوعمر برادر عم زاد کے قاتل سے، ناگوارانہ ملاقات کی۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ یہ شمالی ترک، ازبکوں کا رشتہ دار، سخاوت و مروت میں مشہور تھا" اگرچہ یہ آدمیت جو ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کبھی نہیں کی۔" (بابر نے صاف صاف نہیں لکھا مگر حقیقت میں وہ خسرو کے آدمیوں کو اسے چھوڑ کر اپنے ساتھ آ ملنے کی ترغیب دے رہا تھا) الغرض ایک ندی اُتر کر بابر ایک چنار کے نیچے باقاعدہ بیٹھا جب کہ دوسری طرف سے خسروشاہ خدم و حشم کو جلو میں لیے ہوئے بڑی شان سے آیا۔ ضابطے کے مطابق فاصلے سے گھوڑے سے اُترا اور پیادہ سامنے آکر تین بار مجھے آداب تسلیمات بجا لایا۔ میری مزاج پرسی کرتے وقت جھکا اور نذر پیش کرتے وقت پھر جھکا۔ اسی طرح جہانگیر میرزا اور لاغری بیگ کے سامنے (جو بابر کے پاس بیٹھے تھے) جھک کر آداب بجا لایا۔ یہ بدبخت پیر فرتوت کہ برسوں تک ہوائے نفس میں رہا اور سوائے اس کے کہ اپنے نام کا خطبہ نہیں پڑھوایا، ہر اعتبار سے خود مختار اور بادشاہی کرتا رہا، آج پچیس چھبیس مرتبہ جھک جھک کے آداب بجا لایا اور آگے بڑھا اور پیچھے ہٹا کہ تھک کر لڑکھڑانے لگا۔ دولت و حکومت کے سب نشے ہرن ہو گئے ---- نذر گزارنے کے بعد میں نے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ کوئی گھڑی بھر بیٹھا ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا کیونکہ بزدل، نمک حرام تھا" (بابر کے نزدیک یہ)

اس بڈھے نے اپنی سازشی سے بابر مطلق رو رعایت نہیں کرتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو شاہ (جس کا نام ہی ایک مبہم لقب ہے) ہمت و فراست دکھانے سے عاری نہیں رہا جب بابر نے بے رحمی سے طعن کا نشتر مارا کہ اس کے اتنے آدمیوں کے ٹوٹ جانے پر اظہار ہمدردی کیا تو بڈھے نے فوراً جواب دیا کہ "یہ میرے نوکر چار دفعہ پہلے بھی مجھے چھوڑ چکے ہیں اور ہر دفعہ پھر آ گئے ہیں۔" اسی طرح جب بابر نے سوال کیا کہ اس کا ایک چھوٹا بھائی ولی کس گھاٹ سے دریا اتر کے آئے گا تو موٹے پستہ قامت بڈھے نے یہ مثل دہرائی کہ (دریا چڑھنے پر) "آں گزر را آب برد۔" بابر جو توجہ سے سن رہا تھا، اس جواب کو اسی کے حق میں فال بد یعنی خدم و حشم کے دریا برد ہو جانے کا شگون سمجھا۔ یہ دور از کار تعبیر تھی مگر خود بابر اسے سچ کر دکھانے کا قصد رکھتا تھا۔ چنانچہ اس عجیب ملاقات کے بعد خسرو کا شاندار عملہ ایک ایک کر کے یا جوق در جوق جدا ہو ہو کر مع اہل و عیال بابر کی لشکر گاہ میں آنے لگا۔ اس کا بیان ہے کہ دوسرے دن (بہ تصحیح مترجم) ظہر کی نماز تک کوئی شخص اس کے پاس نہیں رہا۔

شام کے وقت بابر کے خیمے میں اس کے امرا یہ بحث و تکرار کر رہے تھے کہ میرزا خان (ان میں شہزادوں میں سے ایک، جس کے ایک بھائی کو خسرو نے ہلاک، ایک کو اندھا کر دیا تھا) قصاص کا دعویٰ کرتا تھا۔ باقی بیگ نے ہوشیاری سے بابر کے ساتھ صلح کی شرائط ملاقات سے پہلے ہی طے کر لی تھیں، وہ بھائی (خسرو) کی حمایت کرتا تھا۔ اکثر عمائد قصاص لیا جانا واجب جانتے تھے اور بابر دل سے ان کا ہم رائے تھا لیکن وہ اس کے جان مال کی حفاظت کا قول دے چکا تھا یہی فیصلہ کیا کہ اسے بلا ضرر مال اسباب کے ساتھ ملک سے جانے دیا جائے۔ حصار و قندوز کے سابق والی نے گدھوں اور اونٹوں کی تین قطاروں پر سونا چاندی جواہرات بار کیے اور دریا کے کنارے کنارے چل نکلا۔ پھر بابر کو جس نے بطور تحفہ بھی اس کا کچھ مال و دولت لینے سے انکار کر دیا تھا اس نے صورت نہیں دکھائی۔ (خسرو کے نکل جانے کے چند ماہ بعد ایک پریشان کن نتیجہ یہ ظہور میں آیا کہ پہلے وہ پناہ لینے ہرات شہر کے مغرب میں آ گیا تھا، مگر جب سنا کہ بابر اور شیبانی دونوں آمو دریا کی وادی سے چلے گئے تو وہ چند صد ملازمین لے کر پھر اس علاقے میں اپنے دشمن قندوز کو لینے کی غرض سے چلا اور یہ خبر بابر کی لشکر گاہ میں شائع ہوئی تو جب خسرو [illegible] کی [illegible] اس کے بہت سے سابقہ اجیر مضطرب ہوئے اور پھر اس کے پاس جانا شروع ہو گئے۔ [illegible] عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر مغلوں نے بابر کی رفاقت ترک نہیں کی [illegible]

دوسروں کی نسبت زیادہ عافیت اندیش ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ تازہ خبریں یہ آئیں کہ "عالی جناب خسرو شاہ جو پہلے حصار و قندُز بلکہ بند آہنی سے بدخشاں تک سارا ملک بغیر لڑے بھڑے پھینک گئے تھے، اس مرتبہ جو ازبک سرداروں کے سامنے دوبارہ پہنچے تو اس بوڑھے مردک کے لیے کسی نے تلوار نہ کھینچی اور نہ اُسے بھاگنے کا موقع ملا بلکہ گھوڑے سے گرا کر اُسے قندُز لے گئے اور سر کاٹ کر شیبانی خاں کے پاس بھیج دیا۔" بابر نے یہاں خاص طور پر طعن آمیز عبارت لکھی ہے۔ مذکورہ بالا خبر آنے پر جو لوگ اُدھر جانے پر پَر تول رہے تھے، پھر بابر کے پاس رک گئے۔

طلوعِ ستارۂ سُہیل

آمُو پر افراتفری اور خود بابر کی اتنی ناخوش گواری کا سبب ہرات کے سلطان حسین بایقرا کے خطوط تھے۔ بابر نے انھیں محفوظ رکھا اور کبھی فراموش نہیں کیا۔ حقیقت میں یہ سن رسیدہ اور نامی بادشاہ ہرات بڑی قوت فراہم کر سکتا تھا۔ وہ بابر کا ایک ہی چچا سلامت رہ گیا تھا۔ نہایت فاضل، اہلِ علم اور شعرا کا دوست، اور تیمور کی اولاد میں تنہا صاحب ملک و حکومت شخص تھا۔ خراسان کے پائے تخت ہرات میں اس کا دربار طالبانِ علم و راحت دونوں کے لیے مرجع ہو گیا تھا۔ وہ سمرقند کو پارہ پارہ کرنے والی خانہ جنگیوں سے بہت دور، حسب سابق آرام و اطمینان کی معاشرت کا دلدادہ رہا۔ ایک وقت میں خود بابر وہاں جا کر پناہ لینے کی سوچتا تھا۔ اس نے سمرقند پر قبضہ ہونے کے زمانے میں اپنے چچا سے دوبار فوجی کمک کی بھی درخواست کی تھی، دونوں دفعہ بے نتیجہ رہی۔ پھر جنوب کی طرف فراری کے وقت بصیغۂ ضروری چچا کو لکھا کہ آمو دریا پر ازبکوں کے خلاف اس کے اور خسرو شاہ کے ساتھ مل کر مقابلہ کرنے میں درنگ نہ کرے اور جتایا کہ شیبانی کی روز افزوں قوت ہرات کے حق میں خطرہ بنتی جاتی ہے۔ خسرو نے بھی یہی دلیل لکھی تھی۔

حسین میرزا نے بھتیجے کی سمرقند والی عرض داشتوں کا تو کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن اس موقع پر جواب میں فوراً قاصد دوڑائے اور خسرو شاہ؛ دربابر کو طولانی خط لکھ کر بھیجے۔ بابر لے انھیں پڑھ کر بہت پیچ و تاب کھائے۔ کیا چچا نے دریا عبور کرنے کے لیے صرف کشتیوں اور پلوں کا انتظام کر دینے کو لکھا اور اپنے فوراً آنے کی اطلاع دی تھی؟ نہیں، بالکل نہیں۔ حسین میرزا نے تو بابر کے خنجر بھونک

کرا سکے اور تیغ دستے دیے تھے ـــــ اس نے نہایت خوش نما الفاظ میں لکھا تھا کہ صرف بارہ برس کی عمر میں جس بھتیجے نے اندجان کی ندی پر اپنے تین تین چچاؤں کی پیش قدمی روکی اور انھیں پسپا کر دیا تھا، آج آمو پر ازبکوں کی پیش قدمی بھی اسے روک دینی چاہیئے۔ تمام قلعوں خصوصاً حصار کی حفاظت کا معقول بندوبست وہ کر سکے اور اُدھر خسرو شاہ اور اس کا بھائی ولی بدخشاں جا کر کوہستانی سرحد کے مورچے سنبھالیں تا کہ ازبک لا زماً بے نیل مرام واپس ہو جائیں"

ان خطوں کو پڑھ کر بابر سے بھی پہلے خسرو شاہ نے آنے والی مصیبت کا اندازہ کر کے ہی بابر سے مصالحت کی وہ صورت نکالی جس کا اوپر ذکر آیا اور اپنے خزائن لے کر ہرات کی طرف چلا گیا تھا۔ بابر ان عجیب طول طویل خطوں کا اب مطلب سمجھا۔ حسین مرزا کا پیرانہ سالی میں خرف ہو جانا ممکن تھا لیکن اس جیسا آدمی جاہل و بے خبر نہ ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے دُور کے بھتیجے کی کسی بچپن کی بات کا بدلہ لے رہا ہو؛ بہر حال وہ سوچتا ہی رہا اور ادھر ازبک نے حصار کو آ گھیرا اور انہی کشتیوں میں جنھیں بابر چچا کے لیے تیار کرانے کی سوچتا تھا، بیٹھ بیٹھ کر آمو کے پار اُترنے لگے۔

ادھر بابر کا حال یہ کہ دو تین سو نیم فاقہ کش رفیق اور چرب گفتار باقی بیگ ہم رکاب تھے۔ البتہ قزاریوں کی فوج کی فوج لشکر گاہ میں جمع ہو گئی تھی۔ اس نے مایوسی کی چادر اُتار پھینکی، کام کرنے پر آمادہ ہوا پاسبانوں کے سردار "ایشک آغا" حاجب در) قاسم کو چند سوار دے کر بھیجا کہ ازبک قراول جو قریب آ گئے ہوں، پیچھے دھکیل دیئے جائیں۔ خسرو شاہ اسلحہ کا ذخیرہ چھوڑ گیا تھا، اسے ٹٹولا تو کئی سو زرہ جوشن اور ہتھیار ملے جنھیں فوراً اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر خسرو کے باربرداری کے اونٹوں کی گرد بیٹھنے نہ پائی تھی کہ خود بھی اپنے رضاکاروں کا لاؤ لشکر لے کر شبا شب جنوبی پہاڑوں کی محفوظ سرحد کی طرف چل پڑا۔ تھوڑے سے محافظ چھوڑ دیئے کہ عورتوں بچوں کو چھیر کے راستے سے پیچھے پیچھے لے آئیں۔ خلاف معمول "تامّل کیسے ساتھ لکھتا ہے" اب یہ لشکر گاہ چھوڑ کر ہم کابل پر چلے" فوجی پسپائی کی حالت میں "ترھنے" کی یہ ایک قدیم نظیر کہی جا سکتی ہے۔

جنوب میں جس قدر آگے بڑھے پہاڑوں کی سیاہ نیلگوں قطاریں ایک کے پیچھے ایک بلند تر ہوتی گئیں پہاڑ کے دامنوں سے بل کھاتے ہوئے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ یہ ہندوکش کے پہاڑ تھے جو موسم خزاں میں

ا مصنف نے اصل تزک کی عبارت شاید نہیں سمجھی اور یا عمداً مذکورہ واقعات کو رنگین ترنبا کے پیش کیا ہے۔ مترجم۔

چٹیل رہ جاتے ہیں۔ یہاں بابر نے ایک شگون لیا اگرچہ ان دنوں اسے شگونوں پر کچھ اعتماد نہیں رہا تھا۔ " ہم ساری رات چلے اور صبح ہوتے (بہ تصحیح مترجم) ہوتیان کے درے پر چڑھے۔ میں نے اس وقت تک ستارۂ سہیل نہیں دیکھا تھا۔ درے کی چوٹی پر ایک ستارہ جانب جنوب خوب چمکتا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا یہ سہیل تو نہیں ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ سہیل ہی ہے۔ باقی بیگ چغانی نے شعر پڑھا ؎

تو سہیلی تا کجا تابی و کے طالع شوی
چشم تو ہر ہر کہ می افتد نشان دولت است

ہندوکش سے پار ہونے کے بعد ہمارا شیر ازبکوں کی دسترس سے تو باہر تھا لیکن ابھی قسمت کی مساعدت کی ضرورت تھی۔ جنوب کو کوچ کے آغاز میں ہی کچھ گڑبڑ نہ تھی۔ اب جو ان کے اہل و عیال پیچھے پیچھے پہاڑی پٹیوں سے ہوتے ہوئے آئے تو مزید چرچا ہوا اور بہت سے پہاڑی لوگ جو کسی سر لشکر کے جھنڈے کے نیچے سلامتی اور لوٹ کے طالب تھے۔ ان کے عقب میں چل پڑے۔ چنگیزی مغول کی فاتح فوجوں میں بچے کھچے خانہ بدوش ہزارہ قبائل بھی تھے جو گھوڑوں پر چڑھ چڑھ کر اس کی لشکرگاہ میں آئے کہ آگے کے میدانی علاقوں کی لوٹ میں حصہ لگائیں۔ اس کے بے قابو نٹی بھرتی والے آگے آگے دوڑتے اور دیہات سے سامان رسد وصول کرتے تھے۔ خود راستہ باقاعدہ کاروانی شاہراہ نہ تھا بلکہ گلہ بانوں کی پگڈنڈی تھی۔ چراگاہوں میں بابر کے ٹچے پیادے چرتے گھوڑے اڑا لانا چاہتے تھے۔ مسلح فوجوں کی سامان خوراک کے لیے دیہاتیوں سے لڑائیاں ہوجاتی تھیں۔ حتیٰ کہ روغن زیتون کی ہنڈیا لوٹ لینے والے کو اس نے ایک بار لکڑیوں سے اتنا پٹوایا کہ اس کا دم نکل گیا۔ لکھتا ہے کہ " بہ نظیر دیکھ کر سب کانپ گئے اور ایسی حرکتیں بند ہوگئیں "۔ حقیقت میں تادیب و تعزیر کی ضرورت تھی۔ جس علاقے میں لشکر گھسا، وہاں خانہ جنگیوں نے ابتری پھیلا رکھی تھی۔ اس ولایت (کابل) کا آخری تیموری حاکم بابر کا ایک اور چچا اور نامور عالم الغ بیگ کا ہم نام تھا۔ اہل ملک اسی کی تعدیوں سے نالاں رہے۔ جب وہ مرا تو ایک شخص نے غاصبانہ قبضہ جما لیا اور متوفی حاکم کے طرح طرح کے رشتہ داروں سے ویہات کی بھول بھلیاں میں جنگ کرتا پھرتا تھا۔ جاگیرداری نظام کی اس کابل بدامنی میں پہلے تو خسرو کے مغل جواب بابر کے لشکر میں آ گئے تھے، داخل ہوئے، پیچھے پیچھے ہزارہ اور دوسرے قبائل کے غول آ گھسے۔ ہر طرف مار دھاڑ کی ایک وباسی پھیل گئی۔ اسی میں ایک مرتبہ بابر کی ماں اور قشکر کے دوسرے عورتوں بچوں کا قافلہ لشکر کو آتے آتے پھنس گیا تھا، خود بابر کو انھیں ٹھہرا کر بلند و سیع

چراگاہ میں لانا پڑا جہاں انھیں فی الجملہ اطمینان نصیب ہوا۔

اب ایک خاصا پُرہیبت منظر ان کے سامنے تھا۔ پہاڑوں کے ایک عظیم دائرے میں، تپتے ہوئے صحراؤں کے درمیان چاندی کی زنجیر سی ایک ندی چلی جاتی تھی اس کے کناروں پر ایک سرسبز قطعہ جڑا ہوا تھا۔ ان پہاڑوں کا قلعہ، کابل ہی تھا۔ مگر مقیم (ارغون) جو غاصبانہ قابض ہو گیا تھا، اس موقع پر قلعے کے دفاع کرنے کی مہلت نہ پا سکا۔ باقی بیگ نے زور دیا۔ کہ فوراً حملہ کر دیا جائے۔ بابر نے یہ رائے مان لی۔ تجربے نے اسے سبق دیا تھا کہ ایسے جنگی خطّوں میں لوگ ہمیشہ اسی سپہ سالار کا ساتھ دیتے ہیں۔ جو آگے آگے بڑھے جائے، نہ کہ اُس کا جو خالی اپنی جگہ پر ڈٹا رہے۔ دونوں قائد اپنے مسلح سواروں کی تھوڑی بہت جنگی صف بندی کرا کے، پرچم اُڑاتے، حوصلہ افزا نقارے بجاتے ہوئے چلے۔ بابر قدرے بلند ٹیلے پر جہاں بعد میں چار باغ بنوایا، کھڑا تھا۔ اس نے سرکش محافظین قلعہ سے گفتگو کرنے کی غرض سے علاحدہ آدمی بھی روانہ کیے۔ اس نمائشی یورش پر نا قدانہ نظر ڈالتا ہے:۔

"ہمارے ہراول کے جوان ندی کے کنارے تُتلُق قدم کے پُل کے شمال میں پھیل گئے۔ مگر اس وقت وہاں کوئی پل نہ تھا۔ بعض گھوڑے ڈپٹا کر دروازہ حرم گراں تک جا پہنچے اور اس دروازے سے جو شہر والے مقابلہ کرنے باہر آئے تھے، وہ اُلٹے بھاگے۔ ارک کی ڈھلان پر کچھ کابل والے تماشا دیکھنے کو آئے تھے، وہ بھی بھاگے تو بہت گرد اُڑی۔ بلندی سے کئی آدمی گر کر لڑھک پڑے دروازے اور پُل کے درمیان (حریف نے) گڑھے کھود کر اندر نوک دار میخیں گاڑ دی تھیں اور اوپر خشک گھاس بچھائی تھی۔ سلطان قلی چُناق اور کئی سوار دھوکا کھا کر ان گڑھوں میں گرے۔ دائیں جانب میرے چند سواروں نے قلعہ والوں سے تلوار کے دو دو ہاتھ کیے لیکن انھیں جم کر لڑائی کرنے کا حکم نہ تھا، اس لیے پلٹ آئے۔"

لیکن جنگ کا یہی گرما گرم مظاہرہ بابر کے قاصدوں کو حسب مراد جواب لانے میں کارگر ثابت ہوا، یعنی مقیم نے انھیں دوستانہ طور پر بٹھایا اور قلعہ خالی کرنے کی شرطیں طے کر لیں۔ مقیم کو جنگی اعزاز کے ساتھ نہیں، تو کم سے کم جملہ اہل و عیال، خدم و حشم اور اموال کے ساتھ دوسری صبح قلعہ خالی کرنے کی قرار داد ہو گئی۔ اس خوف سے جو بے جا نہ تھا، کہ ان لوگوں کے رخصت ہوتے وقت ہنگامہ ہوگا، بابر نے چند معتمد علیہ سردار شہر کے دروازے پر متعین کیے کہ امن و انتظام قائم رکھیں

لیکن تھوڑی ہی دیر میں ان سرداروں کے آدمی آئے کہ خسرو کے (سابقہ) سپاہیوں نے مغلوب حریف کا قافلہ روک لیا ہے اور جب تک آپ خود نہ آئیں ہم ان کو آویزش سے باز نہ رکھ سکیں گے۔"

بابر نے صورت حال کو قابو میں کیا "میں سوار ہو کر خود وہاں گیا۔ دو تین زیادہ شورش کرنے والوں پر تیر مارے اور دو ایک کو تلوار سے قتل کرا یا۔ تب مقیم، اس کے ساتھی اور مال اسباب روانہ ہو کر صحیح سلامت زیبہ پہنچ گئے۔ اس طرح اللہ تعالے نے مہینے (ربیع الثانی) کے آخر (اکتوبر ۱۵۰۴ء) تک اپنے کرم سے کابل و غزنی اور ان کے توابع کا لڑے بھڑے بغیر مجھے مالک بنا دیا۔"

ارض "قابیل" کا جائزہ

شیر کی سب سے پہلی —— اور طبعی ترنگ یہ تھی کہ آگے بڑھتے جائے اور دیکھے کہ مزید کتنا ملک فتح کر سکتا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ اس کے نئے دار الملک کی ندی مشرق میں بہ کر دریائے سندھ میں جا ملتی ہے جس کے پار ہندوستان ہے تو وہ اسی رخ چلنا چاہتا تھا۔ مگر باقی بیگ نے خبردار کیا کہ پہلے نئے گھر کو قرینے سے لگا لو اور آس پاس کے قبیلوں کی طرف سے اطمینان کر لو پھر انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے جانا۔ کیونکہ سرزمین قابیل (کابل) کی صفات خاصہ میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔

تب بابر نے ذوق شوق کے ساتھ اپنے نئے شہر، نئے ملک اور وہاں کے باشندوں پر توجہ مبذول کی۔ اس کی دیکھ بھال خاصی تفصیلی جنگی نوعیت کی تھی اور جو کچھ دریافت کیا اس کے ساتھ پوری دلچسپی لی۔ وہ سوچتا تھا کہ آیا یہ نئے نرالے مناظر، بادل چھونے والی بلندیاں، نامتناہی فاصلوں والی سرزمین سمرقند ثانی بن سکتی ہے؟ اس نے رائے قائم کی کہ "یہ تنگ عرض کا ملک ہے۔ ہندوکش کی فصیل شمال میں قندوز سے اور جنوب میں (قبائلی) افاغنہ کی سرزمین سے اسے جدا کرتی ہے۔ مغرب میں غ [illegible] سار ڑ ہرات تک) چلے گئے ہیں اور مشرق میں (خیبر کے گردنے پر) پشاور اور ممالک ہندیہ"

کیونکہ تیز رو ندی کے اوپر پہاڑیوں میں الگ تھلگ آباد تھا اور دامن میں مقام تک جہاں عیاشی کی جاتی ہے پھیلے ہوئے ہیں۔ خواجہ حافظ کے شعر کر کے پڑھتا ہوں:-

"اے خوش آں وقت کہ بے پا و سر، آیا مے چند
ساکن گلکدۂ بودیم بہ بدنامے چند"

بالا حصار (ارک) سے متصل جو نہایت بلند پہاڑی کے اوپر واقع تھا، چناروں کے سائے میں قدم گاہ (خواجہ خضر" مترجم) کے چشمے کے پاس ایک ٹیکرے پر بابر کا قیام تھا (یہاں اس نے وہ غلطی نہیں کی جیسی اخسی میں کی تھی کہ میزبان دوست کے حوالے قلعہ کر دیا تھا، اور یہاں باقی بیگ کے حوالے کر دیتا) یہاں سے مرغزار چالاک کی دلدلی چراگاہ اور کوئی تین میل دور کا بڑا تالاب نظر آتے تھے جس کی بابر نے قدموں سے پیمائش کرائی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں قلعے کے دریچوں اور کنگوروں کے بیچ میں سے چلتی رہتی تھی۔ اس شمالی ہوا کو یہاں کے لوگ (بہ تصحیح) "بادِ پرّاں" کہتے تھے (بہ تصحیح و اضافہ) ملا محمد طالب معمائی نے "قلعۂ کابل کی تعریف میں یہ شعر کہا تھا ؎

"بخور در ارکِ کابل مے، بگرداں کاسہ پے در پے
کہ ہم کوہ است و ہم دریا و ہم شہر است و ہم صحرا"

بعض شرابوں کی تعریف کے سلسلے میں کچھ آگے چل کر بابر (جو اس وقت تائب تھا) لکھتا ہے کہ ہم تو اب تقلیداً یہ تعریف کر رہے ہیں۔ کیونکہ ع

"لذت مے مست دارد، ہوشیاراں را چہ حظ"

نئے وطن کی تعریف میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ کابل سے ایک دن کی مسافت پر ایک مقام ایسا ہے جہاں برف کبھی نہیں گرتی اور ایک ایسا جہاں دو نجومی ساعتوں میں پہنچ سکتے ہیں اور وہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے" مگر از رہ راستی یہ اضافہ کر دیا ہے "سوائے کبھی کبھی سخت گرمی کے۔"

آب و ہوا کی تعریف میں بابر نے خاصا مبالغہ کیا ہے اور کاروانی تجارت کی بھی دلپسند تصویر کھینچی ہے۔ حالانکہ خود اعتراف کرتا ہے کہ یہ زیادہ تر گھوڑوں کی ہوا کرتی تھی۔ لکھتا ہے کہ کابل ایسی اچھی منڈی ہے کہ سوداگر روم (ترکی) یا خطا (چین) تک جائیں تو بھی یہاں کے تین چار سو فیصدی نفع سے زیادہ منافع نہیں کما سکتے! بعض اوقات بابر کے استدلال میں آثرستان کے لوگوں کی اندھی

۱؎ نے "گل خانہ" لکھا ہے۔ مترجم۔ ۲؎ مصنف نے اوپر کا شعر بابر کے کسی ندیم سے منسوب ہوگا، بابر سے (پکر کر) بابر کا بتایا ہے اور یہ دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ مترجم۔

مطلب پرستی کی کیفیت آجاتی ہے۔ تاہم وہ ہر جنس کا جو ہندوستان سے تجارت کے لیے آتی تھی، فرداً فرداً شمار کرتا ہے: لونڈی غلام۔ اچھی قسم کا سفید کپڑا۔ نیشکر۔ قند۔ مصری۔ معمولی شکر۔ مصالحے کی جڑی بوٹیاں۔ مقامی پھلوں کا اس نے تفصیلی جائزہ لیا ہے اور فرغانہ کے انگور و خربزہ کی یاد بار بار تازہ کی ہے۔ یہاں کی پیداوار کو پہاڑ کے اوپر سرد سیر اور نیچے کے گرم سیر خطوں میں تقسیم کرتا ہے۔ سرد سیر ہیں: انگور۔ انار۔ خوبانی۔ شفتالو۔ سیب۔ بہی۔ ناشپاتی۔ بیر۔ اخروٹ۔ بادام اور دریائے سندھ کی طرف گنا۔ آگے چل کر خود اس نے نیشکر کی کاشت کرائی جس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ باہر سے شاہ دانہ منگا کر لگایا تو وہ خوب پھل لایا۔ اسے اعتراف ہے کہ یہاں خربوزہ اچھا نہیں ہوتا۔ صرف ہرات کا اچھا خاصا کہا جا سکتا ہے۔ شہد کے چھتّوں کی کثرت تھی مگر شہد صرف مغربی اضلاع سے آتا تھا۔

یہ بات بابر نے بہت جلد معلوم کر لی کہ کابل غلّہ خوروں کا خطّہ ہے مگر کافی غلّہ پیدا نہیں کرتا۔ لامحالہ پہاڑی قبائل سے غلّہ لانا پڑتا ہے۔ اور یہ ایسا معاشی مسئلہ تھا جسے وہ آخر تک حسب دل خواہ حل نہ کر سکا۔ علیٰ ہذا چراگاہوں کی بھی دشواری پیش آتی تھی جن میں مکھی مچھر گھوڑے کے گلّوں کو تنگ کرتے تھے اور انہی پر بہت کچھ دارومدار تھا۔ بہر حال، بابر کسی قدر آئر ستانی منشیجنت کے انداز میں تجارت و زراعت کا جائزہ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے:

"کابل کی آب و ہوا نہایت لطیف ہے کہ اور کسی جگہ کی اتنی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ گرمی کی راتوں میں بھی پوستین میں لپٹے بغیر نیند نہیں آتی۔ جاڑوں میں گہری برف پڑتی ہے۔ پھر بھی سردی زیادہ شدید نہیں ہوتی۔ سمرقند و تبریز ہوا کی خوبی میں مشہور ہیں لیکن وہاں سردی غضب کی پڑتی ہے۔"

شہر کی دیکھ بھال کرنے سے معلوم ہوا کہ حویلیوں کی بجائے پہاڑی باغ زیادہ ہیں۔ نواح کے مرغزاروں اور چراگاہوں میں گھومنے کے بعد جب بابر اپنے نئے ملک کی حدود دیکھنے نکلا تو پتا چلا کہ وہ فرغانہ سے بڑھ کر پہاڑی دیواروں سے مختلف اجزا میں بٹا ہوا ہے۔ اس نے دروں کو پوری توجہ سے جانچا اور نتائج نے اسے حیران کیا۔ شمالی اور جنوبی بیچ در بیچ راستے اکثر صرف وسط گرما میں قابل استعمال ہوتے اور سوائے ایک کے باقی سب جاڑوں میں برف سے اور موسم بہار میں ندی نالوں کی طغیانی سے مسدود ہو جاتے تھے۔ افغانستان میں آنے والے چار بڑے درے سطح بحر سے دس ہزار فیٹ سے زیادہ بلندی پر ہیں۔ ہرات کا سب سے اچھا راستہ یعنی قندھار کا پھیر کھا کے اوپر جاتا تھا اور ہندوستان

کا بہترین راستہ کابل ندی کے کنارے کنارے تھا۔ عام طور پر دونوں بہرے نیائلی لوگوں کے قبضے میں تھے اور وہ چاہتے تو مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر بابر نے نتیجہ نکالا کہ کابل مضبوط قلعہ ہے جس کی آسانی سے مدافعت کر سکتے ہیں۔

اس کی نئی مملکت میں دوسرا قابل ذکر شہر غزنین قندھار کے راستے پر واقع تھا اور وہ معترف ہے کہ شکستہ حال، گھٹیا رہ گیا تھا۔ اس کا امتیاز لے دے کے سلاطین عہد رفتہ کے مقبرے تھے بابر تعجب کرتا ہے کہ سلطان محمود اعظم نے اس مقام کو کیوں پسند کیا جب کہ خراسان میں اپنے محلات تعمیر کر سکتا تھا۔ اس نے ان مقبروں کی مرمت اور درستی کے احکام جاری کیے۔ عام تصور میں وہ اپنے آپ کو سلاطین غزنوی کا جانشین دیکھتا تھا لہذا ان کے روضات و مقابر سے غفلت نہ کر سکتا تھا۔

کابل میں خود اس کی سکونت گاہ، ظاہر ہے کہ تجدید و ترمیم کی متقاضی تھی۔ اس نے ٹیکرے پر جیسے سمرقند کے باغ کی یاد میں چار باغ موسوم کیا، درخت لگانے شروع کیے۔ قریب ہی ایک برف پوش پہاڑی سے ندی بہتی ہوئی آتی ہے۔" دونوں کناروں پر سرسبز و شاداب دلکش باغات ہیں۔ پانی اتنا ٹھنڈا کہ کسی زمانے میں برف کی حاجت نہیں ہوتی۔ انہی میں بڑے باغ کو میرے چچا الغ بیگ (جو بابر سے پہلے یہاں حاکم اور استحصال بالجبر کرتا تھا) نے زبردستی چھین لیا تھا۔ میں نے اس کے مالکوں کو قیمت ادا کر کے اپنے نام کرایا۔ اس کے احاطے میں چار طرف چنار کے درخت سایہ افگن ہیں جن کے نیچے بہت اچھی پر لطف نشست ہو سکتی ہے۔ ان کے درمیان سے ایک نالا گزرا ہے جو سارے سال جاری اور اتنا بڑا ہے کہ ایک پن چکی کو چلا سکتا ہے۔ میں نے اس کے پیچ و خم درست کر کے گزرگاہ کو سیدھا کرا دیا۔ نیچے کے رخ آگے چل کر دہ چشمہ آتا ہے جسے (بہ تصحیح مترجم) "خواجہ سیاراں" موسوم کرتے ہیں۔ اس کے دونوں طرف پہاڑیوں پہ شاہ بلوط کے درخت ہیں۔ ان دو جھنڈوں کے سوا یہ درخت کابل کے مغرب میں کہیں نہیں ہوتا۔ چشمے سے نیچے کی طرف چلیں تو جگہ جگہ گل ارغواں کے چمن کھلے ہیں۔ یہ پودا بھی ملک بھر میں اور کہیں نہیں ہوتا۔ مشہور ہے کہ (چنار، بلوط، ارغواں کے) یہ تین درخت تین اللہ والے بزرگوں کی کرامت سے یہاں پیدا ہوئے اور اسی لیے یہ جگہ "خواجہ سیاراں" موسوم ہوئی۔ میں نے حکم دیا کہ چشمے کی دیواریں پتھر سے چن کر اسے باقاعدہ دہ در دہ کا حوض بنا دیا جائے۔ چشمے کے پاس آرام بیٹھنے

کی جگہ بنوائی جس وقت یہ زرد و سُرخ پھول کھلتے ہیں تو وہ کیفیت یہاں ہو جاتی ہے کہ میں جانتا ہوں دنیا بھر میں کہیں نہ ہوتی ہوگی۔ چشمے کے جنوب مغرب کی وادی میں ایک نالا بہتا ہے جس میں پن چکّی چلانے کے قابل پانی سے آدھا پانی ہوتا ہے میں نے اس کے پختہ کنارے بنوا کے نہر کر دیا اور اس کے اوپر بلندی پر گول چبوترہ بنوا دیا۔"

ذاتی دل چسپی کے ان مقامات سے بابر کا شغف بڑھتا ہی چلا گیا۔ عجب نہیں کہ نئی مملکت کی وسعت اور دیو پیکری کے ساتھ، اس کا انسانیت سے عاری ہونا دیکھ کر یہ نفسی ردّ عمل ہوا ہو۔ بے گیاہ پہاڑوں کی خالی چٹانوں اور ویران گھاٹیوں کا وہ اعتراف کرتا اور لکھتا ہے کہ "جیسے تنگ و محدود قطعات کوہ ہیں، ویسے ہی ان میں بسنے والوں کے دل تنگ ہیں"۔ جانور تک کمیاب تھے۔ سُرخ ہرن اور گورخر گھانس کی تلاش میں میدانی علاقہ چھوڑ کر پہاڑیوں کو ہجرت کر گئے تھے۔ شکاریوں کو شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑانے کی بجائے گھات لگا کے ان کی واپسی کے راستوں پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ پرندے تک ان بے ڈھنگی گھاٹیوں سے نکل بھاگتے تھے۔ ان کا شکار کھیلنے والے گزرتی ہوئی مرغابیوں وغیرہ کی عادت جانتے تھے کہ دروں میں مخالف ہوا تیز چلتی ہے تو یہ پرند زمین پر بیٹھ کر دم لینے لگتے ہیں۔ انھیں دوشاخہ تیر اور رسّی کے پھاندے سے شکار کرنا خاصا بے مزہ، محنت طلب کام تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ "شکار بارش کی اندھیری راتوں میں کرنا پڑتا تھا جب کہ یہ پرند درندوں کے خوف سے زمین پر نہیں اُترتے مگر زمین سے لگے لگے ہی اُڑتے رہتے ہیں۔ خصوصاً بہتے پانی کے اوپر، کیونکہ اس کی چمک انہیں نظر آتی ہے۔ اسی طرح کے ندی نالوں کے پاس شکاری اپنے جال ڈالتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے بھی جال ڈلوایا، مگر وہ ٹوٹ گیا اور پرندہ آگے اُڑ گیا۔ لیکن دوسری صبح ہانکے والے اسے مرا ہوا لائے۔ وہ جال کی ٹوٹی رسّی میں لپٹ گیا تھا۔

ریگستانی ویرانوں میں رات کو رجال غیب کا گزر ہوتا تھا۔ ٹیلوں پر سے تیز ہوا گزرتی تو ڈھول بجنے کی سی مدھم آواز اور گھوڑوں کے چلنے کی چاپ سنائی دیتی۔ لوگ کہتے شہیدوں کی فوج سوار جا رہی ہے۔ بابر اسے تھوڑا بہت باور کرتا۔ تاہم اب لڑکپن کی طرح زود اعتقاد نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اسے ایک مسجد میں لے گئے۔ کہا کہ بآواز نماز پڑھی جائے تو مسجد کی دیواریں ہلنے لگتی ہیں۔ سمرقند کی گونج والی مسجد کی طرح بابر نے فوراً آزمائش کی اور دیکھا کہ نماز کے دوران میں بے ڈھنگی سی دیواریں چرچرائیں

اور ہلنے لگیں۔ تحقیق کی تو موذّن کے مینار پر ایک خادم لکڑی کی باڑ پر چھپا ہوا تھا اور بر وقت دیواروں کو حرکت میں لاتا تھا۔ بابر نے حکم دیا کہ آیندہ نماز کے وقت تمام خدّام نیچے مسجد میں حاضر رہا کریں۔[1]

آیندہ موسم بہار میں جب ہری گھاس اُگی، بابر کو ایک صدمہ اٹھانا پڑا۔

"اس مہینے میری والدہ کو بخار ہوا، فصد کھلوائی لیکن اچھی نہ کھلی۔ ایک خراسانی طبیب نے جس کا نام بھی سیّد طبیب تھا، خراسانی اطبّا کے معمول کے مطابق تربوز بھی کھلایا لیکن اس کا وقت آگیا تھا۔ چھ دن علیل رہ کر اللہ کے گھر سدھاری۔ اتوار کے دن نوروزی باغ میں جہاں پہاڑی پر اُلغ بیگ نے ایک بارہ دری بنائی تھی، باغ کے مالکوں سے اجازت لے کر میں نے اور قاسم کوکتاش نے اسے قبر میں اتارا۔ اس کی عزاداری کے زمانے میں لوگوں نے مجھے اپنے ماموں الچہ خاں اور میری نانی ایسن دولت بیگم کے انتقال کی خبر سنائی۔ خانوں کی ایک ماں شاہ بیگم میری باقی ماندہ خالہ کو ساتھ لے کر خراسان سے والدہ کے چہلم کے دن پہنچی اور عزاداری تازہ ہو گئی۔ عزیز بزرگوں کی مفارقت کا سخت صدمہ ہوا۔ غریب غربا کو کھانا کھلوایا، قرآن خوانی کرائی۔ مراسمِ عزا کی تکمیل اور دعائے مغفرت کر کے ہم نے دلوں کو تسلّی دی اور صبر و استقامت حاصل کی۔"

دل مضبوط کرنے کی یقیناً ضرورت تھی۔ علاقے کی کیفیت لکھنے کو بھی بابر نے یہ کہہ کے بالائے طاق رکھا کہ "سرزمینِ کابل پر قلم سے نہیں، تلوار سے حکومت ہوتی ہے۔"

باقی بیگ کی دسویں بُرائی

بابر نے ماں اور نانی کے غم میں جو سیاہ لباس پہنا، وہ رسمی بات نہ تھی۔ وہ حقیقت میں تنہا رہ گیا اور ان کے مرنے پر دلی رنج محسوس کرتا تھا۔ تاج و تخت سے محروم ہونے کے بعد بھی فرغانہ میں جو دوست احباب اس کی خاطر بھوک پیاس کی تکلیف سہتے رہے، وہ اسے یاد آتے تھے۔ بدقسمتی سے آج تک خدا جانے ساتھ چھوڑ کے کہاں چلا گیا۔ وہ صحبت بابر کی غذائے روح تھی۔ اس لیے ایک مرتبہ کہا:

"مرگ با دوستاں جشن است"

بابر کی ماں اپنی زندگی سے مایوس ہوئی تو اصرار کرتی تھی کہ بابر دوسری شادی کر لے کیونکہ عائشہ

---

[1] فارسی تزک میں یہ قصہ مسجد کی بجائے ایک مزار سے منسوب ہے۔ مترجم۔

مدت سے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بابر نے تعمیلاً شاخِ سمرقند کی ایک عم زاد زینب سلطان بیگم سے شادی کی "یہ بھی کچھ سازگار نہ ہوئی۔ دوسال بعد چیچک کے مرض سے انتقال کر گئی" شہزادی زینب سلطان سے اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ بابر کے بیرونی گشت لگانے میں ارک کابل ہی میں اپنے نوکروں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ادھر گھر والوں کی طرف سے نئی نئی پریشانیاں پیش آنے لگیں کہ سب سے چھوٹا بھائی ناصر میرزا شرابی دوستوں کا ہم پیالہ اور بابر سے دور ہی دور رہنے لگا۔ جہانگیر کمزور فطرت کا جوان ہر وقت کی پاسبانی کا محتاج تھا۔ باقی بیگ سب سے پہلے اصرار کر کے ہرات کی بجائے اسے کابل لایا، وہ اس بھائی کے خلاف برابر بابر کے کان بھرتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ جاہ طلب امیر اس ساز باز میں مصروف تھے کہ صاحب عزم بابر کی بجائے ضعیف الارادہ جہانگیر کو بادشاہ بنایا جائے۔ ایک مرتبہ دریائے سندھ کے کنارے جنوب کی طرف کوچ ہو رہا تھا کہ جہاں گیر میرزا نے کان میں کہا، باقی بیگ نے صیغۂ راز میں مجھے بتایا تھا کہ چند سرداروں نے بادشاہ کو دریا پار کسی بہانے بھیج کر جہانگیر کی بادشاہی کا اعلان کرنے کی صلاح ٹھیرائی ہے۔ بابر جہانگیر کی یہ اپنایت دیکھ کر خوش ہوا۔ جہانگیر نے تو سوائے باقی کے اوروں کے نام نہیں بتائے مگر بابر نے گمان کیا کہ وہ خسرو کے پرانے سردار ہوں گے (خسرو اس وقت تک مارا نہیں گیا تھا) بایں ہمہ ایسی حالت میں کہ سابقہ مدعی منقیم ملک میں موجود اور ازبک شمالی وردل کے آس پاس گھوم رہے تھے، وہ سر دست ان سازشی سرداروں کے بغیر کچھ نہ کر سکتا تھا۔

اکثر کہا گیا ہے کہ جب بابر خیبر کی بیلی بیلی انتڑی سے نکلا اور صرف تجسس کی غرض سے سندھ کے کنارے تک گھوڑے پر سوار پہنچا، تو اس بھورے بھورے پانی کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ ہندوستان میں گھس پڑے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی مخلوط جمعیت تاخت کرنے آئی تھی کہ کابل کے علاقے سے باہر غلہ، مواشی وغیرہ لوٹ کر اپنا اور کابل والوں کا پیٹ بھرے۔ یہ ۱۵۰۵ء تھا اور ابھی بابر کے پاس ایک بھی ایسا معتمد علیہ آدمی نہ تھا جسے وہ اپنے پیچھے حفاظت ملک کے لیے چھوڑ جائے۔ اسے یہ بات بخوبی معلوم تھی اور ہندوستان کا سب سے پہلا منظر دیکھ کر جو کیفیت اس نے قلم بند کی، اس میں کچھ زیادہ ذوق شوق نہیں پایا جاتا:۔

"میں نے گرم ملک یا سرزمین ہندوستان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب جو نظر پڑی تو دنیا ہی نئی تھی۔ گھاس پات، درخت سب دوسری طرح کے۔ جانوروں کی قسمیں مختلف، پرندوں کے پر نئی طرح کے۔ ایل ڈالوس"

(قبائل) کے اوضاع و اطوار بالکل نئے ـــــ غرض دیکھ کر حیرت ہوگئی اور تھی بھی حیرت کی بات"۔

ہندوستان سے واپسی میں یہ فوج ایسے ویران خشک پہاڑی ندیوں کے راستوں سے چلی جہاں گھوڑے گر گر کے مرجاتے تھے اور محض اتفاقی طوفانِ بارش پڑاؤ سے ان کی لاشیں بہا کر صاف کرتا تھا۔ تاہم اسی واپسی کے سفر میں پہاڑی بھیڑیں جمع کرتے ہیں ایک بڑی جھیل پر پہنچے جسے دیکھ کر بابر بہت خوش ہوا۔ لکھتا ہے کہ "ساکن پانی کی ایک عظیم چادر ہمارے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ پانی آسمان سے باتیں کرتا معلوم ہوتا تھا۔ اور بعید کناروں کے ٹیکرے اوندھے نظر آتے تھے جیسے سراب کے ٹیلے نظر آتے ہیں...... تھوڑی تھوڑی دیر میں پانی اور آسمان کے درمیان ایک سُرخ چیز دکھائی دیتی تھی جیسے دھوپ کا چمکارا کہ چمکا اور غائب ہوگیا۔ جب ہم زیادہ قریب گئے تو معلوم ہوا کہ" باغلان "قازدن" (لال لم ڈھینک؟) کے بڑے بڑے جھلڑ، دس بیس ہزار کے نہیں، بے شمار قازوں کے اُڑنے سے یہ کیفیت نظر آتی تھی۔ مگر یہاں صرف یہی قازیں نہ تھیں بلکہ اس پانی کے کنارے طرح طرح کے پرندے رہتے تھے کونوں اور کراڑوں میں ان کے ڈھیروں انڈے پڑے تھے"۔

افتادِ مزاج کے مطابق، اس سراب آسا آبِ ساکن سے بھی بابر اس وقت تک آگے نہیں گیا جب تک پوری طرح تحقیق نہ کرلیا کہ کون کون سے ندی نالے اس جھیل میں آکر گرتے ہیں اور وہ کتنی دیر چلتے اور کب خشک ہوجاتے ہیں۔ نیز یہ کہ جھیل سے آب پاشی کے بعد کتنا پانی اس قدرتی بند میں جمع رہتا ہے۔ اس کے تحریر کردہ کوائف کو پڑھیئے تو بین السطور آپ اندازہ کریں گے کہ لکھنے والا اس پہاڑی سرزمین "قابیل" کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے کام لینے پر اس لیے تُلا ہوا ہے کہ وہ اسے اپنا وطن سمجھتا ہے۔ فی الواقع تھوڑی ہی مدت میں ہم اسے کابل کا گرویدہ ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔

ایک فرماں روا کا کردار ابتدا ہی سے بابر نے اختیار کرلیا تھا۔ ملک کے دوسرے شہر غزنیں کو جہانگیر میرزا کی جاگیر میں دیا اور اپنے مقربین کو بڑی بڑی زمینداریاں عطا کیں۔ کابل میں اسے نذرانے اور تحائف زیادہ نہ ملتے تھے لیکن انھیں جب بھی قبول کرتا تو عوض میں کچھ نہ کچھ خود عنایت کرتا تھا۔ ملک کی کوئی گھاٹی مشکل سے ایسی ہوگی جس کا معائنہ نہ کیا ہو۔ پھر ہر موقع سے دربار منعقد کرنے کا کام لیتا تھا مثلاً ایسے موقع کے لیے بھی جب کہ جنگلی افغان قبائل اظہار اطاعت کرنے دانتوں میں تنکے لے کر حاضر ہوئے۔ اگر افغان قبیلوں نے اپنے پہاڑی سنگھڑوں (قلعوں) میں مقابلہ کیا تو بابر لازماً

مقتولوں کی کھوپڑیوں کا کلہ منار وہاں بنواتا کہ یادرہے۔ یہ چنگیزی مغول کی پرانی رسم تھی۔ بابر نے غالباً پہلی مرتبہ اس سے کابل آکر کام لیا۔ علی ہذا بارہا جنگ کے تمام قیدیوں کو رہا بھی کر دیا کہ جاہل عوام اس کی رحم دلی پر یقین لائیں۔ فرغانہ کے ددست دار پہاڑی قبائل بابر کو بادشاہ جائز جان کر اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ افغانوں کا یہ حال نہ تھا اور وہ ان سے ایک دفعہ بھی آموسے اپنے ہمراہ آنے والے رفیقوں کے اہل وعیال کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی غلّہ حاصل نہ کرسکا۔ اصل میں ان پہاڑی کھیتوں کی پیدا وار کا اس نے تخمینہ اونچا لگایا تھا اور یہ غلطی نقصان رساں ثابت ہوئی۔ چنانچہ آگے چل کر اقرار کرتا ہے کہ "میں نے جو مقدار طلب کی وہ بہت زیادہ تھی اور علاقے بھر کو تکلیف اُٹھانی پڑی"۔

حقیقتاً بابر خود کو حکمرانی کرنا سکھا رہا تھا۔ دس برس پہلے وہ ایک لڑکا تھا جو سمرقند کے آثار عظمت کو بچشمِ حیرت دیکھتا تھا اور جب سو دن کے لیے اس شہر کا حاکم ہوا تو دولتِ تیمور کی بحالی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہی لڑکا ملک بدر ہُوا تو چند رفیقوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا ہوا جدھر منہ اُٹھا چل پڑا۔ خدا پر بھروسہ تھا کہ سب کام بنا دے گا۔ اس کے سوا کچھ پروا نہ تھی کہ کدھر جانا ہے۔ یہ حقیقت اسے اب معلوم ہوئی کہ بادشاہ کہلانے کے کچھ معنی نہیں ہیں جب تک کہ ملک کے انسانوں پر اس کا قابو نہ ہو اور وہ ان کے بال بچوں کی خوراک کا بھی انتظام نہ کرے۔

یہ نیا اور عاقل تر بابر اب کسی نجومی رمّال کی سننے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ وہ اچھی طرح دل میں سرکھنے کے بعد باقی بیگ چغانی کی نصیحت پر عمل کرنے لگا۔ ہر شخص جو اس کے ہم رکاب چلتا، وہ اس کی قدر و قیمت جانچتا، اگرچہ اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔ وہ برابر گشت میں رہتا اور ارکِ کابل یا گل کنہ میں کبھی زیادہ مدّت راحت وآرام کے واسطے قیام نہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا ایک بہادر سوار دشمنوں کے تعاقب میں دریا اُتر گیا اور جب دیکھا کہ اور کوئی اس کے ساتھ نہیں تو ذرا ٹھٹکا مگر تنہا ہی دشمن پر جا پڑا۔ انھوں نے دو تین تیر چلائے پھر بھاگ نکلے۔ یہ محض بھپکی دے کے کام نکالنا تھا، یا زچ ہونے کے وقت اعلیٰ درجے کی مردانگی تھی؟ بابر اس کی مدح کا اظہار اور دل میں اسے ترقی دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسی زمانے میں باقی بیگ نے کابل اور حوالی میں محاصل راہ داری خود لینے شروع کیے۔ وہ جتنا قابل قدر، اتنا ہی گُھنّا آدمی تھا۔ کیا اس کا یہ فعل اپنی قوت کے وثوق پر تھا؟ بابر نے چند اور امرا کے ساتھ اسے حاجب نامزد کیا تو یہ بھی سوچا کہ دیکھیے اس نئے عہدے سے وہ کیا کام لیتا ہے؟ تھوڑی ہی مدّت میں

باقی بیگ نے اپنے دروازے پر نقارخانہ لگا یا کہ اس کی سواری باہر جائے تو نوبت بجائی جائے۔ حالانکہ یہ امتیاز بادشاہوں کے لیے مخصوص ہے۔ پھر باقی نے وہ حرکت کی جو کم سے کم بابر کی نظر میں ناقابل معافی تھی۔ اس کی ملکیت میں ہزارہا بھیڑ بکری مختلف چراگاہوں میں موجود تھی لیکن لشکرگاہ میں غذا کا قحط پڑا تو خستہ دِل بادشاہ کے اِس بھائی نے فقط پچاس بکریاں بھجوا دیں۔ بابر نے علانیہ کوئی مواخذہ نہیں کیا، لیکن اپنی سخت ناراضی کا اظہار ضرور کر دیا۔ اس پر باقی بیگ جو نخوت سے ہر موقع پر اپنے سبک دوش کر دیے جانے کا مطالبہ کیا کرتا تھا، اب بھی رخصت کا طلب گار رہا۔ بابر ہمیشہ اسے سمجھا بجھا کر ٹھیرالیا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ بلا تامل اجازت دی کہ چلا جائے۔ باقی بہت گھبرایا اور سراسیمہ ہو کر ایک وکیل کے ذریعے بادشاہ کو یاد دلایا کہ آپ نے میری نو خطائیں معاف کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ بھی چنگیز خانی رسم تھی کہ کسی سردار سے خوش ہو کر نو خطائیں معاف کرنے کا اقرار کیا جاتا تھا اور اتنی تعداد میں وہ جو بھی جرم کرتے، اس کی سزا نہ دی جاتی تھی (نو کا عدد مقدس سمجھا جاتا تھا) بابر نے اس کے جواب میں ملّا (بابا) کے ذریعے گیارہ خطائیں گنوادیں اور جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو وہ جملہ متعلقین کو لے کر دریا کے راستے خیبر روانہ ہو گیا۔ آگے اس قافلے پر یوسف زئی سردار نے گھات لگائی۔ باقی بیگ کو مار ڈالا اور اس کی بیوی کو بھگا لے گئے[1]۔ بابر لکھتا ہے کہ "میں نے تو اسے جانے کی رخصت دی اور کوئی بُرائی اس کے ساتھ نہیں کی لیکن خود اس کی بُرائی اس کے آگے آئی۔" ان الفاظ میں علی دوست کے لیے نوحے کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

بہرحال جلد یا بدیر اُن آزاد و خونخوار قبائل سے حساب چکانا تھا جو پہاڑیوں پر پھُنگوں کی طرح گشت لگاتے رہتے تھے اور جاڑوں میں عملاً ساری آمدرفت روک دیتے تھے۔ ان میں یوسف زئی، عیسیٰ خیل اور سب سے بڑھ کر ترکمان ہزارہ قبائل نمایاں تھے۔ آخرالذکر نے خود بابر کو ملک کے اندر آنے میں مدد دی تھی۔ ان کے ہاتھ سے بابر کا ایک معتمد علیہ مارا گیا تو اس نے عین وسطِ سرما میں ایک سبک پا جمعیت سے یکایک ان پر حملہ کر دیا۔ ان کا سرمائی پڑاؤ (بہ تصحیح مترجم) دادی حوش میں تھا جہاں سے اُنزا ترکے چھاپے مارنے اور اپنے آپ کو خوب محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ "اس جاڑے میں برف اتنی پڑی کہ گھوڑوں کے خوگیر تک آتی تھی۔ طلایہ کے سوار برف کی زیادتی کے باعث رات بھر گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہے۔ بابر نے پہرہ داروں کے لیے سخت قانون بنایا تھا کہ اگر کوئی رات کو سو جائے تو اس کے نتھنے چھید دیے

---

[1] فارسی تزک کی رو سے یہ واقعہ دریائے سندھ کے پار پیش آیا۔ مترجم۔

جاتے تھے "اُحوش کی وادی نئی طرح کی ہے۔ تقریباً ایک میل لمبا درہ طے کرنا پڑتا ہے جس کے اوپر اونچی اونچی چٹانیں اور نیچے کے رُخ پچاس ساٹھ گز (بہ تصحیح مترجم) گہرائی ہے۔ صرف ایک سوار کے چلنے کا راستہ ہے۔ درے سے گزر کر ہم عصر کی نماز کے وقت تک چلتے رہے اور پڑاؤ کرنے تک کوئی شخص ہمیں راستے میں نہیں ملا۔ ہزارہ کا ایک فربہ لدّو اونٹ ہاتھ آیا، اسے لا کر ذبح کیا اور کباب لگائے یہ اتنا بامزہ تھا کہ بعض لوگوں کو اس میں اور بکری کے کباب میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا، دوسری صبح سوار ہو کر ہزارہ کے قشلاق کی طرف چلے۔ ایک گھڑی گزرنے پر ہراول کا ایک سوار خبر لایا کہ ہزارہ نے ندی زنکاب کے گھاٹ پر تنگ جگہ میں ٹہنیاں گاڑ کر راستہ روک دیا ہے اور لڑ کر ہمارے آدمیوں کو گزرنے نہیں دیتے۔ برف اتنی گہری پڑی تھی کہ بٹیا کے سوا راستہ چلنا ممکن نہ تھا۔ ندی کے دونوں کنارے یخ بستہ ہو رہے تھے اور اسے وہیں سے عبور کیا جا سکتا تھا جہاں سے بٹیا اسے پار کرتی تھی۔ یہ سن کر میں نے تیزی سے قدم بڑھایا۔ دوسرے کنارے کی ڈھلان سے درختوں کی باڑ کے پیچھے سے ہزارہ پیادوں اور سواروں نے تیر برسائے۔ محمد علی نقیب میرا نوجوان سردار جسے لیاقت کی وجہ سے میں نے ترقی دی، باڑ پر بڑھا چلا گیا۔ زرہ پہنے ہوئے نہ تھا۔ اس کے پیٹ میں تیر لگا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ ہم میں سے اکثر جلدی میں بغیر زرہ پہنے آ گئے تھے۔ تیر سروں پر سے سنسناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہر بار (بہ تصحیح مترجم) یوسف بیگ گھبراتا اور چلّا کر مجھ سے کہتا تھا کہ یوں برہنہ تیروں میں کہاں گھسے جاتے ہو؟ میں نے کہا خوف نہ کرو، ایسے بہت تیر میرے سر پر سے گزر چکے ہیں۔"

"پھر قاسم بیگ نے جس کے سوار زرہ پوش تھے، دائیں طرف ندی اترنے کی جگہ تلاش کر لی اور پار ہوتے ہی حملہ کیا تو ہزارہ قائم نہ رہ سکے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمارے کچھ آدمیوں نے تیز تعاقب کیا۔ اور ان میں گھس کر کئی کو گھوڑے سے گرایا یا قتل کیا۔ اس کارنمایاں کے صلے میں قاسم بیگ کو ...... کا علاقہ دیا گیا..... نقیب (زنور بیگی) کا منصب قلی بابا کو عنایت ہوا جس نے بڑھ کر جنگ کی تھی۔ سلطان قلی چُناق تعاقب میں گیا تھا مگر اونچی برف کی پھسلن کے باعث صرف بٹیا پر چلنا ممکن تھا۔ میں بھی اوروں کے ساتھ چلا۔ ہزارہ کے قشلاق (سرمائی پڑاؤ) کے قریب بھیڑ بکری اور گھوڑوں کے گلے ملے۔ میں نے چار پانچ سو بکریاں اور کوئی بیس گھوڑے گھیرے۔ دو تین ذاتی ملازم بھی میرے ہمراہ تھے یہ پہلا موقع تھا کہ ایسی تاخت میں میں نے شرکت کی۔ ہمارے لشکری صدہا جانور پکڑ لائے۔ ہزارہا

عورتیں بچے برف پوش ڈھلانوں پر پیادہ پا اوپر چڑھے اور وہیں ٹھہر گئے۔ ہم نے پیچھا کرنے میں تساہل کیا اور دن چھپتا دیکھ کر واپس ہوئے اور انہی کی خالی جھونپڑیوں میں رات بسر کرنے کے لیے گھوڑوں سے اُتر پڑے واقعی ہمارے چار طرف برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔"

واپس ہوتے ہوئے لشکر والوں نے اُن لوگوں کا سراغ لگا لیا جنھوں نے پہلے سردار (نور بیگی) کو مارا تھا۔ یہ ایک کھو میں گھس رہے تھے۔ پتا چل گیا تو دھواں کر کے انھیں باہر نکالا اور قتل کرا دیا۔

ڈنڈے نہ ہوں تو پتھر سہی

ترکمان ہزارہ کو سخت سزا دینے کا مقصد پورا ہو گیا۔ ان پر تاخت کی کہانی پہاڑی پہاڑی ہر جگہ شائع ہوئی۔ آزاد قبائل، مغل، ترک یا افغان سب سمجھ گئے کہ شیر ڈرنے کے قابل فرماں روا ہے۔ بایں ہمہ خود بابر اتنے کثیر مواشی مل جانے کے باوجود اس تاخت سے کچھ بہت مطمئن نہ تھا۔ اس طرح حکومت کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ کسی شیبانی کے برابر بھی کامیاب نہیں ہوا۔

سردی کی طویل راتوں میں وہ اپنے نئے ملک کے حالات روزنامچے میں لکھتا رہا۔ موسم کی تعریفیں تو بہت کی تھیں لیکن یہ تحریریں پوستین کے لبادوں میں لپٹ کر، ہوا سے جھلملاتے تیل کے چراغ کی روشنی میں لکھی ہوتی تھیں۔ اسی تحریر کے وقت اسے غزنیں یاد آتا رہا جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسے جہانگیر کی جاگیر میں دیا تھا بلکہ وہاں کے اور حالات جیسا کہ لکھتا ہے:

" غزنیں میں کھیتی کرنا بہت محنت کا کام ہے۔ کیونکہ بہتر سے بہتر زمین میں بھی ہر سال نئی مٹی ڈالنی پڑتی ہے..... گرد و نواح میں ہزارہ اور افغان آباد ہیں۔ کابل کے مقابلے میں یہاں کی آمدنی کم ہے۔ لوگ صحیح العقیدہ حنفی مذہب کے ہیں اور بہت سے تین تین مہینے روزے رکھتے ہیں۔ ان کی عفیفہ عورتیں پوری پردہ نشین ہوتی ہیں۔ یہاں کے سب سے مشہور لوگوں میں ملّا عبدالرحمٰن ہوئے ہیں جو علم و فضل کے باوصف ہمیشہ طالب العلم رہے۔ سلاطین غزنوی کا بابر بار بار ذکر کرتا ہے۔" اسی شہر میں سلطان محمود کا مقبرہ ہے جسے روضہ کہتے ہیں اور جس کے باغ کے انگور سب جگہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ سلطان کے دوسرے جانشینوں کی بھی یہاں قبریں ہیں۔ (ریچ میں گزشتہ سال کی دادی سندھ میں اپنی تاخت اور آب ساکن کے راستے واپسی کا ذکر کر کے وہ پھر غزنیں کی شوکت رفتہ کو یاد کرتا ہے)۔۔۔ اب یہ بہت ادنیٰ شہر رہ گیا

ہے۔ حیرت ہے کہ ہندوستان اور خراسان جیسے ملکوں پر قبضہ ہونے کے باوجود ان بادشاہوں نے اسے پائے تخت منتخب کیا...... سلطان محمود غازی کے وقت میں (بہ تصحیح مترجم) یہاں پانی کے تین چار بند تھے۔ سب سے بڑا جو سلطان نے بنوایا تھا ایں پچاس گز کی بلندی پر تقریباً تین سو گز عریض تھا۔ ضرورت کے لائق یہاں پانی جمع ہوجاتا تھا۔ اب ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔"

جہاں غزنیں میں آب رسانی کا انتظام درست کرنے کی فکر تھی، وہاں سلطان کے عظیم کاموں کو بھی برابر یاد کرتا تھا جو ملّت اسلام کا آخری سچا مسلمان بادشاہ گزرا ہے کہ دنیا کی اس پوری اقلیم پر فرماں روائی کی...... پھر وہ شاہِ بزرگ ملک شاہ جس کی عمر خیّام جیسے فاضل ہیات داں نے ملازمت کی.... اور سلطان سنجر، ترکوں کا بہترین فرماں روا، دین دار متقی۔ ایک طرف فارسی بولنے والوں کی بستیوں کا محافظ اور دوسری طرف وحشی خانہ بدوشوں کے ریلے روکنے والا۔ یونس خاں والیٔ تاشقند اور بہت سے رشتہ دار چھوٹے چھوٹے رئیسوں کے خاتمے سے پہلے سنجر ہی ان بزرگ سلاطین کا آخری وارث تھا۔ بعد میں تو ہماری دنیا پارہ پارہ ہوگئی۔ لوگ ایک دوسرے کے دشمن غارت گر ہو گئے اور مزروعہ زمینوں پر تو سبھی گِدھوں کی طرح گرتے تھے۔" اس سلسلے میں بابر کا اپنا تصور یہی رہا کہ ملّتِ اسلامی کا واحد بادشاہ ہونا چاہیئے جو مساجد و مدارس اور مشتاقان علم کا سرپرست ہو۔ اس کا لقب اہمیت نہیں رکھتا۔ قدیم زمانے میں ایسے صاحب قوت شخص کو بادشاہ یا شہنشاہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بابر قندھار جاتے میں بیمار ہوگیا تھا۔ ابھی پورا تندرست نہ ہوا تھا کہ کابل میں سخت زلزلہ آیا۔ اس آفتِ ارضی کو اس نے کوئی بدشگونی نہیں سمجھا بلکہ بڑی دل چسپی سے کیفیت دیکھی اور قلم بند کی ہے:

"یہ ایسا زلزلہ تھا کہ قلعوں کی بہت سی فصیلیں پہاڑوں کی چوٹیاں، شہروں اور دیہات سبھی کے بہت سے مکانات زور سے ہلے اور زمین پر آ رہے۔ مکانوں اور بیوت کے منہدم ہونے سے بہت لوگ دب کر مرگئے۔ پمغان (تزک فارسی: لمغان) کے سارے گھر مسمار اور ستر اسی بھلے آدمی نیچے دب گئے۔ اس کے اور بک توت کے درمیان ایک قطعہ زمین، تیر کے پرتاب کے مساوی چوڑا، اکھڑ کر اس قدر دور جا پڑا۔ چشمے پھوٹ گئے۔ جگہ جگہ کوئیں بن گئے۔ استرغچ سے میدان تک ۳۰، ۴۰ میل کا

فاصلہ ہے۔ یہ زمین جا بہ جا ہاتھی کے برابر اونچی اور کہیں کہیں اسی قدر نیچی دھنس گئی۔ جگہ جگہ سے ایسی پھٹ گئی دبہ تصحیح) کہ اس میں کوئی نہ جا سکتا تھا۔ زلزلے کے وقت پہاڑ کی چوٹیوں پہ گرد کا بادل چھا گیا تھا۔ نوراللہ طنبورچی میرے پاس بیٹھا ساز بجا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ساز تھے، ایسا بے قابو ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ جہانگیر میرزا اُلغ بیگ کے بنائے ہوئے ایک مکان میں اوپر جھروکے پر تھا زمین نے ہلنا شروع کیا تو وہ نیچے کود پڑا۔ شکر ہے چوٹ نہیں آئی۔ لیکن یہ جھروکہ بھی اس کے ایک نوکر کے اوپر گرا۔ خدا کی قدرت تھی کہ اُسے بھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ اس روز ۳۳ مرتبہ زلزلہ آیا اور آیندہ مہینہ بھر تک زمین روزانہ دو تین مرتبہ جنبش میں آتی رہی۔ میں نے امرا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ قلعہ کابل کے شگاف اور دراڑوں کی مرمت کریں۔ ان کی محنت اور ہنر مندی سے ۲۰، ۳۰ دن میں پُوری مرمّت اور درستی ہو گئی۔

زلزلے اور اپنی بیماری کے باوجود اگلی بہار میں تیمور نے اپنی گشت جاری رکھی حتّٰی کہ پالکی میں ڈال کر لایا گیا اور بحالی صحت کی غرض سے کابل آ کر اپنے نئے چار باغ میں مقیم ہوا۔ یہاں دنبل پر چیرا لگا اور مُسہل دیے گئے۔ اسی میں بعض بُری خبریں آئیں۔ دریائے سندھ کی تاخت سے واپسی میں اسے بتایا گیا تھا کہ ناصر میرزا اس کا ساتھ چھوڑ کر چل دیا۔ یہ شہزادہ اپنی جمعیت لے کر دروں کے پار شمال کو گیا اور حیلہ یہ کیا کہ ازبکوں سے لڑنے جاتا ہوں۔ کوچ کرتا ہوا حصار بدخشاں تک چلا گیا۔ اب اسی طرح سے جہانگیر میرزا نے ہزارہ قبائل کے علاقے سے مغرب کی راہ لی۔ بعض دوست دار قبائل کو ملایا جو ازبکوں کی طرح تاخت تاراج کر رہے تھے اور ہرات کی جانب چل دیا۔ اتنی بات بابر کو پہلے معلوم ہوئی تھی کہ اس کے دو درباری اسے بابر کے خلاف ورغلاتے تھے۔ وہ آسانی سے لوگوں کے کہے میں آ جاتا تھا۔ بابر نے قاسم بیگ کو غزنیں بھیجا کہ جہانگیر کو مدد دے اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر نظر رکھے۔ اس نے واپس آ کر چار باغ میں خبر دی کہ بہکانے والوں کی سرگوشیوں کا مجھ سے انسداد نہ ہو سکا۔ وہ لوگ ذرا ذرا سی بات کو کچھ سے کچھ بنا کر جہانگیر کو آشفتہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً شہزادے نے بٹیر پر باز چھوڑا۔ وہ زمین پر گری اور باز اوپر سے جھپٹا۔ لوگ پکارے پکڑ لیا یا رہ گیا؟ قاسم بیگ کے منہ سے نکلا "پنجہ مار چکا ہے اب گرفت سے جانے نہ دے گا۔" جہانگیر سُن کے پریشان ہوا اور ندیموں نے یقین دلایا کہ شکاری آپ ہیں جسے قاسم گرفت سے جانے نہ دے گا۔

بابر کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ اسی خلجان کے زمانے میں فوری توجہ کے قابل دوسری خبریں

ملیں۔یعنی ازبکوں کا سایہ پھر ان ملکوں پر اس طرح پڑتا نظر آیا جیسے دانہ چگتی بیڑوں کے جھنڈ پر شکرا دور سے گرتا دکھائی دیتا ہے۔شیبانی خاں سال بھر تک بعید شمال میں اس شہر کا محاصرہ کیے رہا جس نے امیر تیمور کے زمانے سے اب تک بڑے بڑے حملوں کا مقابلہ کیا تھا۔یہ قدیم حصار آموکے دہانے پر جہاں وہ بڑی سمندر، بحیرہ ارال میں گرتا ہے، ریگستان اور مزروعہ اقطاع، یعنی صحرائی غارت گروں اور جنوبی وادی کے زراعت پیشہ لوگوں کے درمیان واقع تھا۔دور دور کے سوداگر یہاں آتے اور بڑے بڑے اہل علم یہاں ٹھکانا بناتے تھے۔ترک اسے اُرگنج کہتے تھے، عربوں میں خوارزم معروف تھا۔یہ نامی شہر دغا کے ذریعے شیبانی خاں کے ہاتھ آگیا۔ادھر سے فراغت پا کر اُزبک سمرقند کو پلٹے جیسے بھیڑیا اپنے بھٹ میں واپس آتا ہے اور اب خوارزم، اندجان، سمرقند، قندوز کی فتوحات کے بل پر، آل تیمور کے آخری نشانِ عظمت، ہرات پر فوج کشی کی تیاریاں کیں۔وہاں سے معمّر بادشاہ سلطان حسین میرزا نے اپنے بیٹوں کو ہرات طلب کیا اور اسی پرچم کے نیچے آنے کی عمر شیخ میرزا کے بیٹے بابر کو دعوت دی جسے تین مرتبہ مدد دینے سے انکار کر چکا تھا۔"خواب بین" (سلطان علی) کے بیٹے سیّد افضل نے چار باغ میں یہ پیام آکر دیا۔

بابر نے اس طلبی پر سوچ بچار تو کی، لیکن وہ شروع سے جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔لکھتا ہے کہ "ہمیں کئی لحاظ سے جانا واجب تھا؛ ایک بڑا بادشاہ جو تیمور کا جانشین ہے اپنی اولاد اور امرا کو طلب کرے تو شیبانی جیسے دشمن کے خلاف میرا جانا ضروری تھا۔دوسرے پاؤں پاؤں جائیں تو مجھے سر کے بل جانا چاہیے۔دوسروں کے ہاتھ میں ڈنڈے ہوں تو میں پتھر ہی لے کے جاؤں۔پھر جہانگیر میرزا بگڑ کر گیا تھا، لازم ہوا کہ یا تو اسے منایا جائے اور یا اس کی دشمنی کا تدارک کیا جائے۔"

بایں ہمہ اس یادگار سال (۱۵۰۶ء) کے موسم بہار میں بابر کو جانچ تول کر ہی قدم اُٹھانا تھا۔ اسے اپنے سازشی وزیر باقی بیگ سے تھوڑے دن پہلے نجات ملی اور جہانگیر میرزا کا دفع ہوجانا بھی غنیمت معلوم ہوا ہوگا۔اس کی نئی بے تمیز رعایا میں فی الجملہ نظم و انضباط پیدا ہوگیا تھا اور تھوڑی بہت اجناس خوردنی مل گئی تھیں۔قزاق مزاج قبائل کچھ عرصے کے لیے تو ضرور قابو میں آگئے تھے مگر دوسری طرف، ان دروں کے پار، جو سارے جاڑے مسدود رہتے تھے، پانسو میل دور ہرات جانا اور فوج کو ساتھ لے جانا، خطرے سے خالی نہ تھا خصوصاً جب کہ بازووں پر اُزبک لگے ہوئے تھے اور

صرف یہی میدانی فوج تھی جس پر بابر اعتماد کرسکتا تھا۔ (یہ بھی ظاہر ہے کہ ان خطروں کا سارا بوجھ بابر کو اٹھانا تھا) لیکن جہانگیر سے وہ دست بردار نہ ہوسکتا تھا۔ بوڑھے چچا کی استمداد کی درخواست کو رد نہ کرسکتا تھا اور نہ آوازۂ جنگ سننے کے بعد اس سے میدان میں نکلے بغیر رہا جاتا تھا۔ اسے آرزو تھی کہ اپنے دشمن اُزبک سے پھر رُو در رُو مقابلہ کرے۔ چنانچہ کابل وغزنیں کو بعض سن رسیدہ سرداروں کی نگرانی میں دے کر وہ خوشی خوشی اور دراصل سخت مصیبت جھیلنے، مغرب کی طرف چل پڑا۔

سفرِ خراسان

بابر نے جنوب کا کاروانی راستہ قندھار ہوکے اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے سیدھا مغرب کا رُخ کیا۔ شہر کے ۱۰ ہزار فیٹ طولانی درے سے نکل کر کوتل دندان شکن اور بدمزاج ہزارہ قوم کے علاقے کی طرف گھوم گیا۔ کچھ اُزبک جو قریب ہی آگئے تھے، انھیں قاسم بیگ نے مار کے دھکیل دیا۔ حسب معمول وہ چیدہ فوج اور تھوڑے سامان کے ساتھ تیز رفتاری سے راستے کے پہاڑی قبائل کو مرعوب کرتا ہوا جا رہا تھا۔ جہانگیر میرزا نے ایمانوں سے سپاہی بھرتی کرنے چاہے تھے اور بامیان کی پہاڑی پر بابر نے اسے جا لیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے پیچھے آنے والوں کو دیکھنے پلٹ کر آیا تھا۔ بابر کا عَلم اور اُلالا پہچان کر اُلٹے پاؤں پھرا اور اپنی لشکرگاہ کے خیمے تک چھوڑ کر چند رفیقوں سمیت جانب مغرب پہاڑیوں میں گھس گیا۔

بابر لکھتا ہے کہ "ان دنوں ملک بھر میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے جو کچھ زبردستی لے سکتا، لوٹ لیتا تھا۔ میرے آدمیوں نے بھی زمیں داروں اور خانہ بدوش ٹولیوں میں اسی طرح کی لوٹ مار کی"

شمال مغرب میں تین دن کی مسافت پر آمو کے پار شیبانی خاں سرحدی شہر بلخ کا (باختر کی حسین وادی کے وسط میں) محاصرہ کر رہا تھا۔ بابر بڑھے چلا گیا۔ رات کی فرصت میں سلطان حسین میرزا کی زندگی کے واقعات لکھتا رہا۔ پھر ہرات سے اس کی (مرنے کی) خبر آئی تو ان یادداشتوں پر نظر ثانی کرکے دوبارہ مرتب کیا۔ آل تیمور کے آخری فرماں روا کا یہ ایک یادگار (مرگ نامہ رؔوقیہ) ہے۔

" سلطان حسین میرزا بایقرا ۸۴۲ھ ہجری (۱۴۳۸ء) میں بہ مقام ہری (ہرات) پیدا ہوا۔

اس کی ماں دلشاد بیگم[1] بھی امیر تیمور کی پوتی (پر پوتی) تھی اس طرح وہ نجیب الطرفین، خاندانی بادشاہ تھا۔ اس کی آنکھیں بھچی ہوئی جسم کی ساخت شیر جیسی یعنی سینہ چوڑا، کمر پتلی تھی۔ بڑھاپے میں بھی جب کہ سر کے بال سفید ہو گئے تھے، سرخ و سبز ریشم کا رنگین لباس پہنتا تھا۔ سر پر عموماً پوست برہ کی ٹوپی یا چوڑی باڑ کی کلپاک ہوتی لیکن عیدین کے دن تین پیچ دے کے دستار باندھ لیتا اور اس میں سرخاب کے پر کی کلغی لگا کر نماز کو جاتا تھا۔ ہرات کی بادشاہی اسے ملی تو شروع میں سوجھی کہ اپنے نام کی بجائے دوازدہ امام کے ناموں کا خطبہ پڑھوائے۔ لیکن میر علی شیر اور بعض دیگر اشخاص نے اس ارادے سے باز رکھا اور پھر سب ضروری کام وہ اہل سنت والجماعت کے طریق پر کرانے لگا۔ وجع المفاصل کی وجہ سے نماز میں رکوع نہ کر سکتا تھا۔ باتونی، خوش طبع، زود حس آدمی تھا اور اسی مزاج کے مطابق گفتگو تھی۔ شریعت کا نہایت پابند تھا اور ایک مرتبہ اس کے بیٹے نے کسی کو مار ڈالا تو اس نے بیٹے کو مقتول کے ورثا کے حوالے کر کے قاضی کی عدالت میں بھیج دیا۔ تخت نشینی کے ۶، ۷ سال تک شراب سے مجتنب رہا، لیکن پھر اس عادتِ بد میں مبتلا ہو گیا۔ مگر ظہر سے پہلے نہ پیتا تھا لیکن ظہر کے بعد روزانہ پینے لگا۔ اور اسی طرح اس کے بیٹوں اور فوج والوں نے پینی شروع کی اور عیاشی اور بدکاری کرنے لگے۔

حسین میرزا جری اور بہادر آدمی تھا۔ بارہا خود تلوار لے کے میدان جنگ میں لڑا اور شمشیر زنی میں کوئی تیموری شہزادہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا۔ اسے شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور اپنے تخلص حسینی سے دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کے اکثر اشعار کچھ بُرے نہیں ہیں لیکن پورا دیوان ایک ہی بحر میں لکھا ہے اتنے بڑے ملک کا فرماں روا ہونے کے باوجود ادنیٰ آدمیوں کی طرح لڑائی کے مینڈھے پالتا، کبوتر اُڑاتا، مرغ لڑایا کرتا تھا۔ اپنی چپاولی جنگ کے زمانے میں رود گرگاں (بحر خزر کے قریب ایک ندی) کو تیر کے پار ہوا اور ایک اُزبک ٹکڑی کو اچھی مار لگائی۔ سلطان (بہ تصحیح) ابوسعید میرزا نے تین ہزار سپاہی اس پر شبخون مارنے کے لیے بھیجے تھے وہ صرف ساٹھ جوانوں سے ان پر جا پڑا اور ان کی خوب خبر لی۔ یہ اس کا سب سے نمایاں جنگی کارنامہ تھا...... اس کی حکومت خراسان میں تھی جس کے مشرق میں بلخ، مغرب میں (بہ تصحیح مترجم) بسطام و دامغان، شمال میں خوارزم، جنوب میں قندھار و سیستان ہیں۔ ہرات جیسا شہر اس کے ہاتھ آ گیا تو پھر دن رات عیش و عشرت

---

[1] انگریزی میں HAPPY PRINCESS؛ فارسی تزک میں فیروزہ بیگم نام لکھا ہے۔ مترجم۔

کے سوا اسے کوئی کام نہ رہا۔ اسی طرح اس کے ملازمین لہو ولعب اور خرافات میں مشغول ہو گئے یہی سبب ہوا کہ اس نے جنگ آرائی کی مشقت اور فوج کشی کی زحمت اٹھانی چھوڑ دی اور نتیجتہً اس کی مملکت اور فوجی جمعیت میں برابر کمی ہوتی گئی، کوئی اضافہ نہ ہوا۔"

یہ سطور لکھتے وقت بابر کو ضرور یہ تلخ بات یاد آئی ہو گی کہ اس کے چچا نے وادی آمو میں بابر سے اس وقت بھی تعاون نہیں کیا جب کہ حکومت خراسان میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی۔ مگر حسین میرزا کی خامیاں گنوانے کے ساتھ وہ اس کے بہادرانہ کارناموں کی جو خود بابر کے کاموں سے مشابہ تھے، ستائش میں کمی نہیں کرتا۔ اور میرزا کے تذکرے کو اس کی جملہ آل اولاد، بارہ لڑکیوں کے حالات سے جو زندہ تھیں، پھر اس کے عمائد دربار اور اہل علم و فن کے ذکر سے طول دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک جگہ اس کی بدمزاج بیوی (بیگہ سلطان) کی نسبت اپنی رائے بھی شامل کر دی ہے:

" اس کی پہلی بیوی .... بدیع الزمان کی ماں تھی (بدیع الزمان سب سے بڑا بیٹا تھا اگرچہ سب سے چاہیتا مظفر تھا) وہ مزاج کی ایسی خراب تھی کہ حسین میرزا کو نہایت آزار دیتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ تنگ آکر اسے طلاق دی اور چھٹکارا حاصل کیا۔ اس کے سوا چارہ کیا تھا۔ میرزا حق پر تھا۔ بقول سعدیؒ

"زنِ بد درسرائے مردِ نکو
ہم دریں عالم است دوزخ اُو"

معلوم نہیں یہ کلمات لکھتے وقت بابر کو عائشہ یا اپنی کوئی اور بیوی یاد آئی؟ عورت کے متعلق یہ ترش ترین الفاظ ہیں جو اس کے قلم سے نکلے۔ اس کے ساتھ تو سوائے ایک کے اور کسی عورت نے بے وفائی نہیں کی۔ یہ بھی واضح رہے کہ حسین میرزا کا یہ حیات نامہ آل تیمور پر بابر کی الوداعی تحریر ہے۔ ان شہزادوں کی نسبت جو دیں دار، خونی، شرابی، فنونِ لطیفہ کے دل دادہ، منصب شاہی کے آرزومند اور ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے تھے، یہ اس کی آخری تحریر تھی۔ بابر پہاڑوں کے حصار سے بیچ دار دریا کی وادی میں اُدھر جا رہا تھا۔ جہاں اسے چچا سے مل جانا تھا مگر اسے دیر ہو گئی اور "ذی الحجہ (مئی) کے مہینے میں سلطان حسین میرزا شیبانی خاں سے مقابلے کے لیے فوج لے کر باب آہنی کے مقام تک آیا تھا کہ عالم بقا کی طرف رخصت ہوا۔" پھر بھی بابر نے ہرات کا سفر جاری رکھا۔

باب چہارم

شرابِ دل

شیر کی مہمانی ہوتی ہے

۱۵۰۶ء کی خزاں کے اواخر میں بابر ہرات کے لشکروں کے مقام تک پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سارا میدان زربفت کا تھان معلوم ہوتا تھا۔ دریائے مرغاب کے کناروں پر ایک سے ایک قیمتی خیموں کا سلسلہ چلا جاتا تھا۔ ان کی گہما گہمی دیکھ کر کسی جشن کا گمان ہوتا تھا۔ جس طرح انگلستان کے ایک نوجوان بادشاہ پر ایک اور تاریخی میدان میں گزری تھی، بابر اپنے چار طرف یہ شان و شوکت دیکھ کر جو خود اس کے ادنیٰ ساز و سامان پر طعنہ زن تھی، دنگ رہ گیا۔ وہ سالہا سال مشقت انگیز میدانی معرکے جھیل کر آرہا تھا لہٰذا عظیم شامیانوں کے نیچے عیش و طرب کے درباروں میں داخل ہونا اور بھی عجیب معلوم ہوتا تھا اور اس کا پہلا تاثر یہ ہوا کہ یہاں سخت پریشان ہنگامہ گرم ہے۔

اس نے دور دراز مقامات، مقدس مشہد اور قدیم مرو کے امرا کے پرچم لہراتے دیکھے۔ وحشی ترکمان سرداروں کے سیاہ لبادے مشاہدہ کیے اور اپنے بھائی جہانگیر میرزا کو بھی دیکھا کہ خوف زدہ سا دبکا بیٹھا ہے۔ نوکروں کا ہجوم تھا۔ نقیب بابر کی آمد کی نوید پکارتے پھرتے تھے۔ ملاقات کے آداب طے کیے جارہے تھے کہ مرحوم حسین میرزا کے فرزند اکبر کے سامنے وہ کہاں تک بڑھے گا اور کس جگہ آداب بجالائے گا۔ اس کے گرد مجمع اتنا ہوگیا تھا کہ بعض درباریوں کے پاؤں کئی قدم تک اوپر ہی اٹھتے رہے اور بعض جو باہر جانا چاہتے تھے بالا ہی بالا اندر لے آئے گئے۔ بابر کی نظر اس تلاطم میں بھی ایک ایک بات دیکھ رہی تھی۔ شاہی قالینوں پر چل کر وہ بارگاہ کے اندر آیا جس میں پردے کھینچ کر کئی گوشے الگ کے لیے تیار کیے گئے تھے اور حسب مراتب ان کے لیے الگ الگ دسترخوان پر شربت، برف، فواکہ چنے

تھے۔ بابر قاسم بیگ کی معیت میں اس جگہ جسے وہ شاہی "دیوان خانہ" کہتا ہے، صدر کی طرف بڑھا جہاں مرحوم بادشاہ کے فرزند اس کے منتظر تھے :۔

یہ بات طے ہو گئی تھی کہ پہلے میں جھکوں گا اور پھر بڑا شہزادہ تعظیماً مسند کے کنارے تک بڑھے گا۔ میں نے آداب کیا اور بے توقف آگے چلا مگر اس شہزادے [بدیع الزمان (مترجم)] نے اٹھنے میں ذرا دیر لگائی۔ قاسم بیگ دیکھ رہا تھا۔ میری توقیر میں ہی اس کی عزت تھی۔ اس نے میرا پٹکا کھینچا۔ میں سمجھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تاکہ ٹھیک جگہ پر ہی ملاقات ہو...... ہر چند یہ کوئی جلسہ نہ تھا مگر ملازمین طرح طرح کے کباب اور مشروبات سونے چاندی کے پیالوں میں لائے۔

ہمارے بزرگ چنگیز خانی آداب و عادات کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ ان کے درباروں، ضیافتوں اور نشست و برخاست کے طریقوں میں کوئی بات ان پرانے آداب کے خلاف نہ کی جاتی تھی۔ یہ قاعدے کوئی قرآن حدیث کے احکام نہ تھے کہ جس کی پابندی فرض ہو۔ تاہم جن لوگوں کو ورثے میں ملے انہیں برتنے میں کچھ برائی نہیں۔ بلکہ ہر شخص کو ایسے ضابطوں کو اختیار کرنا چاہیئے۔ البتہ باپ دادا کی کوئی رسم بری ہو تو اولاد پر لازم ہے کہ اسے بدل دے"

چنگیز خاں اعظم کے قواعد پر بابر کی اپنے دل سے یہ باتیں اس کے ذہنی خلجان کی عجیب طرح غمازی کرتی ہیں۔ چنگیزی قوانین پر خود اس نے کبھی عمل نہیں کیا۔ بلکہ لڑکپن سے قانون شریعت ہی کا پابند رہا۔ اپنے مرحوم ماموؤں کے ہاں خاص مغلی طرز کا فوجی مظاہرہ اور قدیم رسوم دیکھ کر وہ منغض ہو گیا تھا۔ لیکن اب اپنے عم زاد شہزادوں کی پر تکلف "صحبت" میں بھی بیگانگی سی محسوس کرنے لگا۔ صحرائی پڑاؤوں میں نیم فاقہ کشی کی زندگی مغل خانہ بدوشوں کا اصلی ورثہ تھا جو اسے ملا۔ علیٰ ہذا شکار اور میدان جنگ میں وہ مغول ہی کے سخت آئین کو ذہن میں رکھتا تھا۔ ہرات کے شہزادوں کو ظاہر ہے کہ یہ چیزیں یاد نہ تھیں۔

دوسری ملاقات میں بڑے بھائی بدیع الزماں نے تعظیم کرنے میں کچھ کمی کی تو بابر نے فوراً ناگواری ظاہر کی۔ سن رسیدہ حسین میرزا کی وفات کے بعد وہ اپنے خیال میں باقی ماندہ تمام تیموریوں کی سرداری کا حقدار ہو گیا تھا۔ اس نے بلاتاخیر اپنے دو امیروں کو میزبان کے پاس بھیج کر یہ پیام دیا : بابر اگرچہ عمر میں چھوٹا ہے (وہ اس وقت ۲۳ سال کا تھا) لیکن سمرقند کے لیے دو دفعہ لڑا اور اپنے بزرگوں کا تخت واپس لے چکا ہے۔ خاندان کی خاطر بیرونی دشمن سے اس کی معرکہ آرائیاں موجب اعزاز و امتیاز

ہوئی ہیں۔ چنانچہ پھر بدیع الزمان خاطر تواضع سے پیش آیا اور دھوم دھام سے اس کی دعوت کی صورت میں اس کا اظہار کیا۔ بابر اعتراف کرتا ہے کہ یہ مجلس فی الواقع نہایت آراستہ اور پُر تکلف تھی۔ نماز ظہر کے بعد سے شروع ہوئی۔ میں اُن دنوں شراب نہیں پیتا تھا...... اور جب انھیں یہ معلوم ہُوا تو انھوں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ شراب کے ساتھ ہر قسم کی گزک، مُرغ اور قاز کے کباب خوانوں میں لگائے گئے۔ ایک بار میرزا مظفر حسین کی محفلِ شراب میں دریائے مرغاب کے کنارے جانا ہُوا حسین علی جلائر اور میر بدر بھی وہاں موجود تھے۔ بدر نے چھک کر پی تو پھر خوب ناچا۔ یہ ناچ اسی کی ایجاد تھا۔

شیر کو یہ راگ رنگ کے جلسے پسند آئے۔ اپنی عُمر میں ایسے ماہرانہ رقص نہ دیکھے تھے نہ موسیقی کی یہ الحان سُنی تھیں۔ شراب کے دَور میں الگ بیٹھے بیٹھے اس کا بھی جی للچایا کہ اس ممنوع مشروب سے لطف اندوز ہو اور اس کے ہیجان انگیز خواص پر غور کرنے لگا ۔۔۔ کھانے میں قاز کو کاٹنے میں اس سے غلطی ہوئی تو بدیع الزمان نے ازراہِ تواضع چُھری لے کر سبک دستی سے خود قاشیں تراش دیں۔

ان لطف اندوزیوں کے باوجود بابر شکوک سے خالی نہ تھا۔ ملک خراسان کے یہ والی تین مہینے سے مجتمع ہو رہے تھے۔ مگر ایک دوسرے کی ضیافتوں کے سوائے کوئی کام ان سے بن نہ آیا تھا۔ بدیع الزمان اور مظفر دونوں کی صحبت خوش گوار اور وہ دعوتیں کھلانی خوب جانتے تھے لیکن جنگ کی تیاری بالکل نہیں کی حقیقت میں وہ تدابیر حرب سے ناواقف اور جنگ یا مصائب سے ناآشنا تھے۔ وہ جلسے اور ضیافتیں ہی کرتے رہے، وہاں شیبانی خان کے سامنے بلخ نے ہتیار ڈال دیے ازبک سواروں کی تاختیں مرغاب کی نواح میں میرزاؤں کے لشکرگاہ سے چالیس میل فاصلے پر ہونے لگیں۔ ان صاحبوں سے اتنا بھی انتظام نہ ہو سکا کہ ایک رسالہ بھیج کر ان غارتگروں کو بھگا دیتے۔ بابر نے اس کام کی اجازت چاہی تھی مگر میزبان میرزاؤں نے غالباً اس خوف سے انکار کر دیا کہ بابر کی جنگی شہرت میں اضافہ ہو گا۔[1]

شیبانی کو ہرات کے لشکروں کا پورا علم تھا، ادھر جاڑا سر پر آ گیا۔ لہٰذا دہ چپ چاپ اپنے مضبوط حصار سمرقند میں چلا آیا۔ اس دانش مند فاتح نے سارا (یورپ) کے جاڑے کی سرگزشت

---

[1] تزک میں بابر نے لکھا ہے کہ شرم کی وجہ سے مجھے اجازت نہ دی۔ مترجم۔

تو کبھی نہ سنی ہو گی لیکن اس کی عین خوشی تھی کہ برفانی طوفانوں کا موسم ان اتحادی لشکروں کو پراگندہ کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس بھیج دے۔ باہمی مشاورت سے میرزاؤں نے یہی فیصلہ بھی کیا۔ انھوں نے بابر سے بھی اپنے لشکر سمیت ہرات چلنے اور کچھ روز وہاں ٹھیرنے پر اصرار کیا۔

بابر نے حسب معمول دل میں مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اگر برف نے درے نہ روک دیے ہوں اور کوئی بغاوت بھی سدّ راہ نہ ہو تو بھی کابل ایک مہینے سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ دوسری طرف اندیشہ تھا کہ وہاں اس کے رشتہ داروں نے کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دیا ہو اور بیرونی اضلاع میں اسے اپنی نئی رعایا، ترک، مغل، افغان، ہزارہ نیز سرحد کے جرائم پیشہ وحشی قبائل کے فسادات کا خطرہ تھا۔

"نظر برایں میں نے میرزاؤں سے معذرت کی مگر انھوں نے کوئی عذر نہ سُنا۔ گھوڑوں پر سوار میرے خیموں میں آئے اور مصر ہوئے کہ سردیاں یہیں گزاروں ــــ شاہی رُتبے کے لوگ بذات خود ٹھیرنے کی درخواست کریں تو پھر انکار کرنا محال ہو گیا۔ دوسرے شہر ہرات کو جس نے سلطان حسین میرزا کے زمانے میں وہ ترقی کی کہ آباد دنیا میں بے نظیر ہو گیا، اسے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔"

اربابِ علم و فضل

اگر نکولو مکیاولی ہرات آتا، جہاں اس کے کسی ہم عصر فرنگی کے قدم نہیں پہنچے، تو وہ یہ اجتماع ضدّین دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ عین سیاسی زوال کے زمانے میں وہاں علم و فن کا عروج ہو رہا ہے حقیقت میں ہَرَی رود کے کنارے کا یہ شہر ایشیا کا فلورنس تھا۔ معلومات کے جویا بابر نے بیس دن یہاں پھر کر اپنی پیاس بجھائی۔

ہرات اور دوسرے شہروں میں ایک فرق تھا کہ تیموری محاربات کے بعد یہ از سرِ نو تعمیر ہُوا اور سو برس تک یہاں (اگرچہ مخدوش) امن امان قائم رہا اور اسی لیے حسین میرزا بایقرا کے عہد میں پندرھویں صدی عیسوی کی "نہضت تیموریہ" کا یہی شہر مرکز بن گیا۔ اس کے جنگی استحکامات سے بڑھ کر ادبیات نے شہرت پائی۔ قریب ہی ایک پارسی آتش کدے اور ایک نسطوری کلیسا کے آثار تھے۔ بارونق منڈی کے سرے پر بڑی مسجد جامع بلند تھی۔ شاہی محل شہر کے باہر لہلہاتے باغوں، تاکستانوں رہٹ کے کنوؤں کے سلسلے میں ایک ٹیکرے کے اوپر بنا ہوا تھا۔ بابر کے ذہن میں نئے نئے منظر ے

بھی بڑے بڑے علما اور ذی شان مشاہیر کی یادگار تھے۔ اس حرکت اور توانائی کے دور میں علم صرف کتابی معلومات حاصل کر لینے کا نام نہ تھا بلکہ معبود حقیقی سے تعلق کی معرفت اور حقیقت کی تلاش کو علم کہتے تھے۔ صوفی درویشوں کے مرشدِ کبیر مولانا رومیؒ نے ایک عاشق صادق اور بہ تصحیح مترجم، موسیٰ کے قصے میں اللہ تعالیٰ کا قول تحریر کیا ہے کہ میں ظاہری الفاظ اور قال کو نہیں دیکھتا۔ دل کی سچی تڑپ چاہتا ہوں۔" دوسری جگہ سالک روحانی وارفتگی میں پکارتا ہے کہ میں جماد کی صورت میں تھا، مر کر نبات ہوا۔ نبات سے حیوان اور پھر انسان بنا۔ جب مروں گا تو آیندہ ملکوتی زندگی پاؤں گا اور ملکوتی کے آگے وہ مرتبہ پا جاؤں گا جسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی، یعنی فنا، فنا فی اللہ"[1]

اس تصوّف میں مسیحی عقائد کا سراغ ملتا ہے۔ عمر شیخ میرزا حضرت رومی کے یہ اشعار پڑھ کر جھومتا تھا مگر سمجھتا نہیں تھا۔ خود بابر جامیؒ کا گرویدہ رہا جنھوں نے سُنّی عقائد تصوّف کی زبان میں بیان کیے ہیں۔ ان کا بابر کے ورود سے پانچ ہی سال پہلے ہرات میں انتقال ہوا تھا۔ وہ اپنی نوبت پر قطب الاقطاب خواجہ عبیداللہ احرارؒ سے کسب فیض کرتے ہیں جو بابر کے بھی روحانی مرشد تھے۔ اپنی تلاش و جستجو میں جامیؒ نے "ہفت اورنگ" اور مثنوی "یوسف زلیخا" کی تمثیلات اور افسانے کے پیرائے میں اپنے افکار بیان کیے ہیں۔ بابر انھیں تعریف سے مستغنی بتا کر محض تبرّکاً اُن کا نام نامی اپنی کتاب میں لایا ہے۔

معلوم ہوتا ہے ہرات کے مصوّر پُرانی روایات سے، جو اسلامی ملکوں میں ہمیشہ بہت قوی رہیں، آزاد ہو گئے تھے۔ وہاں کے نقّاشوں نے اس حد تک جسارت کی کہ عالمِ آخرت کی تصویر میں فرشتوں کی صورتیں بنائیں جو کنارے کی نیل گوں فضا میں آتشیں دکھائی گئی ہیں۔ حالانکہ چہروں کی تصویر راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مدّت دراز سے ممنوع تھی۔ انھی میں بہزاد تھا جسے زمانہ حاضرہ میں اوّل درجے کا مصوّر مانا گیا ہے وہ تاثری تصاویر میں بھی مرقع نگاری کی طرح باریکی سے نقاشی کرتا ہے۔ پس منظر کی زمین ہمیشہ خاص معیاری ہوتی ہے جس میں قدرتی اشکال اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس نے گھوڑوں کی حیرت انگیز تصویریں بنائی ہیں اور ان کے رنگ، قرمزی، سیاہ، سفید تک پس منظر کے عین مناسب

---

[1] مصنف نے مولانا رومیؒ کے ان مشہور افکار کو (قصّہ شبان و موسیٰ و جماد کا ارتقا) اپنی سمجھ کے موافق بیان کیا ہے۔ ہم نے خفیف تبدیلی کے ساتھ بجنسہٖ ترجمہ کر دیا۔ مترجم۔

دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے بہزاد کی استادی میں یوآن اور منگ خاندانوں کے چینی فن سے استفادے کا دخل ہو۔ اکثر اوقات یہ نقاشیاں صرف کسی کتاب کی آرائش کے لیے کی جاتی تھیں۔ کیونکہ ہرات کے نگار خانوں میں جو مجلّدات تیار ہوئے ان میں نقاشی، تذہیب اور خطّاطی تینوں فنون کے باکمال اساتذہ کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ایک ایک کتاب کی تیاری میں اکثر کئی سال لگ جاتے تھے۔ خصوصاً کلام اللہ کو جمیل ترین شکل میں پیش کرنے کے لیے قرآن مجید کا ہر نسخہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا جاتا تھا۔ پھر تاریخ کی کتابیں تھیں، جو اسلامی جوش کے ساتھ لکھی گئی ہیں جیسے علی یزدی کا "ظفر نامہ" امیر تیمور میر خواند کی "روضۃ الصّفا" جس کا تکملہ اس کے پوتے خواندمیر نے لکھا اور وہ اُن دنوں حیات تھا۔ مزید برآں موسیقی میں نئی نئی الحان (نقوش) نکالی جاتی تھیں، فن تعمیر کے استاد نئے نئے اسالیب سوچتے۔ کوزہ گر عجیب عجیب صناعیاں کر رہے تھے۔

یورپ میں لفظ "ہسٹری" (تاریخ) ابھی تک پوری طرح رائج بھی نہیں ہوا تھا جب کہ خراسان میں عالمی افکار کے لوگ اس موضوع پر کام کر رہے تھے۔ خود فرماں روا، سلطان حسین میرزا ہر قسم کے علم و فن کا ذوق رکھتا تھا۔ اگرچہ بابر یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی تصنیفات میں کچھ کمی رہ جاتی تھی۔ وہ بطور خاص حسین میرزا کے شہرہ آفاق وزیر علی شیر نوائی کے نو تعمیر مقبرے پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھی میر علی شیر تصنیف و تالیف میں زندگی بسر کرنی چاہتا تھا، مجبوراً وزارت پر آمادہ ہوا تو بھی نقاشی، ترتیب وقائع اور خصوصیت سے مذہبی رنگ کی شاعری کے لیے وقت نکال کر، وزارت میں تضیع اوقات کی تلافی کر لیتا تھا۔ اس نے بیشتر اپنی ملکی زبان ترکی میں، نوائی تخلص سے شعر کہے اور اسے فارسی پر ترجیح دی۔ یہ رہ نمایانہ اقدام وہی امتیاز رکھتا ہے جیسا یورپ کے احیائے علوم کے ابتدائی دور میں لاطینی کی بجائے عام لومبارڈی زبان میں تصنیف کرنے کو حاصل ہوا۔ بابر کو اس بات سے بہت ہی توی دل چسپی تھی کیونکہ وہ خود بھی اپنی کتاب، چغتائی ترکی میں لکھ رہا تھا۔ اگرچہ شعر گوئی کے لیے ترکی اور فارسی دونوں سے کام لیتا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ "واقع میں علی شیر بے نظیر شخص تھا وہ سلطان حسین میرزا کا وزیر اتنا نہ تھا جتنا اس کا مصاحب و ہم نشیں تھا۔ ترکی زبان میں اتنا کچھ اور ایسا اچھا کسی نے نہیں لکھا جتنا اس نے تصنیف کیا۔ فارسی میں پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اس میں بعض اشعار بُرے نہیں ہیں۔ اگرچہ اکثر ادنیٰ درجے کے ہیں۔ مولانا جامیؒ کی طرز پر ایک انشا کی کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں

کچھ خطوط اوروں کے جمع کیے اور کچھ خود لکھے ہیں تاکہ ہر قسم کے پڑھنے والوں کو اپنی ضرورت کے مطابق خط کا نمونہ مل جائے۔ اس نے آزادرہ کر مجرّد زندگی بسر کی۔ بیوی بچّے آل اولاد کچھ نہ تھی" (شاید رہبانیت پسند تھا) ہرات کی گردشیں لگانے میں بابر کو ایک لطیفہ بہت پسند آیا۔ جس میں علی شیر پر چوٹ تھی۔ ہرات کے ایک معمولی شاعر (ملّا) بنائی کو علی شیر طعنے دیا کرتا تھا کہ وہ موسیقی نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ یہ امیر ہرات سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس فرصت میں بنائی نے موسیقی کے رموز تک سیکھے بلکہ خود نئی لحنیں (نقش) بھی نکالیں۔ علی شیر واپس آیا تو بنائی نے خود اپنا تیار کیا ہُوا گیت اس خوبی سے سنایا کہ وہ دنگ رہ گیا۔ پھر بھی ان میں چھیڑ چھاڑ چلتی رہی۔" ایک روز شطرنج کھیلنے میں علی شیر نے ٹانگ پھیلائی تو وہ بنائی کے کولھے کو چھو گئی۔ (حسب معمول یہ لوگ قالین پر چارزانو بیٹھے تھے) علی شیر نے ازراہِ تمسخر کہا "ہرات میں بڑی آفت یہ ہے کہ ٹانگ بھی پھیلاؤ تو کسی شاعر کی کُون میں جا لگے گی۔" بنائی نے کہا "اور پیچھے کھینچو تو بھی اسی مقام پر پہنچے گی۔"

" زبان طعن کی تیزی کی بدولت بنائی کو ہرات سے نکلنا پڑا۔ ان دنوں علی شیر نے بہت سی نئی چیزیں ایجاد کی تھیں اور دوسروں کی ایجادوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ پھر بہت لوگوں نے از خود کوئی نئی بات یا وضع نکالی تو شہرت کے لیے اسے" علی شیری" کہنے لگتے تھے۔ اس کی بے سوچے سمجھے تقلید کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ کان میں درد ہونے کے باعث اس نے سر کے گرد رومال لپیٹ لیا تھا۔ لوگوں نے خواہی نخواہی اسی طرح رومال لپیٹنا شروع کر دیا اور اسے تازہ ترین" علی شیری" طرز مشہور کر دیا۔ بنائی جب ہرات سے جانے لگا تو ایک خاص وضع کا پالان سواری کے گدھے کے لیے بنوایا اور (اس پر سوار ہوکر) کہا سب سے نیا" علی شیری" یہ ہے! چنانچہ "علی شیری پالان" ہر جگہ مروّج ہو گیا۔"

صبح کے اوقات میں بابر ہرات کی عمارات کی اچھی طرح سیر اور تحقیقات کرتا پھرتا تھا۔ مدارس، مقابر، خانقاہیں، کاریزیں، مچھلیوں کے تالاب، رصدگاہیں۔ اگرچہ ان کی ایسی مفصل کیفیت نہیں لکھی جیسی سمرقند کے مشہور مقامات کی۔ اپنی قیام گاہ صرف علی شیر کا سابقہ مکان تحریر کیا ہے۔ اس کے شوق کا اصل مرجع صاحبان علم و فن، یا وہ درویش ہیں جنھیں ان کی سیاحت کے دوران ٹھیرا کر مہمان رکھا جاتا تھا یا عمدہ حافظے کے لوگ جنھیں ماضی کی روایات رواں تھیں اور آخر میں" علوم دنیا" کے جاننے والے کیونکہ اعلی علوم دین کی تعبیر و تشریح کی شاخوں سے مختص تھے۔ بہرحال، بابر کا بہت دل چاہتا تھا کہ علم وفضل کی انھی صحبتوں میں زندگی گزار دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بطور بادشاہ کے جو دو بادشاہ بھائیوں کا

مہمان تھا، اسے اپنا قیام کچھ بہت اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ ان بھائیوں میں بڑا بدیع الزمان متلوّن مزاج اور مظفّر کے مقابلے میں اپنی کمتری کا بھی احساس رکھتا تھا۔ مظفّر، سلطان حسین میرزا کی چاہیتی اور چہاتی ہوئی بیوی خدیجہ بیگم کے بطن سے زیادہ ہر دل عزیز شہزادہ تھا۔ ادھر بابر کو اپنے مرگسار بے چین بھائی جہانگیر کی بھی دیکھ بھال رکھنی پڑتی تھی۔ شکّی مزاج ہراتی درباریوں میں پھونک پھونک کے قدم اٹھانا ہوتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ ان جلسوں میں شراب پینے کو بہت جی چاہنے لگا تھا۔ لکھتا ہے کہ:

"مظفّر حسین میرزا نے باغ سفید میں میری دعوت کی۔ کھانا ختم ہوا اور دستر خوان بڑھایا جا چکا تو خدیجہ بیگم ہم دونوں کو بارہ دری میں جس کا نام طرب خانہ تھا، لے گئی۔ باغ کے وسط میں یہ چھوٹا سا مکان بہت پُر فضا بنا ہوا ہے۔.... ایوان کے ہر پہلو کی دیوار پر ابوسعید میرزا نے اپنے محاربات کی تصویریں بنوائی ہیں (ابوسعید آخری تیموری فرماں روا تھا جس کے زمانے تک زوال پذیر سلطنت کا کچھ نہ کچھ حلیہ باقی تھا) طرب خانہ میں بزم شراب آراستہ ہوئی۔ شمالی شہ نشین کی ایک مسند پر میں اور مظفر میرزا، دوسری پر سلطان مسعود اور جہانگیر بیٹھے۔ مہمان ہونے کی وجہ سے مجھے میرزا نے صدر میں بٹھایا۔ ساقیوں نے جام بھر بھر کے حاضرین کو دیے اور سبھی نے مئے ناب کو آب حیات کی طرح پینا شروع کیا۔ جب سر در گٹھا تو وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ مجھے بھی شریک دَور کیا جائے۔ میں نے اس وقت تک شراب نہیں پی تھی۔ اور اچھی طرح مخمور ہونے کی کیفیت سے واقف نہ تھا۔ اس جلسے میں سخت آرزو مند ہوا کہ یہ ندّی پار کی جائے۔ لڑکپن میں کبھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ کبھی خود میرے والد نے کہا بھی تو میں نے عذر کیا اور اس گناہ سے محفوظ رہا۔ والد کی وفات کے بعد خواجہ قاضی کی خبر گیری کی وجہ سے محترز رہا۔ مشتبہ کھانے تک سے پرہیز کرتا تھا گویا کہ شراب حرام کو ہاتھ لگاتا؟ بعد میں جوانی کی خواہش نفسانی مجھے اس طرف ترغیب دینے لگی۔ لیکن کسی دوسرے نے پلانے پر اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ میری دلی خواہش کسی پر ظاہر نہیں ہوئی تھی، اب اس محفل میں آیا کہ شاہزادے سرہو رہے ہیں، ہرات جیسے شہر میں نہ پیوں گا تو اور کہاں پیوں گا؟ چنانچہ یہ سوچ کر قصد کر لیا کہ جب دونوں شہزادے مل کر تقاضا کریں گے تو پینی شروع کر دوں گا۔

اس جلسے کے گویّوں میں حافظ حاجی نے خوب گایا۔ ہرات کے لوگ دھیمے سروں میں، نزاکت سے گاتے ہیں۔ جہانگیر میرزا کے ہمراہ بھی ایک سمرقند کا گویّا میر جان نامی تھا جو ہمیشہ اونچی، سامع

خراش آواز سے گاتا اور بے سُرا ہو جاتا تھا۔ جہانگیر نے نشے میں گرما کر اسے گانے کا حکم دیا۔ وہ گایا تو سہی مگر بہت بے مزہ بے ڈھنگا گایا۔ سننے والوں میں کسی نے تو کان بند کر لیے کسی نے ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن اہل خراسان تمیز دار لوگ ہیں اور جہانگیر میرزا کے پاس خاطر سے کسی نے اسے گانے سے روکنے کی جسارت نہیں کی۔

نماز مغرب کے بعد ہم طرب خانہ سے اُٹھ کر مظفر میرزا کے سرمائی مکان میں آئے۔ یہاں اس کا کوکہ یوسف علی نشۂ شراب کی مستی میں کھڑے ہو کے ناچنے لگا۔ فن داں تھا، اچھا ناچا۔ مظفر میرزا نے تلوار کی مرصّع پیٹی، برہ پوستین اور ایک خب چاقی مجھے عنایت کیا۔ جانک نے گانا سنایا اور مظفر میرزا کے دو غلام چھوٹا چاند (کچک مہ) اور بڑا چاند (کتہ مہ) متوالے بن کر فحش نقلیں کرنے لگے رات گئے تک محفل گرم رہی رات کو میں اسی مکان میں سویا۔

قاسم بیگ نے جو سنا کہ مجھ سے شراب پینے پر اصرار کیا گیا تھا تو مظفر میرزا کے پاس آدمی بھیج کر صاف صاف لفظوں میں تنبیہ کی۔ لیکن اب بڑے بھائی بدیع الزمان نے اس دعوت کی خبر سن کر باغ میں میری، مصاحبوں اور فوجی سرداروں سمیت دعوت کی۔ یہاں جو لوگ میرے سامنے بیٹھے وہ میرے لحاظ سے علانیہ شراب نہ پیتے تھے۔ کبھی میری توجہ ہٹا کر کبھی ہاتھ کی آڑ لے کر چسکی لگا لیتے۔ حالانکہ یہاں میری طرف سے انھیں اجازت تھی کیونکہ دعوت ایسے شخص کی طرف سے تھی جسے میں اپنا برادر بزرگ سمجھتا تھا۔"

ہمارا شیرہرات میں شراب خانہ خراب سے تو بچ گیا لیکن ایک عورت کی زد سے نہ بچ سکا۔ بڑی شہزادیوں سے ایک دفعہ ملنے آیا تو وہاں اس کی ایک چھوٹی عم زاد بہن معصومہ سلطان بھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی (بہ تصحیح مترجم) بابر کی طبیعت ادھر مائل ہوئی اور اس نے بڑی بیگموں کو اس سے شادی کا پیغام بھیجا، قرار پایا کہ بابر کے جانے کے بعد لڑکی اپنی ماں کے ساتھ کابل بھیج دی جائے گی۔

بیس دن تک شبانہ روز سیر اور عیش و عشرت کے جلسوں کا لطف اُٹھانے کے بعد، بابر نے پھر ایک دم رائے قائم کی:

"یہ لوگ مجھ سے کہتے تھے، قشلاق (سرما گزاری) یہاں کرو لیکن میرے یا میرے ساتھیوں کے لیے قشلاق کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا نہ کسی مکان کا انتظام کیا۔ ادھر سردی شروع ہو گئی۔ میرے اور کابل کے درمیان پہاڑوں پر برف گرنے لگی۔ کابل کی طرف سے مجھے فکر بڑھنے لگا مگر زبان سے

کہہ نہ سکا لہٰذا سرمائی مقام (قشلاق) کی تلاش کا حیلہ کر کے ہرات سے چل پڑا (یہ ۲۴ دسمبر ۱۵۰۶ء کا دن تھا) اس طرح کوچ کرنے کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے کچھ اہلِ لشکر بکھر گئے۔ بعض لوگ تو تھوڑے وقفے سے چل کر آ ملے بعض نے ہرات کے عیش کدوں سے نکلنا پسند نہ کیا۔

طوفان شدّت پر تھا

تقدیر کی خرابی سے قاسم بیگ مشرق میں دروں کے غلط راستے سے لے چلا۔ سن رسیدہ قاسم اور نوجوان بابر میں اب نہایت عزیزانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ "قاسم بیگ نے مصائب میں صرف ایک دفعہ ساتھ چھوڑا اور خسرو شاہ کی پناہ لی جسے بعد میں بابر نے بے تامل معاف کر دیا۔ لکھتا ہے کہ وہ "نہایت وفادار، بہادر، راسخ العقیدہ دین دار مسلمان تھا۔ مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرتا تھا۔ اگرچہ اسے لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا لیکن بہت ذہین، حاضر جواب خوش طبع شخص تھا۔"
اس کی رہنمائی میں اب کے قندھار کا بہت پھیر کا راستہ جو آبادواد یوں میں سے گزرتا تھا چھوڑ کر سیدھے جنوب کی طرف چلے۔ پہاڑوں پر دیران علاقہ ملا۔ ادھر برف باری شروع ہوئی جو بعض اوقات گھوڑے کی رکابوں تک اونچی پڑتی تھی۔ ایک بوڑھے راہبر کو ساتھ لیا تھا۔ وہ تازہ برف باری میں بٹیا بھول گیا۔ لشکر کے سرداروں نے جہاں آگ جلانے کا ایندھن پایا وہاں پڑاؤ لگانے کا فیصلہ کیا اور ہرکارے دوڑائے کہ کچھ مقامی لوگوں کو ڈھونڈ کر پکڑ لائیں اور سامان خوردنی بھی فراہم کریں یہ ٹولیاں تین دن تک واپس نہ آئیں۔ بابر ان کے انتظار میں پڑاؤ سے آگے نہیں بڑھا۔ چوتھے دن ہرکارے واپس آئے اور نہ کوئی رسد لائے، نہ کوئی آدمی انھیں مل سکا۔ ناچار اسی بڈھے رہبر کو لے کر لشکر آگے چلا۔ گھوڑے تھک گئے، سواروں کو سخت تکلیف ہوتی اور جتنا چلے اتنے ہی زیادہ اونچے پہاڑ انھیں گھیرنے کو سامنے آتے گئے۔ بابر کو ہرات کا عیش و آرام یاد آیا۔ دل بہلانے کو اس نے گردشِ تقدیر کے موضوع پر ایک نظم لکھی۔

"ہم ایک ہفتے تک چلتے رہے۔ برف کو کاٹتے، کھودتے ہوئے چل رہے تھے کہ سواروں کے لیے راستہ نکل آئے لیکن کوس ڈیڑھ کوس روزانہ سے زیادہ طے نہ کر سکتے تھے۔ قاسم بیگ اصرار کر کے اس راستے لایا تھا۔ لہٰذا اب وہ اور اس کے بیٹے برف کاٹنے میں آگے آگے ہوتے

تھے۔ دس پندرہ ملازموں کے ساتھ میں بھی برف کاٹتا تھا۔ ہم گھوڑے سے اتر کر سات آٹھ قدم تک کھدائی
کرتے۔ کمر کمر بلکہ کبھی سینے تک برف میں دھنسے ہوئے ہوتے تھے۔ چند قدم راستہ کھود لیتے اگلے تھک
جاتے تو پچھلے ان کی جگہ لے کر کھدائی کرتے۔ گھوڑوں کو کھینچ کھینچ کر آگے چلانا پڑتا تھا۔ ان کے پیٹ
تک برف ہوتی اور وہ دس پندرہ قدم گھسٹ گھسٹ کر چلنے میں رہ جاتے۔ بہت سے اچھے اچھے
سپاہی اور سردار کھدائی میں حصہ نہ لیتے تھے۔ جب راستہ صاف ہو جاتا تو سر جھکائے چلے آتے تھے۔
کسی کو تکلیف یا حکم احکام دینے کا وقت نہ تھا۔ ہر شخص کی مرضی پر موقوف تھا کہ ہمت ہو تو خود
آئے اور اس کام میں ہاتھ بٹائے۔ تین روز میں اس مقام عذاب سے نکل کر کوتل زرّیں کے نیچے
ایک کھو "خوال" تک پہنچے جسے یہاں والے "مبارک خوال" موسوم کرتے تھے۔ اس روز طوفان شدید
اور زمہریری ہوا ایسی تیز چلی کہ ہر شخص کو جان کے لالے پڑ گئے۔ طوفان کی عین شدت میں کھو کے منہ پر پہنچے
گھوڑوں سے اترے۔ اب گہری برف اور پتلی سی پگڈنڈیا پر ایک ہی آدمی چل سکتا تھا۔ گھوڑوں کے لیے
اور بھی خطرہ۔ پھر سال کا سب سے چھوٹا دن کہ تھوڑی ہی دیر میں شام ہو گئی۔ مغرب کے وقت اندھیرا
ہونے تک لوگ آتے رہے اور پھر کھو میں جہاں تک گئے وہیں اتر پڑے کہ دن نکلنے کا انتظار کریں۔
کھو چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک بیلچہ لے کر اتنی جگہ سے برف کاٹی کہ نمدہ بچھا کر بیٹھ سکوں۔
پھر بھی زمین تک نہیں صاف کر سکا۔ البتہ ہوا سے بچاؤ ہو گیا۔ کئی آدمیوں نے پکار پکار کر کہا کہ آپ اندر
چلے جائیں مگر میرا جی نہ چاہا کہ خود گرم اور محفوظ جگہ میں رہوں اور باقی سب باہر تکلیف اٹھائیں۔
یہ مروت و رفاقت کے خلاف بات تھی۔ جو اوروں پر گزرے وہی مجھے سہنا چاہیے۔ فارسی مثل
کے مطابق "مرگ با یاراں عید است" میں وہیں بیٹھا رہا (بہ تصحیح مترجم) عشا کے وقت اتنی برف پڑی
کہ میرے سر، کمر اور کانوں پر کئی کئی انگل جم گئی۔ رات میرے کانوں میں ٹھر بیٹھ گئی۔
اتنے میں کچھ لوگ جو اندر گھسے تھے، پکارے کہ یہ کھو بہت لمبی اور سب کے لیے اس میں جگہ ہے۔
یہ سن کر میں اٹھا اور منہ اور سر پر سے برف کی تہ جھاڑ کر دوسروں کو آواز دی اور اندر چلا۔ حقیقت
میں ساٹھ آدمیوں کی جگہ موجود تھی۔ خشک گوشت، ستو وغیرہ جو چیز کھانے کی کسی کے پاس تھی وہ
اس نے پیش کی۔ اس طرح سردی اور زحمت سے بچ کر ہم گرم، آرام کی جگہ پہنچ گئے اور کھانا بھی مل گیا۔
دوسری صبح برف باری اور تیز ہوا رکی اور ہم سویرے سے برف کاٹتے چلے کہ اوپر درے تک پہنچ

جائیں۔ صحیح راستہ جو بھول گئے تھے، پہاڑ کے گرد سے پھیر کھا کے درے تک آتا تھا جسے کوتل زرّیں کہتے ہیں۔ اسے اختیار کرنے کی بجائے ہم سیدھے گھاٹی کی تلہٹی سے چلے اور درے کے دہانے تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ دن چھپ گیا۔ جہاں تھے، رات وہیں گھاٹی کے حلق میں گزاری۔ سردی نہایت کی تھی۔ بڑی تکلیف اٹھائی (بہ تصحیح مترجم) کتہ بیگ اور آپہی کے دونوں پاؤں اور سیبون ؤک ترکمان کے دونوں ہاتھوں کو جاڑا مار گیا۔ فجر ہوتے ہی ہم خدا پر بھروسہ کر کے آگے چلے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اصلی راستہ یہ نہیں ہے۔ اونچی اونچی سلامی دار چٹانوں پر چڑھنا پڑا اور جگہ جگہ ٹھوکریں کھا کے گرے۔ بارے عشا کی نماز کے وقت سے کچھ پہلے گھاٹی سے باہر نکل آئے۔ یہاں کے کسی بڑے بوڑھے کی یاد میں اتنی گہری برف کے زمانے میں کوئی شخص اس درے سے نہیں پار ہوا تھا۔ بلکہ اس بات کا کوئی دل میں خیال تک نہ لا سکتا تھا۔ ہر چند برف نے ان چند روز میں سخت آزار دیا پھر بھی اسی اونچی برف کی بدولت ہم پار نکلنے کے بھی قابل ہوئے۔ کیونکہ وہ اتنی اونچی نہ ہوتی تو بغیر راستے کے ان ڈھلانوں پر نہ چڑھ سکتے تھے اور نہ گہرے گڑھوں کو عبور کرنا ممکن ہوتا۔

نماز عشا کے وقت ہم موضع یک اولانگ آکے گھوڑوں سے اترے۔ گاؤں والوں نے ہمیں پہاڑ سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً اپنے گرم گھر ہمارے لیے خالی کیے۔ مجرب بکریاں پکائیں۔ گھوڑوں کو دانہ گھانس کھلایا۔ آگ کے لیے ایندھن اور اپلوں کا ڈھیر لگا دیا۔ دل کھول کے مہمان داری کی۔ اس خوفناک سردی اور برف سے بچ کر گاؤں کے گرم مکانوں میں آنے اور اچھی غذا اور آرام پانے کا مزہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں سخت مشقت اور مصیبت کے بعد ایسی راحت نصیب ہوئی ہو۔ اس گاؤں میں ہم نے فراغت و مسرت سے ایک دن قیام کیا۔ دوسرے دن عید رمضان تھی۔ پھر بامیان کے راستے درہ شبہر (؟) کو پار کر کے جگدلک (یا جنگلک) کے قریب منزل کی۔

بابر کی جمعیت اب کابل کے مغرب میں شارع عام یا کہنا چاہیے کہ ٹھیک بیٹیا پر آگئی تھی جیسا اس نے لکھا، برف کے تودوں نے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر انھیں طوفان سے سلامت نکل آنے میں مدد دی۔ یعنی ان تودوں کو کاٹنے، کھودنے کی محنت نے جسم کی حرارت قائم رکھی اور سرزمین کے گڑھوں کو بھی پاٹ دیا۔ یہ لوگ ایسے جفاکش سوار تھے کہ برف کے طوفانوں میں، برف کاٹ کاٹ کر ایسے گوشے بنا لیتے تھے جس میں آڑ سے کر تھوڑی بہت نیند بھی لے لیتے اور وہ اور ان کے جانور کئی کئی دن

برائے نام خوراک ہی پر چلتے رہتے اور برف چبا کر پیاس بجھا لیتے تھے۔ البتہ پالا مار جانے کا خوف تھا بابر اپنے بھائی جہانگیر کی کمزوریاں بیان کرنے میں ہمیشہ سکوت سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے یہ تحریر نہیں کیا کہ وہ بیمار ہوا اور پالکی میں لایا جا رہا تھا۔ پھر آرام کی جگہ اسے چھوڑ کر بابر کو جلد کابل جانا پڑا۔ لیکن جہانگیر کچھ روز بعد اسی قیام میں فوت ہو گیا۔

کھلا راستہ غوربند کی چوڑی گھاٹی میں سے گزرتا تھا۔ بابر کے قراولوں کو معلوم ہوا کہ اُن کے آگے ہزارہ کے ایک گروہ کا پڑاؤ ہے اور وہ لوگ مسافروں پر چھاپے مارتے ہیں۔ بظاہر یہ لوگ اپنے قشلاق چھوڑ کر قزاقی کے لیے ادھر آ گئے تھے۔ انھیں گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کا بادشاہ اور اس کے جنگ آزمودہ سردار بلند دروں سے اُتر کر آ رہے ہیں جنھیں برف سے مسدود سمجھا جاتا تھا۔ "ترکمان ہزارہ بیوی بچوں سمیت ہمارے راستے میں سرما گزاری (قشلاق) کر رہے تھے۔ دوسری صبح ہم ان کے ڈیروں اور مویشی خانوں میں گھسے اور خود بھی کچھ لوٹ مار کی۔ وہ بیوی بچوں کو لے کے بھاگے۔ ڈیرے، خیمے اور سب سامان چھوڑ گئے۔ اتنے میں آگے سے خبر آئی کہ ہزارہ تیر اندازوں نے ایک تنگ مقام روک رکھا ہے کسی کو گزرنے نہیں دیتے۔ میں بہ عجلت آگے بڑھا۔ ایسی کوئی تنگ گھاٹی نہ تھی مگر ایک ٹیکرے پر کچھ ہزارہ ہوشیار ہوئے بیٹھے تیر چلا رہے تھے۔ میں نے ملازمین کو تنبیہ کی اور کہا کہ ایسے موقع پر نوکر کام آنے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ نہ اس لیے کہ ہر جگہ آقا کو بھڑا دیں۔ پھر سب کے آگے ہو لیا۔ ہزارے جلدی سے نکل بھاگے۔ ان کی چند بکریاں ہم نے بھی گھیریں ...... ۱۴، ۱۵ لٹیرے جوان گرفتار کر لیے گئے تھے۔ میں انھیں اگلی منزل پر عذاب دے کے قتل کرا دینا چاہتا تھا کہ دوسرے رہزنوں کو سبق ہو۔ لیکن قاسم بیگ کا ادھر سے گزر ہوا اور اس نے بے موقع رحم کھا کے انھیں جانے دیا۔ پھر مجھے بھی یہی کرنا پڑا اور باقی سب قیدیوں کو رہائی دے دی۔ انھی ہزارہ پر تاختوں میں (کابل سے) ہمیں خبریں ملیں۔"

بے وفا اقربا اور وفادار سپاہی

بابر کو ہرات میں جو اندیشے تھے وہ اس کے اپنے محل (کابل) میں پیش آئے۔ درد ں کے بار غیر حاضری میں یہ افواہ کابل میں اُڑ گئی یا عمداً بنا کر مشتہر کی گئی کہ ہرات کے دونوں شہزادوں نے اسے (بابر کو) قید کر لیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر بابر کے دو خطاب یافتہ عزیزوں نے اجیر مغلوں کی، جو لوٹ مار کے ایسے

موقعوں کی تاک میں رہتے تھے، ایک جمعیت تیار کر لی اور قلعۂ کابل کا محاصرہ کرنے بڑھ رہے تھے جس کی حفاظت کے لیے وہ تھوڑے سے سپاہی چھوڑ گیا تھا حسبِ معمول جس وقت وہ اپنے سیر سپاٹوں میں مصروف تھا۔ یہاں اس کا تخت شاہی ہتھیا لینے کی سازش ہو رہی تھی۔ بابر کے لیے یہ غیر متوقع نہ ہو تو بھی حق یہ ہے ایسی سازشوں کا قلع قمع کرنا اسے کبھی نہ آیا۔ سازش کا سب سے ناگوار پہلو یہ تھا کہ وہ ان عزیزوں نے پکائی جنھیں سمرقند اور تاشقند کی تباہیوں سے نجات دلا کر بابر نے پناہ دی تھی۔ اہل سازش کے پس پشت ایک عورت کا چھپا چھپا چہرہ تھا۔ یہ یونس خاں کی آخری اور بارعب بیوی شاہ بیگم اور اس کی بیٹی چھتا بیگم بابر کی سوتیلی نانا تھیں۔ اسی کے بیٹے خان میرزا (بہ تصحیح مترجم) لاغری کو بابر کی بجائے تخت کابل کا انھوں نے حق دار بنایا۔ ان کی تائید نہیں تو کم سے کم چشم پوشی کرنے میں بابر کا سسرالی عزیز حسین دوغلات شامل تھا۔ خان میرزا چار باغ کے ٹیکرے سے باغیوں کو حکم احکام دے رہا تھا۔ قلعے میں صرف دو چھوٹے درجے کے سردار، ایک تورچی (سلاح دار) اور ایک عالم (ملا بابا)، تھے جنھوں نے مدافعت کی تیاری کی۔

ضرورت کے وقت بے تحاشا کام کرنا بابر کی عادت میں داخل تھا۔ اس خبر کے سنتے ہی ہزارہ کا پیچھا چھوڑ کر وہ فوراً جتنے آدمی سامنے تھے، انھی کو لے کر کابل چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح یکایک اس کا آپڑنا دشمن کے ہاتھ پاؤں پھلا دے گا کیونکہ انھیں اس کی آمد کا علم نہ تھا۔ اسی خیال سے بابر نے جوکھوں مول لینے میں مضائقہ نہیں کیا۔ لیکن کوئی شک نہیں کہ اپنے عزیزوں کی بے وفائی سے اسے دلی صدمہ ہوا۔ اگلے واقعات بھی کچھ اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی شخص ایک منحوس خواب دیکھ رہا ہو۔

"میں نے قاسم بیگ کے نوکر کو قلعے کے سرداروں کے پاس بھیجا، اپنے آنے اور آیندہ منصوبے کی سب کیفیت سے انھیں اطلاع دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہم غوربند گھاٹی کے سرے سے نکلتے ہی دشمن پر ایکا ایکی جا پڑیں گے۔ کوہ منار سے گزرتے ہی آگ جلا کے تمھیں خبر دے دیں گے۔ اُدھر سے تم قلعے کے پرانے برج پر آگ جلانا تاکہ ہم سمجھ جائیں کہ تمھیں خبر ہو گئی ہے۔ ہم ادھر سے براہ راست حملہ کریں گے۔ تم اندر سے نکل کر حملہ کرنا جس قدر ہو سکے اس میں کمی نہ کرنا۔ دوسرے دن غوربند سے چل کر ہم ایک گاؤں میں اترے۔ اگلی صبح چل کر غوربند کے نالے سے گزرے اور پل پر گھوڑوں کو پانی پلایا۔ ظہر کے وقت ستا کر آگے چلے تو جس قدر بڑھے، زیادہ گہری برف پڑی ہوئی ملی پھر سردی اتنی شدید کہ پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آئی تھی۔ کوہ منار سے گزر کر ہم نے ڈھلان پر گھوڑوں سے اتر

کر آگ جلا کر بدن تاپا۔ مقررہ نشانی کی آگ جلانے کا ابھی وقت نہیں تھا مگر ٹھنڈ نے ہمیں عاجز کر دیا تھا۔۔۔۔
اس پہاڑی اور کابل کے درمیان گھوڑوں کے گھٹنوں گھٹنوں تک برف تھی اور کنارے اتنے سخت یخ بستہ کہ بیٹھا
چھوڑ کر بھی نہیں چل سکتے تھے۔ صرف ایک کے پیچھے ایک سوار چل رہا تھا، بارے بلا اطلاع ہوئے کابل
تک آ گئے اور قلعے کے اوپر آگ چمکتی دیکھ کر سمجھ گئے کہ ہمارے سردار انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔ اُن دنوں
اُلغ بیگ کے باغیچے میں ایک لنگر خانہ بنا ہوا تھا۔ درخت وغیرہ تو باقی نہیں رہے تھے۔ البتہ احاطے کی
دیوار سلامت تھی۔ خان میرزا اسی میں مقیم تھا۔ میں ایک گھرے ہوئے راستے سے ادھر چلا۔ ابھی اس کے عقبی
قبرستان تک گیا تھا کہ سامنے سے چار سوار واپس آئے۔ یہ باغیچے میں پہلے دوڑ گئے تھے۔ خان میرزا
خوف زدہ ہو کے نکل گیا۔ ان چاروں نے تیر و تلوار کے زخم کھائے۔ جواب میں ہاتھ چلائے اور پسپا ہو کے
میرے پاس آئے۔ یہاں ہمارے اور سوار بھی جمع ہو گئے۔ بھیڑ کی وجہ سے آگے جانا یا پیچھے پلٹنا محال
ہو گیا۔ میں نے قریب والوں سے کہا۔ گھوڑوں سے اترو اور اندر گھس جاؤ۔ میرے کتاب دار
محمد علی اور اس کے چند ساتھیوں نے فوراً حملہ کیا جس سے دشمن بھاگ نکلے۔ ہمارے قلعے کے
آدمیوں نے پہنچنے میں دیر لگائی۔ پھر ایک ایک دو دو کر کے آئے۔۔۔۔۔ ایک کو ہمراہ لے کر میں خان میرزا
کی تلاش میں چار باغ گیا مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ واپسی میں دوست نامی پیادہ جسے میں ترقی دے
کر کابل میں چھوڑ گیا تھا، پل پر ملا۔ ننگی تلوار لے کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے جلیبہ (زرہ) پہن رکھا تھا لیکن
سر پہ دو بلغہ (فولادی خود) نہ تھا۔ شاید سردی اور برف باری نے میری صورت بدل دی تھی۔
اور یا گھبراہٹ کی وجہ سے اس نے مجھے نہ پہچانا۔ میں چلایا "ہے دوست، ہے دوست" لیکن اس نے
میرے کھلے بازو پر تلوار ماری۔ محض خدا کی رحمت سے میں بال بال بچ گیا۔

یہاں سے ہم حسین میرزا دوغلات کی تلاش میں بہشت باغ گئے مگر وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا۔ باغ
کی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں سات آٹھ آدمی لڑنے کے لیے کھڑے تھے۔ میں نے گھوڑا
ڈپٹایا تو وہ پلٹ کر بھاگے۔ ایک کے میں نے جھپٹ کر تلوار ماری اور وہ اس طرح سر کے بل گرا کہ
میں سمجھا اس کا سر اڑ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خان میرزا کا کوکہ تھا اور میری تلوار اس کے شانے
پہ پڑی تھی۔

حسین میرزا کے مکان کے دروازے پر ایک مغل نے چھت کی کمین گاہ سے میرے چہرے کا نشانہ

باندھ کر کمان کھینچی۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ پہلے میرا نوکر تھا۔ لوگ چلائے "بائیں، بائیں۔ بادشاہ۔ بادشاہ!"
اس نے شست بدل کر تیر پھینکا اور بھاگا۔ تیر مارنے کا موقع بھی کیا تھا۔ میرزا اور اس کے سردار بھگا دیے
یا پکڑ لیے جا چکے تھے۔ یہیں لوگ گلے میں رسّی ڈال کر سلطان سنجر برلاس کو میرے پاس لائے۔ میں نے
اسے بڑی جاگیر دی تھی۔ مگر یہ بھی بغاوت میں شریک ہو گیا وہ مضطربانہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "میرا کیا قصور
ہے۔ میرا کیا قصور ہے؟" میں نے کہا "تمھارا صاف تصور یہ ہے کہ اس ٹولی کی چشم پوشی سے تمھیں
بری رہنا چاہیے تھا!" مگر چونکہ وہ شاہ بیگم کا بھانجا تھا میں نے لوگوں سے کہا "اسے ذلیل کر کے
اس طرح کشاں کشاں نہ لاؤ۔ اسے موت کی سزا نہیں دی گئی ہے"۔

قلعہ کے ایک سردار کو تھوڑے سے عسکریوں کے ساتھ خان میرزا کی تلاش میں بھیج کر، خود میں شاہ بیگم
اور مہر نگار (چغتائی) خانم سے ملنے چلا۔ وہ باغ بہشت میں ایک خیمے کے اندر ٹھیری ہوئی تھیں۔ شہر
کے بلوائی چاروں طرف لوٹ مار مچاتے پھرتے تھے۔ میں نے اپنے آدمی بھیجے کہ اُن شُہدوں کو بھگا
کر دفع کریں۔

شاہ بیگم اور خانم ایک ہی خیمے میں بیٹھی تھیں۔ میں حسب معمول فاصلے سے تعظیماً گھوڑے سے اُترا
اور اسی طرح ادب آداب سے ملا جیسے پہلے ملحوظ رکھتا تھا۔ باتیں کرنے لگا۔ مگر وہ بہت گھبرائی ہوئی،
شرمندہ تھیں۔ مجھ سے اُنھوں نے خیر و عافیت تک نہ پوچھی اور نہ کوئی معقول عذر معذرت کر سکیں۔
[بغاوت کے سرغنہ کی یہ نانی اور ماں یہ معقول حیلہ پیش کر سکتی تھیں کہ بابر کے ہرات میں قید کر لیے جانے کی
خبر سُن کر ہم نے ایک ممتاز تیموری شہزادے کو نیا بتاً حکومت کابل سنبھالے رکھنے کی کوشش کرائی تھی۔
لیکن معلوم ہوتا ہے وہ تیز عقل عورتیں اور بابر خوب سمجھتے تھے کہ واقعہ یہ نہ تھا] مجھے ان سے ایسی
بے وفائی کی توقع نہ تھی۔ جو لوگ کھلے بندوں بغاوت پر اُتر آئے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو شاہ بیگم اور خانم
کی نصیحت پر کان نہ دھرتا۔ خان میرزا شاہ بیگم کا سگا نواسہ تھا اور روزانہ ان کے پاس رہتا تھا۔
وہ بغاوت کے ساتھ نہ تھیں تو کم از کم اپنے آپ کو بالکل الگ رکھ سکتی تھیں۔ پہلے بھی جب تقدیر نے
دو مرتبہ مجھے ملک و وطن، حکومت و لشکر سے محروم کیا، میں اور میری ماں اُن سے مدد کے طالب ہوئے
اُنھوں (شاہ بیگم) نے کوئی مہربانی ہم پر نہ کی۔ ایک کھیت اور بیلوں کی جوڑی تک عنایت نہ کی کہ اُسی سے
گزارہ کر لیتے۔ کیا میری ماں یونس خاں کی بیٹی نہ تھی؟ کیا میں اس کا نواسہ نہ تھا؟ — (اس کے مقابلے میں)

جب یہ معز بیگم میرے پاس آئیں تو میں نے انھیں کابل کی ایک بڑی جاگیر تمغان حوالے کی ...... یہ باتیں شکایت کے طور پر نہیں، محض اظہار حقیقت کے طور پر لکھی گئی ہے۔ ان سے اپنی مدح و ستائش کرنا بھی مقصود نہیں ہے۔ جو کچھ گزرا اس کا ٹھیک ٹھیک بیان ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ ہر واقعے کی حقیقت معلوم ہو جائے اور صداقت سے اسے تحریر کر دیا جائے۔ اس سے اپنے بیگانے اور بیگانے سبھی کا اچھا یا بُرا حال جو پیش آیا لکھ دیا گیا ہے۔ امید ہے پڑھنے والے یہ عذر قبول کریں گے اور مجھ پر سخت احتساب نہ فرمائیں گے۔"

ان کلمات کو پڑھنے سے پہلے ناظرین سوچتے ہوں گے کہ بابر نے اپنی عجیب تزک میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک یقین کے لائق ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہر معاملے میں جو کچھ اس نے تحریر کیا وہ فی الواقع بے کم و کاست اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ بیان اس نے ہمیں بتایا۔ جملہ واقعات جس طرح اسے یاد تھے (اور بے شبہ وہ نہایت عمدہ حافظہ رکھتا تھا۔) ٹھیک اسی طرح قلم بند کر دیے ہیں۔ اپنے مختلف عزیزوں اور امیروں کی (مثلاً سمرقند کے سلطان علی کی) جو تصویریں اس کے قلم نے کھینچی ہیں، ان میں اپنی مخالفت کرنے والوں کی اکثر معاندانہ ہجو کی ہے۔ تنہا وہ دشمن یعنی شیبانی خاں، جس سے وہ خائف تھا۔ اس کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا۔ نیز ایسے چند خفت آمیز واقعات کو، جیسے بہن (خانزادہ) کا اسی شیبانی کے حوالہ کر دینا، قلم انداز کر گیا ہے۔ بایں ہمہ خود اپنی تصویر، اچھی یا بُری، سچی، ہو بہو اتاری ہے۔ اس قصد مصمم کی بدولت کہ "جو کچھ گزرا اسے بے کم و کاست تحریر کروں گا۔" واقعی ایک بے نظیر دستاویز تیار ہوئی، اور یہ ایک پوری زندگی کی داستان اس شخص کے قلم کی لکھی ہوئی جو سب سے بہتر اسے جان سکتا تھا اور اس کی جزئیات بیان کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھتا ــــ بابر اگر چاہتا تو خان میرزا کی ماں اور نانی سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح لکھتا جس میں خود اس کی تعریف کا رنگ ہوتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ سالہا سال کے بعد یہی واقعہ حسین میرزا کے بیٹے حیدر (میرزا دوغلات) نے اپنی "تاریخ رشیدی" میں تحریر کیا ہے وہ زیادہ رنگین فارسی میں لکھتا اور بابر کو شہنشاہ (بادشاہ، مترجم) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:

"بادشاہ حسب معمول تپاک سے ملا۔ بغیر تلخی یا ناگواری ظاہر کیے، بے تکلف خوشی خوشی سوتیلی نانی کے پاس آیا اگرچہ اس نے ترکِ محبت کی اور دوسرے نواسے کو بادشاہ بنایا تھا۔ شاہ بیگم گھبرا گئی اور اسے کچھ کہتے بن نہ آئی۔ بادشاہ جھک کر آداب بجا لایا اور فرزندانہ محبت سے گلے مل کر کہنے لگا۔" اگر

ماں کی شفقت کسی دوسرے بچے پر زیادہ ہو تو بھی ایک بچے کو برا ماننے کا حق نہیں ہے۔ ماں کا حق ہر حال میں اولاد پر قائم رہتا ہے۔" پھر کہنے لگا "مجھے تمام رات نیند نہیں آئی۔ طویل سفر کر کے چلا آرہا ہوں۔" یہ کہہ کے اپنا سر شاہ بیگم کی آغوش میں رکھ کر آنکھیں بند کر لیں جیسے سونا چاہتا ہے مطلب یہ تھا کہ بیگم کو ہر طرح مطمئن کر دے۔ ابھی مشکل سے آنکھ جھپکی ہوگی کہ اس کی خالہ مہر نگار بیگم آئی۔ بادشاہ فوراً اٹھا اور اس عزیزہ خالہ سے پورے تپاک سے گلے ملا۔ بیگم نے کہا "تمھاری بیویاں اور گھر والے تمھیں دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ میں شکر ادا کرتی ہوں کہ خدا نے تم سے ملایا۔ اب تم اٹھو اور قلعے میں اپنے گھر والوں میں جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتی ہوں" [اور واقع میں وہ بھی ایک خاص غرض سے وہاں جارہی تھی]

پھر بادشاہ قلعے میں آیا۔ جملہ خدام اور اُمرا خدا کی رحمت و کرم پر شکرانہ بجالائے...... اب شاہ بیگم خان میرزا اور میرے باپ (حسین میرزا) کو بادشاہ کے سامنے لائی۔ وہ قریب آئے تو بادشاہ انھیں لینے آیا۔ بیگم نے کہا "جانِ مادر میں اپنے گنہگار بیٹے اور تمھارے بدنصیب بھائی کو لائی ہوں۔ ان کے حق میں تم کیا کہتے ہو؟" بادشاہ نے میرے باپ کو دیکھا تو حسبِ عادت تعظیم سے یہ عجلت بغل گیر ہوا۔ مسکرا اور خیر و عافیت وغیرہ پوچھتا رہا۔ پھر اسی طرح خان میرزا سے بغل گیر ہوا اور محبت و نکوخواہی کا ثبوت دینے میں کمی نہ کی۔ یہ جملہ مراسم نہایت نرمی سے ادا ہوئیں، کسی تکلف یا تصنع کا شائبہ تک ان میں نہیں آیا لیکن بادشاہ عنایت و شرافت کے صیقل سے ان کی شرمندگی کے داغ مٹانے کی جتنی بھی کوشش کرتا تھا، وہ شرم کے داغ جو اُن کے آئینہ اعمال پر لگے تھے، دور نہ ہو سکتے تھے۔ میرے باپ اور خان میرزا نے قندھار جانے کی اجازت مانگی۔ شاہ بیگم اور خانم کو بادشاہ نے منت سماجت کر کے اپنے پاس روک لیا۔"

بابر نے ان سازش کے دو سرغنوں کے متعلق مختلف کیفیت بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "حسین میرزا، مہر نگار بیگم (بہ تصحیح مترجم) کے توشک خانے کی رضائیوں میں چھپا ہوا ملا اور اپنے کرتوت کی سزا میں ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے کے قابل تھا مگر بابر کی نظر میں اس کا بڑا گناہ یہ ہے کہ دیہاں سے چھوٹ کر شیبانی خاں کے پاس گیا اور اس سے بابر کی برائیاں کیں۔ خان میرزا، حسبِ تحریر بابر، پہاڑیوں کے نیچے پکڑا گیا اور ایسا بے حواس تھا کہ بابر کے سامنے آنے میں دو دفعہ لڑکھڑا کر گرا۔ اسے شربت دیا گیا تو وہ بھی جب تک بابر نے خود نہ پیا، اس نے زہر دیے جانے کے

بابر جوانی میں

یہ تصویر ۱۵۰۵ء میں کابل میں بنائی گئی تھی

بابر اِن سواروں کے ساتھ شہر سے باہر جا رہا ہے۔ یہ تصویر بابر کی اُن تصویروں میں سے لی گئی ہے جو تین پشت بعد بنائی گئی تھیں۔ اِن تصویروں میں ہندوستانی مصوری کے اثرات نظر آنے شروع ہو گئے ہیں۔ مثلاً تلوار کے میان میں اور اس رسمی چھتر میں جسے پس منظر میں خدام اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فتح کا جلوس نقارے اور نفیریاں بجاتا ہوا آگرے میں داخل ہو رہا ہے۔
جسے آئندہ مغلوں کا دار السلطنت بننا تھا۔

ہرات کے قصر سفید میں بابر کی دعوت

دائیں طرف مہمان بیٹھے ہیں اور بائیں طرف شمشیر بردار اور خدام مورچھل لیے کھڑے ہیں۔

دریا پر ایک جشن

بابر اپنے ایک نوجوان بیٹے کے ساتھ رات کے وقت دریا میں کشتی پر سستا رہا ہے۔
نظر بہ ظاہر تیراک اِس کشتی کو تماشائی مچھلیوں کے درمیان کھیتے چلے جا رہے ہیں۔

سوار اور گھوڑا زرہ میں ملبوس

یہ خاکہ سنہ ۱۵۹۰ء کے ایک مخطوطے سے بنایا گیا ہے۔ ترکش میں کمان مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ دو پھلا نیزہ وار کرنے اور پھینکنے کے کام آتا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کے مغلوں کے اسلحہ
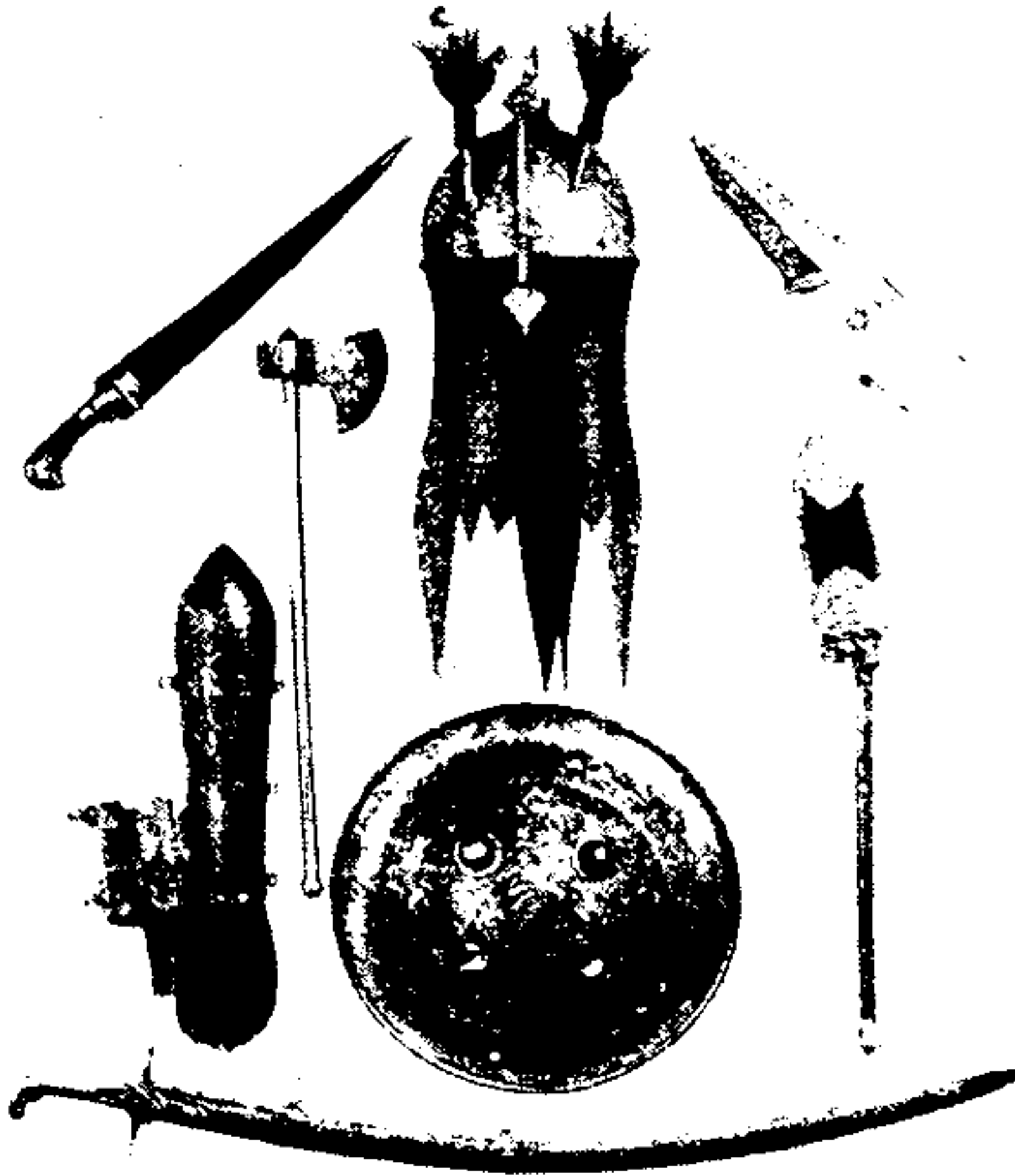
دائیں طرف خنجر اور نوک دار عصا دکھائی دیتا ہے۔ ہندی نمونے کے ہیں اور بائیں طرف کے دستی ہتھیار ایرانی صنعت ہیں
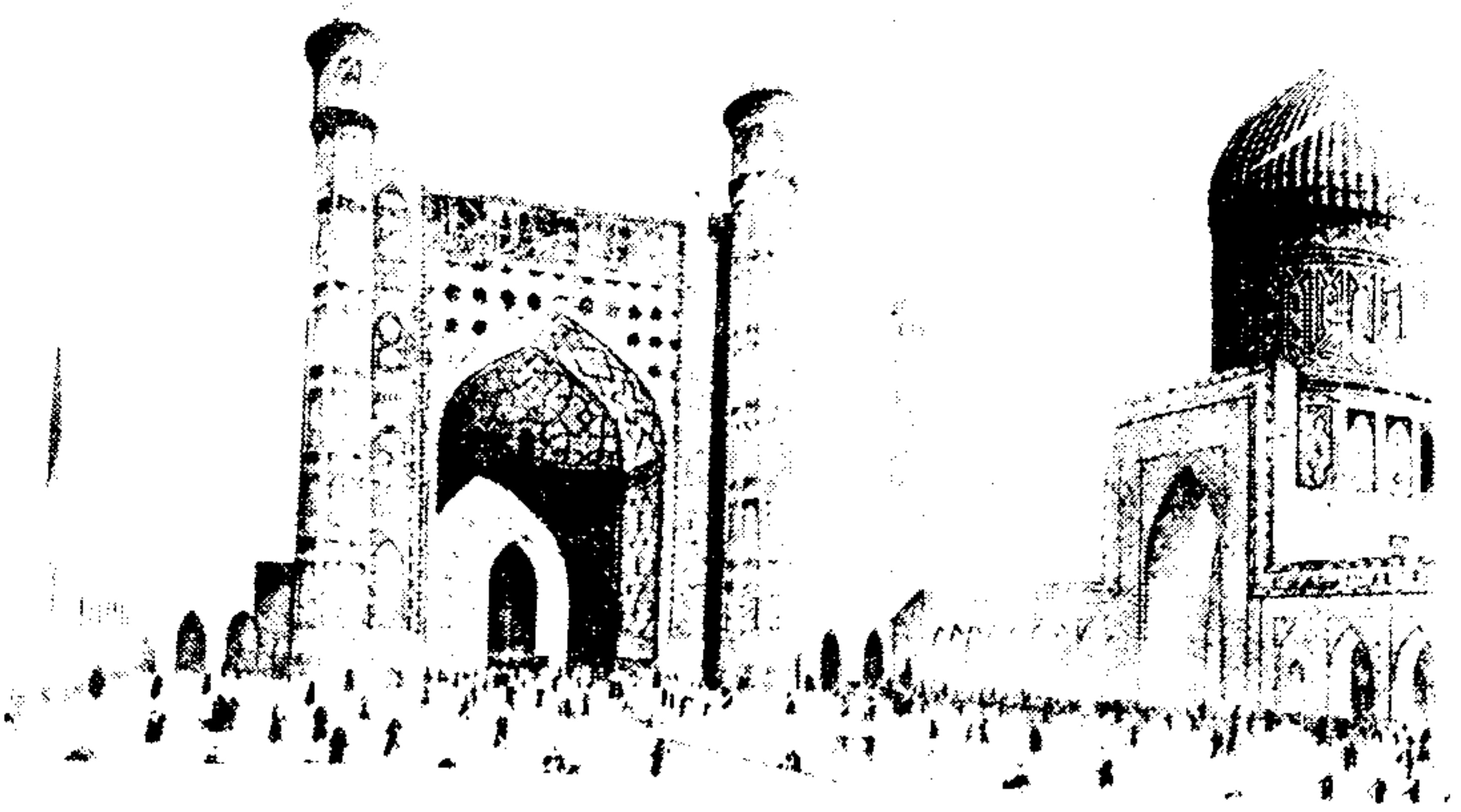
ریگستان یا وسط سمرقند کی عظیم مسجدیں جن کی آج کل مرمت ہو رہی ہے
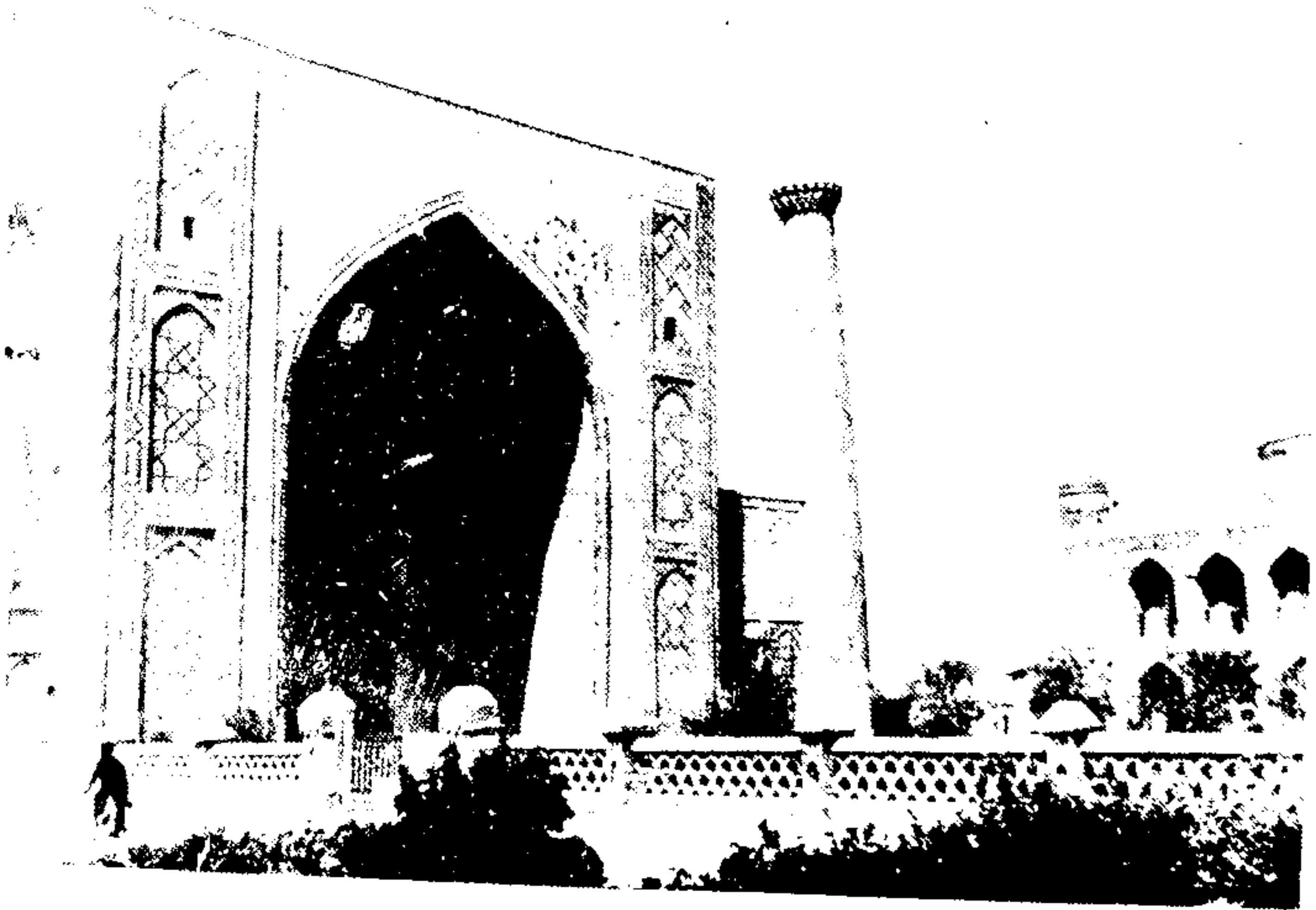
اس تصویر میں روسی فن کاروں نے اس مسجد کی اصل صورت دکھائی ہے جو غالباً سمرقند کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ امیر تیمور نے اپنی چہیتی بیوی بی بی خانم کے لیے بنوائی تھی۔ اب اس کی حالت اس قدر خستہ ہو چکی ہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کے اس شہر کی دوسری قدیم عمارتوں کی مانند شاید کبھی دوبارہ نہ بن سکے۔

درگاہ شاہ زندہ کی سیڑھیاں
سمرقند میں تیموری خاندان کے مقابر
یہ مقبرے کھنڈر ہو کر بھی دلکش دکھائی دیتے ہیں۔

خوف سے) نہیں پیا۔
حقیقت یہ ہے کہ بابر کہ بالطبع عالی حوصلہ تھا، اس موقع پر ان لوگوں کے ساتھ زیادہ تر اس لیے رحم وکرم سے پیش آیا کہ شاہ بیگم اور خانم کا پاس خاطر منظور تھا۔ جہانگیر کے بعد اس کے قریبی رشتہ دار بہت کم رہ گئے تھے۔ بہترین مصلحت اسی میں تھی کہ عدم موجودگی میں جو سازش کابل میں ہوئی اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ تاہم ان کنبے والوں کی غدّاری کا اسے دلی ملال ہوا۔

دورۂ ہرات کا خاتمہ

اگرچہ ممکن ہے بابر نے سوتیلی نانی اور خالہ کو یرغمال کے طور پر کابل میں رکھا ہو لیکن کوئی شک نہیں کہ قطع نظر اس سازش کے، وہ ان سے بڑی محبت کرتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ سازش کا سارا الزام ان دور رشتہ داروں کو دیتا ہے اور یہ بھی خوب جانتا ہے کہ انھیں شہ دینے والیاں یہ عورتیں تھیں، پھر بھی اپنی پریشانیوں کے سلسلے میں ان عورتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ یہ صرف آئین مردانگی نہیں بلکہ وہ سگی نانی (ایسن دولت بیگم) اور اپنی ماں کا غم نہیں بھولا تھا اور شاہ بیگم اور مہر نگار بیگم اس کے مختصر محل سرا میں ان مرنے والیوں کی خالی جگہ پُر کرتی تھیں۔
ترک و مغول نسل کی بیوہ خواتین کا نوجوانوں میں بڑا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ وحشی مزاج چنگیز خانی تک "التون اُرک" یعنی شاہی حرم سرا کی دادیوں، نانیوں کا مشورہ مان لیتے تھے اس زمانے میں بھی جب کہ ایک عالم پر اُن کی فرماں روائی تھی، شاہ بیگم اپنے رسُوخ سے کام لینا جانتی تھی تھوڑے ہی دن میں اس نے اپنے بدنصیب نواسے خان میرزا کے لیے خاصا محفوظ منصب حاصل کر لیا۔ اس کی پُر مغز دلیل یہ تھی کہ "میرے بزرگوں نے تین ہزار برس بدخشاں میں بادشاہی کی۔ مَیں عورت ذات زمامِ حکومت ہاتھ میں نہیں لے سکتی، میرا نواسہ لے سکتا ہے۔ اس کا سلسلہ اولاد بدخشاں میں صاحب عزّت و توقیر رہے گا۔" چنانچہ یہ پہاڑی نشین (بدخشاں) انھیں دے دیا گیا۔ مگر مغلوں کی شکست میں حسین میرزا نے شیبانی سے نامہ و پیام کر کے اپنی تباہی اپنے ہاتھوں کرائی۔ یہی موقع تھا جب اس نے بابر کو آل تیمور کے شاہ دشمن شیبانی کے سامنے مطعون کیا مگر اُزبک نے اُسے بھی قتل کرا ڈالا۔ اسی قتل پر بابر نے بے تامّل یہ فقرہ جڑا کہ تقدیر نے اسے اپنی بدگوئی کی سزا دی۔

چند روز قلعۂ کابل میں جشن اور جلسے ہوتے رہے۔ نوجوان شہزادی معصومہ بیگم بدرقے کے ساتھ ہرات سے آئی۔ وہاں کے پُر شکوہ دربار میں وہ بابر کو دیکھ کر شیدا ہوگئی تھی۔ بابر نے اسے عقد زوجیت میں لیا اگرچہ شادی سادگی سے ہوئی تاہم شاہ بیگم کی پُر وقار شرکت نے تقریب کو اس گھٹیا قلعے میں یادگار چیز بنا دیا۔ خود بابر معلوم ہوتا ہے بہت شاد ہوا۔ اسی موقع پر حسب معمول گشت لگاتے ہوں اس نے اپنے سواروں کو افغانوں پر جھپٹتے دیکھا تو دور سے بھاگتوں پر تیر چلا چلا کر انھیں روکا۔ اسے بڑے مزے لے کر بیان کرتا ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ سواروں کو سرپٹ دوڑاتے میں روک لینا کچھ آسان نہیں ہے۔ اسی طرح لطف کے ساتھ ایک موٹے گورخر کو گھیر کر شکار کرنے کی کیفیت لکھی ہے اور تفصیل کہ اس کی اسپلیاں ایک گز سے زیادہ ناپیں۔

یہ عیش و نشاط تھوڑے دن میں ختم ہوئے۔ ہرات کی دلھن کی پہلی ہی زچگی میں موت واقع ہوگئی مگر مولود جو لڑکی تھی سلامت رہی۔ بابر کے حکم سے اسے بھی ماں کا نام معصومہ بیگم دیا گیا۔ اس نے اس قدر بیان کیا ہے۔ لیکن اس نام کی یاد تازہ رکھنے ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس نوجوان بیوی کو کس قدر چاہتا تھا۔

مذکورۂ بالا زچگی (بلکہ شادی) سے بھی پہلے، موسم بہار کو کونپلیں پھوٹنے کے بعد جب راستے کھلے تو ہرات کے واقعۂ ہائلہ کی خبر پہنچی۔ بظاہر بابر کا خود کوئی معقول فوج لے کر ہرات واپس جانا محال تھا۔ وہاں کے دعوتیں کھانے کھلانے والے شہزادوں نے بھی غالباً بلاوے کا کوئی پیام اسے نہیں بھیجا۔ صرف ایک آزمودہ کار سپاہی، یعنی قندھار کا حاکم فوج لے کر اپنے ہراتی سلاطین سے آملا اور انھیں مشورہ دیا کہ چھوٹا بھائی مظفر قلعے کو مورچہ بند کر کے یہاں رہے اور بڑا باہر کوہستانی علاقوں میں گشت لگا کر قبائل سے جتنے جوان مل سکیں بھرتی کرے اور خوفناک ازبکوں کے ہرات کا محاصرہ کرنے میں رکاوٹ ڈالے۔ جیسا کہ بابر نے بعد میں لکھا، یہ بہت اچھا مشورہ تھا۔ لیکن تیموریوں کے آخری گڑھ کے شریک بادشاہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ جس وقت شیبانی پورے لشکر کے ساتھ ان کے خلاف بڑھا تو انھوں نے پھر اسی مرغاب ندی کے کنارے دل کشا چراگاہ میں خیمے ڈالے، جہاں بابر گذشتہ سال ان سے آکر ملاقی ہوا تھا۔ انھیں ایک دوسرے پر بھروسہ نہ تھا اور بقول بابر "نہ ہرات کو مستحکم کرنے پر متفق ہوئے نہ میدان میں لڑنے پر۔ بس خیمہ گاہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا ہے، بھروسہ کر لیا۔ خیالی خبطی لوگ تھے اور اس طرح کام کر رہے تھے جیسے کوئی خواب میں ہو۔

شیبانی کے چالیس ہزار ازبکوں نے اس خواب کو بہت جلد باطل کر دیا۔ جب وہ ان بھائیوں کے پڑاؤ کے مقابل پہنچا، تو بہادر والئ قندھار کے سوا کوئی سامنے نہ ٹھیرا۔ یہ بہادر سردار اپنے چند صد جنگ آزماؤں کے ساتھ یہیں کھیت رہا۔ رہے اصلی حریف، یعنی مظفر و بدیع الزمان تو "وہ فقط بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنی ماں، بہن، جورو بچوں تک کو ازبکوں کا اسیر بننے کے لیے چھوڑ گئے"۔ مظفر کا تو پتہ پتا نہیں چلا۔ بدیع الزمان نے خراسان سے نکل کر ایران کی پناہ لی۔ ان کا مال اسباب اہل و عیال ایک پہاڑی قلعے میں تھے۔ اسے جملہ غنائم کے ساتھ لینے میں ازبکوں کو دو ہفتے لگے۔ شہرۂ آفاق ہرات پر قبضہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے شیبانی نے عفو و کرم سے کام لیا۔ مظفر میرزا کی ایک بیوی کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آیا مگر کوئی قتل عام یا غارت گری شہر میں نہ ہونے دی بلکہ جو اہلِ علم وہیں رہ گئے تھے (اور خواند میر مورخ ان میں شامل ہے)، ان کی حفاظت کی بلکہ ان کی صحبت سے مستفید ہوا۔ جلا وطن ظریف شاعر بنائی بھی اس کے پاس رہا۔ لیکن بابر جسے ان واقعات کا سخت رنج تھا، اس روادارانہ قبضے کو بھی تعصب کی عینک سے دیکھتا ہے:۔

"شیبانی نہ صرف شہزادوں کے اہل و عیال بلکہ سبھی کے ساتھ بُری طرح پیش آیا۔ ایک شہزادی کو بطور مالِ غنیمت اپنے بخشی کو دے دیا۔ سارے شعرا پر آیندہ بنائی کا تسلط قائم کرایا [جس نے ضرور شاعرانہ انتقام لیا ہوگا]۔ ہر چند اَن پڑھ تھا مگر تفسیر قرآن میں ہرات کے دو مشہور عالموں کو سبق سکھانے کی جسارت کی[1]۔ قلم لے کر مشہد کے ملا کی خوش نویسی (قطعات۔ مترجم) میں اور بہزاد کی تصاویر میں اصلاح کی! بے مزہ شعر لکھے اور چوک کی مسجد میں منبر پر چڑھ کر پڑھے کہ لوگ داد دیں۔ وہ فجر کے وقت اُٹھتا اور پانچ وقت کی نماز کا پابند، نیز قرآن کی قرأت پڑھنے میں خاصا کمال رکھتا تھا، بایں ہمہ ایسی لغو اور (بہ تصحیح مترجم) بے ادبی کی حرکتیں اس سے سرزد ہوئیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ ازبک سردار اعظم نہایت دین دار اور اہلِ سنت والجماعت عقائد میں پختہ تھا۔ آلِ تیمور کو جو اس کے ہاتھ پڑا، بے شبہ اس نے قتل کرایا۔ در [illegible] وہ رحم دل آدمی تھا۔ اس کے راسخ العقیدہ سنی ہونے ہی کے باعث ہم دیکھیں گے کہ آیندہ تقدیر [illegible] بابر کو سخت

---

[1] مصنف نے لکھا ہے کہ بابر کا شیبانی کو ان پڑھ کہنا غلط ہے لیکن فارسی تزک میں لکھا ہے [illegible] وہ ان پڑھ تھا [illegible] علمائے ہرات کو بھی صرف جھڑکنا [illegible] سے تفسیر کا ذکر نہیں فرمایا۔ مترجم

پریشانی میں ڈالا۔ دوسرے، ایسی کسی کمزوری یا عیب کی وجہ سے نہیں، بلکہ فی الواقع شیبانی خاں کی غیر معمولی قابلیت، تنظیم، سلطنت کی بے باک حوصلہ مندی وہ اوصاف تھے جن سے بابر اتنا خائف تھا کہ اور کسی سے اتنا خائف نہ تھا۔ تیمور کے خانوادے میں وہی آخری فعّال شہزادہ رہ گیا تھا اور اس سے اپنے سخت خطرے میں ہونے کی حقیقت کو وہ خوب سمجھتا تھا۔

۱۵۰۷ء کے وسط گرما میں کچھ مدت اسے شیبانی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ازبکوں کا سیلاب ایران کی جانب پھیلتا معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ مشہد میں جمع ہو رہے تھے۔ لیکن خود شیبانی جنوب کی طرف حرکت میں تھا۔ اس نے یہ غلطی نہیں کی کہ پہاڑوں کے دشوار گزار دروں سے جس طرح ہو سکے گزر کر کابل کا راستہ لیتا۔ جیسی پچھلے جاڑوں میں بابر نے کی تھی۔ بلکہ اس نے وادی کی شاہراہوں سے قندھار کا رُخ کیا۔

بے حساب اموال

بابر کو سازشوں کے جال دکھائی نہ دیتے تھے اور دوسری طرف اتفاقی اسباب نے بھی اُسے قندھار کی جانب کھینچنا شروع کیا۔ دراصل وہ اسی قسم کی ترنگ میں آیا ہوا تھا جس کے بعد اکثر ٹھوکر کھانی نصیب ہوئی۔ ہرات کے شکست خوردہ لشکر کے بہت سے فراری معصومہ بیگم کے ہم رکاب آئے اور بابر کے لشکر میں بھرتی ہو گئے۔ اور جنگ آزماؤں نے بھی جنہیں ازبکوں کے بڑھتے ہوئے تسلط سے بچنے میں کسی سرد ھرے کی تلاش تھی اس کے اُردو کا رُخ کیا۔ جیسے پہلے خسرو شاہ کی ولایت میں ہوا تھا، یہاں بھی بہت سے لوگ مایوس ہو کر از خود اسی کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ اس عرصے میں وہ اعلیٰ درجے کا سردار مشہور ہو چکا تھا، کہ اپنے آدمیوں کی خبرگیری کرتا ہے۔ رعایا کو مزروعہ اراضی جیسی کچھ بھی ارض قابل، میں میسر ہو، عنایت کرتا ہے۔ اپنی ذات کے واسطے بہت کم چاہتا ہے کھوہ میں پناہ لینے کی بجائے رفیقوں کے ساتھ طوفان برف و باد میں باہر بیٹھ کر ٹھٹھرتا رہتا ہے۔ اس کی جواں مردی اور فیاضی پہلے سے معلوم تھی۔ خصوصاً سپاہیوں کے ساتھ۔ اور اس کی اقبال مندی کا بھی لوگ اعتقاد رکھتے تھے۔ نئی فوج میں ترخان، مغول، ہزارہ، اُردوس" (روسی) نام سنے جا رہے تھے۔

اس معجون مرکب کو گرمیوں میں فوجی تربیت دیتا ہوا خوشی خوشی قندھار کو چل پڑا۔

قندھار، ہرات کے سلطان حسین مرزا بایقرا کی سلطنت کی ایک ولایت تھا۔ اس کا آخری والی، جیسا کہ بیان ہوا، ازبکوں کی جنگ میں مارا گیا۔ شہر کابل کی پہاڑی حدود کے جنوب میں رودِ ہلمند کے کنارے ہندوستان اور مغرب کی کاروانی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس کے برج دبارہ اچھے نہ تھے۔ مگر اس کے راستوں پر عرب، ہندی، یہودی سوداگروں کے قافلے برابر چلتے رہتے اور ہندوستان کی قیمتی اجناس۔ نیل، مصالحے۔ شکر، ہاتھی دانت، جواہرات وغیرہ لاتے تھے۔ رئیسوں، بادشاہوں کی باہمی لڑائیوں میں بھی ان قافلوں کو کوئی نہ ستاتا تھا۔ ایک غیر مکتوبہ قانون، پھر شریعت اسلامی کا قطعی قانونِ ملکیت ان کی حفاظت کا ضامن تھا۔ بابر نے بھی اپنے اہلِ لشکر کو ایسا قافلہ لوٹنے سے روک دیا اگرچہ سوداگروں سے ایک عشر لے لیا تھا۔ ازبکوں کی طغیانی میں بہت سے قافلے ہرات یا مشہد نہیں جا سکے اور زیر نظر زمانے میں قندھار کے آس پاس پلٹ آئے تھے۔ مجموعی طور پر شہر سونے کی چڑیا نظر آتا تھا۔

قندھار پر وقت کے دقت شاہ بیگ ارغون اور مقیم جسے بابر نے کابل سے نکالا، متصرف ہو گئے تھے[1]

بابر نے باور کر لیا کہ ارغون بھائی اس کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں اور حسب معمول شتاب کاری سے ایک دم چل پڑا کہ ان سے مل کر ازبکوں کے مقابلے کی تیاری کی جائے۔ لیکن حقیقت میں انھوں نے ہرات کے فاتح کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ بابر نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو ارغونوں نے کورا جواب دیا اور وہ بھی اس طرح گویا کسی ماتحت کی عرضی کا جواب ہو۔ برآشفتہ ہو کر بابر نے کوچ کی رفتار تیز کی۔ اتنے میں ہراول کے سردار نے مطلع کیا کہ ارغونوں کے پاس فوج کی تعداد کہیں زیادہ ہے وہ راستہ روک کر جنگ کے لیے صف بستہ ہیں۔

اس کے بعد بابر کا ایک اور بے تحاشا معرکہ ہوا۔ اس کے سپاہی سخت منزل چل کر آئے اور آدھے کے قریب غلہ، بھیڑ بکری، نیز پانی لینے منتشر ہو گئے تھے۔ مگر ایک ہزار سوار جو گرد تھے وہ انہی کو لے کر قندھار کی صفوں پر بڑھا۔ اس مرتبہ اس کے سپاہی دس دس، پندرہ پندرہ کے پیوستہ جوقوں میں مرتب اور آزمودہ کار سرداروں کی قیادت میں تھے جنھیں معلوم تھا کہ کس طرح لڑنا ہے۔ علاوہ ازیں اب کے بابر نے بھی مغلوں کی جنگی چال سے کام لیا کہ دائیں بازو کو بہت آگے بڑھا کے اس طرح گھمایا کہ دشمن

---

[1] مصنف نے دو ارغون بھائی اور تیسرا مقیم لکھا ہے حالانکہ مقیم بن (شاہ بیگ) ارغون کا بھائی تھا ہم نے صحت کر دی۔ مترجم

اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ لڑائی ختم کر ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ یہ نیزہ یا دائیں بازو والے ارغون کے قلب لشکر میں گھستے چلے آئے اور وہ بکھر کر شہر کی طرف پسپا ہوا۔ بابر نے اس موقع پر (بہ تصحیح مترجم) مشہور آیۂ کریمہ "کَم مِّن فِئَۃٍ قَلِیلَۃٍ غَلَبَت فِئَۃً کَثِیرَۃً بِاِذنِ اللّٰہ" نقل کی ہے لیکن قندھار کی یہ جنگ اس نظم کی بدولت جو اس نے نافذ کیا اور بہ حیثیت سپہ سالار اس کی مہارت سے حاصل ہوئی۔ فتح کا ثمر جو ایسا ملا کہ دیکھا کیجیے۔ اس دولت مند تجارتی شہر کے خزانوں میں بے شمار چاندی کے سکے بھرے تھے انھیں بوریوں میں بھر بھر کر گدھوں اور اونٹوں پر لادا گیا۔ بابر نے مزالے کر لکھا ہے کہ وہ لڑتا ہوا غنیم کے خزانے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک عزیز پہلے سے وہاں گھوڑے سے کود کر گھس رہا ہے۔ بازاروں منڈیوں سے قیمتی سامان اسباب ہاتھ آیا۔ بابر بالا دوہی کے لیے چلا گیا تھا۔ شہر کے دروازے کے باہر سبزہ زار میں پڑاؤ تھا۔ واپسی پر اس کی ہیئت بدل جانے کی کیفیت تحریر کرتا ہے کہ "میں ذرا دیر سے فرودگاہ میں داخل ہوا تو لشکرگاہ کی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔ ہر طرف اچھے اچھے گھوڑوں کی قطاریں اونٹ اور خچر لدے پھندے کھڑے تھے۔ بیش قیمت خیمے، شامیانے فرش فروش کے ڈھیر لگے تھے ارغونوں کے خزائن سے پارچے کے گٹھے اور چاندی کے سکوں کے بھرے ہوئے تھیلے کثرت سے ملے۔ ہمارے ہر آدمی کے ڈیرے میں خود اس کا حاصل کردہ مال غنیمت تھا۔ بہت سی بھیڑ بکریاں لائی گئی تھیں مگر ان کی طرف کسی کو توجہ نہ تھی۔"

مالا مال ہو جانے والا پڑاؤ جلد ہی اُٹھا لیا گیا۔ قاسم بیگ کے اگرچہ پیشانی پر زخم آیا تھا، مگر بابر پر اس نے زور دیا کہ فوراً کابل واپس چلو۔ اس نے حجت کی کہ شکست خوردہ جُوق جُوق نواحی علاقے میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور اُزبک بھی اب زیادہ دور نہ ہوں گے۔ ہمیں کابل کے کوہستانی حصار کی پناہ لینے میں ہرگز تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ غنیمت ہے کہ وفادار قاسم بیگ کی عرض معروض بابر نے مان لی۔ لکھتا ہے کہ "اموال و خزائن کے بھاری بوجھ لے کر عزت و نام آوری کے ساتھ ہم واپس روانہ ہوئے۔" ان کامیابیوں میں رجائیت کا دخل کم تھا۔ قندھار کی حکومت کے لیے ناصر میرزا کو مقرر کیا گیا کہ اس سے بہتر انتخاب دوسرا نہ ہو سکتا تھا۔ حالانکہ بابر کا یہ علاتی چھوٹا بھائی محفوظ اور تالیفِ قلوب کیے مجتمع بدخشاں کو بھی نہ سنبھال سکا تھا۔ چند ہی روز میں اور کابل کے راستے ہی میں یہ تشویش ناک خبر ملی کہ شیبانی نے آ کر قندھار کو گھیر لیا ہے۔ اس وقت قاسم بیگ کے انتباہ کا بار دوبارہ شکر گزار ہو۔

کابل پہنچتے ہی اعیان و امرا کی مجلس مشاورت طلب کی گئی کہ اب کیا کیا جائے؟ قاسم بیگ کی رائے تھی کہ کابل کے مورچے ناقص اور ایک میدان میں وہ سب سے الگ واقع ہے اس کی مدافعت نہ ہو سکے گی۔ ہمیں بدخشاں کے پہاڑوں میں ہٹ جانا چاہیئے۔ بابر کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ صورت حال کو اس نے زبانی یا کم سے کم اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "ہمارے دشمن اور اغبار ازبکوں کا امیر تیمور کی اولاد کے جملہ ممالک پر اب قبضہ ہو چکا ہے۔ ترک و مغول (چغتائی) قبائل جو ادھر اُدھر بعید گوشوں میں ہیں، وہ بھی طوعاً و کرہاً ازبکوں سے مل گئے ہیں۔ میں تنہا کابل میں رہ گیا ہوں اور ایسے طاقتور دشمن کے مقابلے میں اتنا کمزور ہوں کہ نہ صلح کی شرائط (حسب مراد) طے کرانے کی گفتگو کے ذرائع رکھتا ہوں اور نہ اتنی جمعیت کہ جم کر لڑ سکوں۔ ایسی طاقت سے بچنے کے واسطے لامحالہ کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہیئے کہ ہمارے اور ایسے قوی دشمن کے درمیان کافی فاصلہ حائل ہو جائے۔ ایسی جگہ بدخشاں اور ہندستان نظر آتے ہیں۔ انھی دو میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا ہوگا"۔

بابر کی اپنی مرضی ہندستان جانے کی تھی۔ صورتِ حال کی جو کیفیت اس نے لکھی وہ بالکل درست تھی۔ مگر ہندستان کی رائے دینے سے پتا چلتا ہے کہ دس برس میں بابر کتنا بدل گیا تھا۔ کیونکہ پہلے وہ غالباً اسی کو ترجیح دیتا کہ پہاڑوں میں پناہ لے کر موقع کی تاک میں رہے اور جب وقت آئے حملہ کر کے پانسہ پلٹ دے۔ قاسم بیگ کا مشورہ یہی تھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس لمحے کابل میں بابر پر شیبانی کا خوف غالب آ گیا اور شاید عمر بھر میں یہی ایک موقع تھا جب کہ خوف نے اسے بے تحاشا بھاگنے پر آمادہ کیا۔ مزید خرابی یہ سمجھیے کہ اس نے ولایت بدخشاں خان میرزا جیسے بے اعتبار آدمی اور اس کی سازشی نانی کے اور خود شہر کابل ایک دوسرے عزیز (عم زاد) عبدالرزاق کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ عزیز تھا جو مقیم ارغون کے خزانے پر دوڑ کر اس سے پہلے جا پہنچا تھا۔

ان غلط فیصلوں کا بہت جلد بابر کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔ خیبر کی تنگ گھاٹی میں دریا کے کناروں پر جو افغانی قبائل تھے، وہ اس کے مارا مار کوچ کرنے کو سمجھے کہ کابل چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ بدقسمت باقی (چغانی) پر جو افتاد پڑی تھی، اسی طرح بابر کے لشکروں پر پڑی کہ افغانی لٹیروں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح لشکر پر چھیٹنا شروع کیا۔ سردیاں سر پر آ رہی تھیں اور اس مختصر فوج کے پاس سامان رسد کی کمی تھی۔ سپاہیوں کو خواہی نخواہی چھاپے مار کر قبائلی بستیوں سے غلّہ حاصل کرنا پڑا۔ بابر سچائی

سے اقرار کرتا ہے کہ "ہم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کدھر جائیں گے، کہاں ٹھیریں گے اور پڑاؤ لگائیں گے؛
بس اوپر نیچے کوچ کر رہے تھے اور نئے نئے مقامات پر خیمے ڈال کر منزل کرتے تھے۔ کان خبروں پر لگے
ہوئے تھے۔"

ہندوستان کے گرم میدانوں تک پہنچنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اس درے میں جسے پناہ گزینوں
نے "باد پیچ" کا نام دیا، سردی سے ٹھٹھر گئے۔ ایسی قریب قریب مایوسی کی حالت میں بھی بابر کی ہمت
افسردہ نہ ہوئی۔ شاید جنگ چپاولی کی یاد تازہ ہوگئی اور یہ خیال کہ اس سے بھی بدتر زمانہ دیکھ چکا ہے
اسی اثنا میں افغانستان کی جنوب مغربی پہاڑیوں سے جو خبریں آئیں، وہ خوش آیند تھیں۔ شیبانی خاں
(بہ تصحیح مترجم) کابل ایک طرف، قندھار کے محاصرے سے بھی دست بردار ہوگیا۔ اس کے وسیع الحدود
شمالی علاقوں میں ازبکوں کی ایک بغاوت سے خود اس کے اہل و عیال خطرے میں پڑ گئے تھے، اسے ہمارے
شیر کی زمین چھوڑ کر اُدھر ہٹنا پڑا۔ بابر کا اس اطلاع سے عجیب تاثر یہ ہوا کہ سارا خوف زائل اور اپنی
مملکت کی، اگرچہ چھوٹی سی ہو، سلامتی کا اطمینان ہوتے ہی ایک نیا خیال سوجھا جس میں تازہ امیدوں
کے ساتھ دشمن کو چڑانے کا بھی پہلو تھا۔ لکھتا ہے "میں نے حکم دیا کہ آیندہ لوگ مجھے "پادشاہ" کے لقب سے
یاد کریں"۔ یہ لفظ یورپ والوں کے "ایمپرر" کے مشابہ ہے یعنی شاہنشاہ، اگرچہ اس میں وہ معنویت نہیں
ہے۔ بہرحال کسی تیموری فرماں روا نے اسے اپنے لیے نہیں استعمال کیا تھا۔ اُن سے بہت پہلے ایشیا کے
بڑے خاقان اسے اپنے القاب میں شامل کر لیتے تھے۔ اس میں دوسرے فرماں رواؤں پر حکمرانی کرنے
کا پہلو نکلتا ہے حالانکہ اس وقت بابر ایسی قوت و سلطنت نہ رکھتا تھا۔ واقعتاً کوئی "پادشاہ" تھا تو فقط
شیبانی خاں اور شاید اسی سے دعوئ ہمسری جتانے کے لیے بابر نے اسے اختیار کیا۔ اس نے اپنے ذہن
میں جو بھی اسباب سوچے ہوں، آیندہ برابر اس لقب پر قائم رہا۔ انہی دنوں کابل میں اس کے ہاں فرزند
پیدا ہوا۔ یہ بھی فال نیک تھی۔ لکھتا ہے "اس کا نام ہمایوں (مبارک) رکھا گیا۔ ولادت کے چوتھے یا
پانچویں دن اس خوشی کا جشن منانے میں چار باغ میں آگیا۔ وہیں چھوٹے بڑے امرا نے نذریں گزاریں
چاندی کے اتنے سکوں کا ڈھیر جمع ہوگیا کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جشن بڑی دھوم دھام سے ہوا۔
(انگلستان کے) رچرڈ کی طرح پھر بابر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

"میں آہنی دروازے تک گیا تھا"

کوہستان میں بہار آگئی تھی۔ خانقاہ "خواجہ سیاراں" کے آس پاس پھول کھل رہے تھے۔ قلعے کے شمالی دریچوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آنے لگی تھیں۔ ہمایوں اور اس کی ماں ماہم دونوں زچگی میں بخیر و سلامت رہے ہے۔ سالِ نو آنے والا تھا۔ ادھر نیا خزانہ دار مقرر ہوا جس کی نگرانی کی بدولت پہلی مرتبہ کابل کا خزانہ معمور تھا۔ غرض خود ساز پادشاہ کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا اور کوئی بد فالی کی بات سننی نہ چاہتا تھا۔ حقیقت میں ہمارے لیے آج ساڑھے چار سو برس بعد ان خطرات کو دیکھنا آسان ہے جن میں بابر گھرا ہوا تھا۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ جب کابل سے مارا مار روانہ ہوا تو اپنی جبلّی فیاضی سے بابر نے کابل کی حکومت عبدالرزاق کے سپرد کر دی تھی جو اس کے رشتے کے چچا، اور سابق والئ کابل اُلغ بیگ کا بیٹا تھا۔ اُلغ بیگ کی حکومت میں سخت ابتری رہی مگر بہرحال وہ فرماں روا، اور اس کا فرزند وراثت کابل کا جائز حق دار تھا۔ قندھار میں بابر نے عین وقت پر پہنچ کر عبدالرزاق کو بھرپور خزانے سے محروم کیا اور صرف "کسی قدر اسے دے دیا۔" علیٰ ہذا اب خطاب پادشاہ کے ساتھ کابل آکر اس شہر کی حکومت عبدالرزاق سے واپس لے لی۔ انہی وجوہ سے عبدالرزاق نے بے پروا بابر کو نکال باہر کرنے کی سازش پکائی مگر بڑی حزم و احتیاط سے یہ کام کیا۔

بابر کی قلیل سپاہ میں دو ہزار کے قریب مغول کا گروہ تھا جسے عبدالرزاق نے اپنا آلۂ کار بننے کے قابل پایا۔ واضح رہے کہ بابر نے فوج کو سختی سے نظم و ضبط کا پابند بنایا تھا اور وہ سپاہیوں کو لوٹ مار کی مطلق اجازت نہ دیتا تھا۔ اہلِ فوج کو لوٹ مار پسند تھی، خصوصاً ناتربیت یافتہ مغلوں کو جنھوں نے مال دار غاصب خسرو شاہ کی ملازمت میں شریک ہونے کے وقت سے اپنا الگ جتھا بنایا اور وہ ابھی تک قائم تھا۔ خان میرزا کی ناکام بغاوت میں بھی اکثر مغل شامل ہو گئے تھے۔ اب اُن کے کانوں میں پھر پھونکا جانے لگا کہ اگر عبدالرزاق بادشاہ ہو گیا تو بھرپور خزانے کی تھیلیوں کے مُنہ پھر کھل جائیں گے، بابر کے سخت ضوابط کی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اور قندھار سے لے کر بدخشاں تک سارے ممالک سے محاصل وصول کیے جائیں گے۔ فوج کی چھاؤنی شہر کے باہر تھی۔ مغلوں کے سوا دوسرے سپاہی اکثر شہر کے گلی کوچوں میں اہل و عیال میں یا اِدھر اُدھر منتشر تھے پھر خود بابر ایک افغانی قبیلے کی تادیب نیز رسد رسانی کی تاخت کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس موقع پر جو کچھ پیش آیا وہ اسی کی زبان سے سنیے:۔

"اس بہار میں مہمند افغانوں کی ایک (بہ تصحیح مترجم) بستی پر تاخت کی گئی۔ واپس آنے کے چند روز بعد معلوم ہوا کہ چند سردار بھاگ جانے کی سوچ رہے ہیں۔ ایک مضبوط جمعیت انھیں پکڑ لانے کے لیے بھیجی گئی اور اس نے انھیں استر غچ کے آگے جا لیا۔ ان فراریوں کی باغیانہ باتیں جہاں گیر میرزا کی زندگی میں سُنی گئی تھیں۔ حکم ہوا کہ انھیں بازار کے دروازے پر قتل کر دیا جائے۔ وہ رسیوں میں باندھ کر وہاں لے جائے گئے اور سولی پر چڑھائے جانے والے تھے کہ قاسم بیگ نے خلیفہ کو بھیج کر التجا کی کہ ان کی خطا معاف کر دی جائے۔ [خلیفہ نے گذشتہ سال قلعہ کابل کی دفاع میں حصہ لیا اور بابر کی ایک رضاعی بہن سے اس کی شادی ہوئی تھی] قاسم بیگ کی خاطر سے میں نے جان بخشی کر دی مگر انھیں قید میں رکھا۔

اب خسرو شاہ کے (سابق) سپاہیوں اور مغل سرداروں نے ترکمان سے سازباز کی۔ ان کا سرغنہ سیوندوک تھا۔ [قندھار کے معرکے میں یہ بابر کی طرف سے بہادری سے لڑا تھا] پھر ان سب نے مجھ سے بدخواہی پر کمر باندھی۔ یہ لوگ سُنگ قورغان کے مرغزار میں تھے۔ عبدالرزاق دوسری طرف سے افغانی بستی میں آگیا تھا۔

چند روز پہلے محب علی قورچی نے خلیفہ اور ملّا بابا سے ان لوگوں کی ملی بھگت کا دو ایک دفعہ ذکر کیا اور انھوں نے مجھ سے اشارۃً کہہ دیا تھا لیکن یقین کے لائق بات نہ تھی۔ میں نے کچھ توجہ نہ کی۔ اب ایک رات چار باغ کی بارہ دری میں بیٹھا تھا کہ موسیٰ خواجہ اور ایک اور آدمی جلدی جلدی میرے پاس آئے اور کان میں کہا کہ "واقعی میں مغل بغاوت کرنے والے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کہ عبدالرزاق میرزا بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے یا نہیں۔ لیکن آج رات کو وہ بغاوت کا آغاز نہیں کریں گے۔"

"پھر بھی میں ٹال گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے زنان خانے کی طرف جو خلوت باغ میں تھا، چلا اور اپنے آدمی [مفسدوں کی ٹولی کے پاس] روانہ کیے لیکن وہ راستے سے لوٹا دیے گئے اور پہنچ نہ سکے۔ تب میں خود محل سرا کے داروغہ (بہ تصحیح مترجم) غلام سرور کو لے کر خندق کے راستے شہر کی جانب گیا۔ آہنی دروازے تک گیا تھا کہ بازار کی گلی سے خواجہ محمد علی [ہمایوں کی ماں ماہم کا بھائی] آتا ہوا ملا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ حمام کی ڈیوڑھی کے قریب ....

یہاں پہنچ کر تزک کا سلسلہ دوبارہ یکا یک ٹوٹ گیا ہے اور پورے گیارہ سال تک کوئی حال لکھا ہوا نہیں ملتا۔ جہاں تک معلوم ہے کسی مخطوطے میں، اصلی ہو یا جعلی، اس خلا کو بھرا نہیں گیا۔ البتہ دوسرے مورخ

خصوصاً نوجوان میرزا حیدر دوغلات ۱۵۰۸ء کے اس فسادِ کابل کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں
واضح ہو کہ میرزا حیدر دوسرے سال کابل پہنچا تھا۔ اس کی عمر گیارہ برس کی تھی مگر اس نے ضرور عینی شاہدوں
سے فساد کے حالات سُن کر محفوظ رکھے ہوں گے۔

القصّہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر حسبِ عادت بے پروائی سے بغیر مسلّح پاسبانوں کے عاجلانہ شہر
کے اندر آیا، قریب تھا کہ آہنی دروازے کے اندر گرفتار ہو جائے، مگر کسی طرح بچ کر نکل گیا۔ تاہم اس کو
دیکھ کر باغیوں نے ارادہ کر لیا کہ جو کچھ کرنا ہے فوراً کر گزریں۔ شورش گلی کوچوں میں اتنی پھیل چکی تھی کہ وہ
اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ ادھر چھاؤنی کے بازار کو جا کے دیکھا تو وہ لُٹ رہا تھا اور وہاں کے جوان
مضطربانہ، بغیر کسی سردار و حاکم کے اِدھر اُدھر منتشر ہو رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باغی
مغلوں سے لڑیں یا ان کے ساتھ ہو جائیں۔ بچ کر نکلیں یا شہر میں جا کر بال بچوں کی خبر لیں۔ اس پراگندہ
نفری سے بابر نے پانسو وفادار سپاہیوں کو فراہم کر لیا۔ اگلے دن دوسرے امرا اور سردار آ ملے۔ بظاہر
بیرونی چھاؤنی پر بابر کے حامی قابض رہے اور باغیوں کے ہر اقدام کا جواب دیا۔ اب میرزا عبدالرزاق
علانیہ بغاوت کا سرغنہ بن کر سامنے آیا اور پتا چلا کہ اس تحریک کے اُکسانے میں شکست خوردہ ارغونوں کا
حصّہ تھا، جو اب دوبارہ قندھار کے حاکم ہو گئے تھے۔

ایک روز وفاداروں کی قلیل جمعیت باغوں کی پوری فوج کے سامنے صف آرا ہوئی۔ حیدر میرزا لکھتا
ہے کہ یہ بابر بادشاہ کے سب سے بڑے معرکوں میں ایک معرکہ تھا جس میں بابر نے عبدالرزاق کو للکارا کہ
آئے اور تنہا اس کے ساتھ لڑے۔ اس کے محتاط حریف نے انکار کیا اور خود لڑنے نہیں نکلا البتہ باغیوں
میں سے پانچ جنگ آزما الگ الگ لڑنے آئے اور بابر نے اس کرشمہ خیز جنگ یک یکی میں پانچوں کو مار گرایا
یا گھوڑے پر سے گرا لیا۔ ہر چند یہ روایت بعد کا افسانۂ شجاعت معلوم ہوتی ہے لیکن حیدر میرزا نے
پانچوں مغلوب ہونے والے مبازرین کے نام تحریر کیے ہیں۔ بابر کا ہٹیلا پن اور دست بدست جنگ
میں صفائی سے اپنے کو بچا لینے کا ہُنر بخوبی معلوم ہے۔ ادھر حریفوں کے نام سے اندازہ ہوتا ہے
کہ وہ مختلف اقوام کے نمائندہ تھے اور قیاس کہتا ہے کہ ایسی سراسیمگی میں کہ کچھ بنائے نہ بنتی تھی، ہر گروہ
نے ایک ایک شہسوار چُن کر مقابلے میں بھیجا تھا۔ جملہ قرائن کے پیشِ نظر ہم حیدر میرزا کی روایت کو قبول
کر سکتے ہیں۔

بابر کا اس طرح جان بر تکمیل کر ڈٹ جانا بے اثر نہ رہا۔ اتفاقی طور پر عبدالرزاق میرزا بازی ہار گیا تھا اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ پکڑ لیا گیا۔ لیکن حیدر میرزا یقین دلاتا ہے کہ "اس کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لیا اور رہا کر دیا گیا۔"

وقائع سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرمیوں کے ختم تک کابل میں امن امان قائم ہو گیا یہی ایام تھے جن میں فتح مند شیبانی خاں نے اپنے ممالک میں نسل تیمور کا بالکل استیصال کر دینے کی ٹھانی۔ اسی تطہیر میں مین میرزا و دغلات قتل کیا گیا۔ صرف چند لڑکے جن میں حیدر میرزا بھی تھا، بدخشاں کے برفانی پہاڑوں سے گزر کر کابل، دربار بابری کی پناہ میں آگئے۔ پھر یہی زمانہ ہے جب کہ بادشاہ کا لقب خود چسپاں کر لینے والے بابر کی حکومت کا بیرونی ملکوں کے معاملات میں نام آنا شروع ہوا۔ مغربی ایشیا کے وسیع تر معاملات کی تشکیل دربار کابل کے گرد ہونے لگی، ایک نیا خانوادۂ شاہی ظہور میں آیا اور بابر پر شیبانی کے جھٹکی مارنے کی کوششیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ واقعی یہ تقدیر کا عجیب کرشمہ اور پہلا موقع تھا کہ بابر جو کابل کے کوہستانوں کے غلاف میں دبکا بیٹھا تھا، اُسے ان واقعات نے نفع پہنچایا جو خود اس کی دسترس سے باہر تھے۔

باب پنجم

بابر کی جدال اپنی رعایا سے
نیم تاریک بھول بھلیاں[1]

سچا تصوّف بند آنکھوں والی سادگی سے آتا ہے۔ سینٹ فرانسس کا عشق، سینٹ ٹریسا کی وارفتگی میں کوئی ذہنی خلش نہ تھی۔ یتیم پیغمبرِ اسلام (صلعم) کا رات کے اندھیرے میں آسمان پر روشنی دیکھ کر شیفتہ ہو جانا بہت سادہ واقعہ تھا۔ ظلمت میں نور —— ایک تنہا جان اور اس کا واحد خدا۔

لیکن الفاظ، خیالات لاتے ہیں اور اشارات، افکار کی شرح سناتے ہیں۔ پس روحانی عقائد یا تصوف کا بیان کرنا ایک دلکش معمّا بن سکتا ہے۔ ایشیا کے بزرگ صوفیہ میں رومیؒ لکھ سکتا ہے کہ معشوق آسمان کے نورانی دروازے سے ندا دے رہا ہے۔ عمر خیام سناتا ہے کہ "میں وہ شاہین ہوں جسے آسمان پر چھوڑا گیا ہے کہ قضا و قدر کی لوح کو جھپٹ لاؤں" اور حافظ خود اپنے فکر کی پیروی میں پکارتا ہے کہ "اس بلند نگاہ باز کا آشیانہ عشق ہے۔ خدائے عرش کے کنگوروں سے اسے واپس آنے کی صفیر سنائی دیتی ہے۔"

ان شعرا نے اپنے معتقدین کے افکار کی رہنمائی اس وقت شروع کی جب کہ کئی نیم تاریک راہیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر شیعہ یا تفریق پسند لوگ مذہب سے اسخ،

---

[1] اس فصل میں فاضل مصنف نے روحانیات اور مسلمانوں کے تصوّف کی نسبت اپنے افکار عالیہ پیش کیے ہیں بابر کے تذکرے یا تاریخ سے ان کا کچھ تعلق نہیں نظر آتا اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو محض دخل در معقولات معلوم ہوں گے۔ مگر ہم نے خفیف تصرّف اور ضروری تصحیح کے ساتھ بجنسہ ان کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مترجم۔

سنت والجماعت کے مخالف تھے۔[1] پیغمبر اسلام (صلعم) نے جو سادہ مذہب منکشف کیا وہ پڑھی جانے والی کتاب (کتاب مثانی، مترجم) میں ملفوظ ہوا۔ لیکن معاملات انسانی سے متعلق اس قرآن کی تعبیر کے لیے احادیث قلم بند کی گئیں۔ شریعت نے ضوابط حیات متعین کیے اُس خدائے پاک کی مرضی کے مطابق، جو خود دنیا سے بے حساب بُعد رکھتا تھا۔ بخلاف اس کے صوفیہ سینٹ فرانسس کا سا عقیدہ، قرب خدا کا رکھتے تھے۔ علیٰ ہذا نسطوری عیسائیوں کی طرح جن کے گرجے اسلامی ممالک میں جا بہ جا منتشر تھے وہ مسیح جیسی فطرت کے امام کے ظہور کے بھی معتقد تھے۔ پھر صوفیوں میں اسی قسم کے "طریقے" بنے۔ خصوصاً نقش بندیوں میں جیسے سینٹ فرانسس کے گرد اگرد درویشوں کا گروہ تیار ہوا تھا۔ ان (مسلم) درویشوں کو کبھی کبھی لوگ ستاتے تو وہ اخفا کا طریق اختیار کر لیتے اور اپنے روحانی مرشدوں کو "ایشان" کے رمزی خطاب سے یاد کر کے ان کی پیروی کرتے تھے۔ عالی خیال خواجہ (عبید اللہ) احرارؒ ان عابد زاہد یا صوفی بزرگوں کے مرشد اعلیٰ تھے۔ بابر ان سے کمال عقیدت رکھتا تھا اور ان کے مریدوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ شروع میں جس کام کا ارادہ کرتا تو پہلے ان جہاں گرد درویشوں سے اسے بیان کرتا تھا۔ رہبانیت پسند میر علی شیر علی جیسے خلاف طبع ملک داری کے میدان میں آنا پڑا، غالباً ایسا ہی صوفی اور حضرت جامی رح کا دوست دار تھا۔ بابر بھی یقیناً ان کو بہترین سالک شاعر جانتا تھا۔ سنت والجماعت عقیدہ رکھنے کے باوجود جامیؒ صوفی تصوّرات کے پیرو ہو گئے تھے۔ ممکن ہے بابر نے بھی اسی قسم کا مذہب اختیار کیا ہو۔ اعمال ظاہری میں وہ شریعت کی پوری پابندی کرتا تھا۔ مگر اس کا بھروسہ ہمیشہ خدائے ناصر و ناظر پر ہوتا۔ اسے ریاکاری نہ آتی تھی لہذا جب وہ کہتا ہے کہ میری زندگی کے واقعات کی مشیت الٰہی نے تشکیل کی، تو وہ حقیقت میں ایسا ہی سمجھتا تھا۔ البتہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ خدا جانے وہ کس حد تک ظاہری رسوم، طہارت، اکل و شرب اور نماز کو نصرت الٰہی کا ذریعہ خیال کرتا تھا، جو اس کی دلی آرزو کے مطابق دنیا کے جھگڑوں میں بھی اسے تقویت دے گی۔ اس کا ذہن ایچ پیچ نہ جانتا تھا اور وہ بلاقیل و قال رسوم کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ حضرت رومیؒ کی تلقین کہ خدائے قاہر کے حضور میں ایسی ظاہری رسمیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، بابر کے فہم سے بالا تھی۔ ہاں آگے چل کر اس نے دونوں کے بین بین خود ایک صورت نکال لی تھی اور اپنے آپ کو ہنس کر "درویش بادشاہ" کہا کرتا تھا۔

---

[1] مصنف نے جتنے شاعروں کا اوپر نام لیا، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا۔ مترجم۔

لیکن خود کو پادشاہ ملقب کرنے کے بعد دس برس تک اس کی زندگی اپنے سے کم عمر ایک اور شخص کے زیر اثر رہی، بلکہ کہنا چاہیے کہ ڈھلتی رہی ــــ جو ہر اعتبار سے درویش اور بادشاہ تھا۔ ۱۵۰۱ء میں یہ مجہول الاحوال سا نوجوان اسمٰعیل صفوی اور امیر تیمور کی سابقہ سلطنت کے مغربی اقطاع میں شاہ ایران موسوم ہوا تھا۔

ایران (یا فارس) کہلانے والے خطے کا کسی ایسے خیالی منصوبے بنانے والے کے ہاتھ میں آجانا لائق تعجب بات نہ تھی۔ جس دن سے خاندان کیانی کے کورش (کیخسرو) نے بابل و نینوا کے سامی دیوتاؤں کا تختہ اُلٹا اور اپنے پیغمبر زرتشت کے تبلیغی دین کا حلقہ بگوش ہوا، اسی وقت سے ایران تصوّف یا باطنیت کا گہوارہ بن گیا تھا۔ رومہ کے جیوش جس طرف گئے فتح سے ہم کنار ہوئے لیکن نہر فرات کے پار مشرقی مذاہب کے ملکوں کو کبھی مغلوب نہیں کر سکے۔ ظہور اسلام کے بعد یہاں خلافت کا تسلّط قائم ہوا تاہم مرورِ وقت کے ساتھ عبّاسیوں کی خلافت بغداد ایرانی شیعیت کے مذہبی اثر کے تحت آگئی۔ تصوّف یا باطنیت بالطبع پابندِ مذہب حکومت سے انحراف کرتی ہے خواہ بغاوت کے ذریعے ہو خواہ تبلیغ و دعوت سے۔ بازنطی سلطنت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انطاکیہ، سکندریہ، یوروشلم کے مشرقی کلیسا بغاوت کر رہے ہیں اور راسخ العقیدہ قسطنطنیہ بزور شمشیر انھیں دبانا چاہتا ہے جسٹی نین جیسے پابند مذہب شہنشاہوں کی مسلّح فوجیں باغی راہبوں کو مشرق کی طرف بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن ان کی بغاوت کو فرو نہیں کر سکتیں۔

یہ صحیح ہے کہ سنت والجماعت مذہب کے پابند امیر تیمور نے اپنی قوت بازو سے مشرق کے سرکش ممالک کو قابو میں رکھا تھا لیکن حسین میرزا بایقرا، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس کے نکمّے بیٹوں کے وقت میں ازبکوں کے خراسان میں ہرات چھین لینے سے تیموری سلطنت کا آخری ٹکڑا بھی تلف ہو گیا۔

مشہد ہاتھ میں آجانے کے بعد بالکل قدرتی بات تھی کہ شیبانی خاں کے فاتح اُزبک مغرب کی ان کاروانی شاہراہوں پر آگے بڑھیں جو بحر خزر اور وسط ایران کے اضلاع کرمان کو جاتی تھیں۔ اس پیش قدمی پر نو وارد شاہ اسمٰعیل نے باضابطہ احتجاج کیا اور لکھا کہ اُزبک ان علاقوں میں گھس آئے جو موروثی حق کی بنا پر میرے ہیں۔ اس دعوے کو سن کر حقیقت پسند شیبانی بھی حیران ہوا ہوگا

کہ اس نے ذرا غیر رسمی طور پر پلٹ کر پوچھا "تمھیں کس وراثت سے یہ حق حاصل ہوا؟" اور اس کا یہ سوال کرنا کچھ بیجا نہ تھا۔ اسمٰعیل نام ہی اس وحشت کدے میں سخت اجنبی، پردیسی معلوم ہوتا تھا۔ اس نام کا ۱۲ سالہ نوجوان کوہستان قاف کی بلندیوں سے اُتر کر آیا اور مغربی ایران کے ملوک طوائف کو روندتا چلا جاتا تھا۔ وہ ایک امام کی اولاد میں ہونے کا دعوی دار تھا اور اس کی دادی طرابزدن کی بازنطی شہزادی تھی۔ باپ حیدر شیخ تھا۔ "کالی بھیڑ" (قرہ قونیلو) اور "سفید بھیڑ" (آق قوئیلو) والے ترکمان کی خانہ جنگی میں اسمٰعیل نے کامیابی حاصل کی۔ شاید اپنے خیالی منصوبوں کی بنا پر کم از کم دشمنوں کی نظر میں وہ ناقابل فہم، نہایت سفاک اور مذہبی مجنون قسم کا آدمی تھا۔ دور دست پہاڑوں کے ترک قبیلے اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور نئے مذہب کے جوش نے ان میں ایسی طاقت بھری کہ صفوی ناقابل شکست ہو گیا۔ ان ترقبیلوں کے شہ سوار "قزل باش" (سرخ کلاہ) کہلاتے تھے اور ہر طرف ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اپنی ترک تازوں میں یہ مغل ایل خانوں کے سابقہ پائے تخت تبریز سے خلفائے عباس کے افسانوی شہر بغداد تک کھوند آئے۔ جنوب مشرق میں اصفہان پر حملہ آور ہوئے جو صفوی بادشاہوں کا پائے تخت بننے والا تھا۔ خانوادے کا بانی یہی اسمٰعیل تھا اور یا اس کے باپ شیخ (صفی الدین۔ مترجم) کو قرار دے سکتے ہیں۔ ازبکوں کی پیش قدمی پر احتجاج کرتے وقت اسمٰعیل اصفہان ہی میں تھا اور خلافِ عادت سکون سے وقت گزار رہا تھا۔ ادھر ازبکوں کے سب سے اگلے قراول جُوق اصفہان سے چند روز کی مسافت پر لوٹ مار کر رہے تھے۔

ضمناً یہ بھی لائق ذکر ہے کہ یورپ کے بعض سیاست دان کچھ پہلے سے شاہ اسمٰعیل کی جانب پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے جیسے وہ سفید بھیڑ والے ترکمان اوزون حسن کے نگران رہے۔ یورپ والوں کی اس خاص توجہ کے کئی معقول سبب تھے۔

سن ۱۴۹۹ء کے قریب، جب کہ اسمٰعیل نے اپنی شاہی کا اعلان کیا، وینس کے سفیر تبریز و اصفہان تک چلتے ہوئے آئے کہ اس جاں بلب "جمہوریۂ ستینہ" کی برّی راستوں سے تھوڑی بہت تجارت کی صورت نکالیں۔ علیٰ ہذا پرتگالی بیڑوں نے جو ہندوستان کی مالامال بندرگاہوں پر آنے جانے لگے، صفوی سے دوستانہ روابط کے لیے اپنے وفد بھیجے، کیونکہ فارس کا ساحل ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ پھر سلطنت عثمانیہ کے یورپی دشمن "THE SOPHY" کا روز افزوں عروج دیکھ کر

ادھر مائل ہوئے۔ کیونکہ ترکانِ آلِ عثمان اب قسطنطنیہ کو دارالخلافہ بنا کر یورپ میں برابر آگے بڑھ رہے تھے اور ایران کے شیعی اُن سُنّی ترکوں کے دشمن تھے۔ علاوہ ازیں یورپ کے سوداگروں کی بڑی خواہش تھی کہ صفوی اندرونِ ایشیا میں انھیں کوئی نیا راستہ فراہم کر دے گا۔

لیکن بالفعل اسمٰعیل اپنی مملکت میں نیا انتظام قائم کرنے میں مصروف تھا اور سلطان ترکی جیسے زبردست حریف سے اُلجھنا نہ چاہتا تھا۔ سلطان بایزید ثانی، سلطان محمد فاتح کا فرزند، باپ کی نسبت بہت نرم خو بادشاہ تھا۔ ہرات کے صاحبِ ذوق بادشاہ حسین میرزا بایقرا کے ساتھ اس کی دوستانہ مراسلت رہی۔ اب شعلہ خُو اسمٰعیل سے بھی ایسے ہی روابط رکھنے میں اسے تامّل نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بایزید اپنے دربار کی ادبی زبان فارسی میں خط لکھتا تھا اور اسمٰعیل ایران سے اپنی مادری زبان تُرکی میں جواب دیا کرتا تھا۔

ازبک فرماں روا شیبانی یورپ سے دُور منقطع تھا۔ البتہ قازان اور استرخاں کے مغل خانوں سے اس کی مراسلت تھی اور یہ خاں ابھی تک موسکو کے "گرینڈ ڈیوک" (امیر) پر سلطانی سیادت رکھتے تھے۔ شیبانی کے قلبِ ایران میں بڑھ آنے سے شاہ اسمٰعیل کے غالی شیعوں میں سُنّیوں کی طرف سے مذہبی منافرت کی آگ بھی اور زیادہ مشتعل ہوئی اور اس نے ملک ملک میں شدید مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۵۰۹ء میں شیبانی اور شاہ اسمٰعیل کی لڑائی چھڑنے کے وقت ہی ایک اور نئی طاقت بھی ایشیا میں نمودار ہوئی۔ یہ پرتگیز تھے جن کے جنگی بیڑے نے دیو (گجرات) کے سامنے مسلمانوں کے ایک بیڑے کو قریب قریب فنا کر دیا۔ یہ بحری سرگرمیاں کابل سے کچھ بہت دُور نہ ہوتی تھیں لیکن بابر کو ان کی کچھ خبر نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہی معرکہ تھا جس میں یورپ کی ساختہ [illegible] توڑے دار بندوقوں نے فیصلہ کن حصّہ لیا۔ اس قسم کی توپیں عثمانی ترکوں کی فوج میں کارآمد [illegible] ہونے لگی تھیں اور اگرچہ خود اسمٰعیل انھیں خاطر میں نہیں لاتا تھا [illegible] کام لینا مقدر تھا۔

کابل کے اتنے دُور کٹے ہوئے ہونے ہی کی وجہ سے شیبانی اور [illegible] کی [illegible] کی خبر بھی وہاں جستہ جستہ نامربوط صورت میں آئیں جنھیں افواہ عالم نے مبالغہ آمیز بنا دیا تھا۔

پہلے دونوں طرف سے تحقیر و تہدید کی باتیں ہوئیں۔ شیبانی نے اسمٰعیل کے پاس ایلچی بھیجا،

کاسۂ گدائی اور عصا تحفے میں ارسال کیے اور یہ پیام کہ اس کے حق میں بہتر ہوگا کہ اپنے باپ کا پیشۂ فقر اختیار کرے۔ جواب میں نوجوان صفوی نے سن رسیدہ اُزبک کو چرخا اور تکلا بھیجا کہ اگر تلوار کی نوک سے جان چُراتا ہے تو اپنی ماں کی سہیلیوں میں زندگی گزارے۔ کیونکہ شاہ مشہد کی درگاہ میں حاضری دینے چل پڑا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ شیبانی سے ملاقی ہوگا۔

۱۵۱۰ء کی گرمیوں میں اُزبک سردار اپنے مفتوحہ ممالک کی بزور شمشیر حفاظت کے لیے سرحد پر ہی ڈٹا رہا۔ شمال کے نیم صحرائی علاقوں میں قزق اور جفاکش کرغز کی تاختوں نے بے اطمینانی پھیلا رکھی تھی اور چین کی بڑی شاہراہ پر ارضِ مغول میں جہاں بابر کا ماموں فرماں روائی کرتا تھا، اب وہاں خانِ کوچک نے ازبکوں کا قلادہ اطاعت اتار کر پھینک دیا۔ شیبانی کو شمال اور مشرق میں بڑی بڑی فوجیں بھیجنی پڑیں کہ اُس کا تسلط بحال کریں۔ میرزا حیدر کا بیان ہے کہ اس کی سپاہ میں تاشقند کے بیس ہزار مغل بھی تھے۔ ان کو شیبانی نے جانے کی اجازت نہ دی کہ کہیں اپنے وطن کے قریب پہنچ کر منحرف نہ ہو جائیں۔

اسمٰعیل اور اس کے قزل باشوں کی آمد آمد پر شیبانی دریا کے کنارے شہر مرو میں ہٹ آیا اور وہیں اپنے سپہ سالاروں کی طلبی کے لیے ہرکارے روانہ کیے۔ اس وقت تک یہ اُزبک تمام حریفوں کو جنگی چالوں میں نیچا دکھا چکا تھا لیکن اسمٰعیل کے سواروں کا لشکر کا لشکر بے خبر دریا کے پار آ گیا اور ازبک قراولوں سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی۔ تین روز بعد قزل باشوں نے شمال کی طرف حرکت کی۔ شیبانی کے سرداروں نے عرض کی کہ جب تک عُبید خاں اور تیمور سلطان کے امدادی دستے نہ آ جائیں ہمیں اپنے پڑاؤ کو چھوڑنا نہ چاہیئے۔ شیبانی نے نہ مانا اور اپنی کم تعداد فوج کو لے کر ایرانیوں کے عقب میں روانہ ہو گیا۔ پھر جو لڑائی ہوئی اس کی اطلاعات بدخشاں میں میرزا خان کو ملی تھیں اس نے بذریعہ خط بابر کو کابل بھیجیں کیسا فدر ہنگامہ خیز تھا۔ یہ خط جس میں مرو کے قریب لب دریا ازبکوں کی کامل ہزیمت، شیبانی کے زخمی ہو کر ہلاک ہونے اور اس کے سب بڑے بڑے سپہ سالاروں کے مارے جانے کی اطلاع تھی اور یہ کہ ان خوف انگیز ازبکوں کو تتر بتر کر کے شاہ اسمٰعیل مرو سے ہرات تک جھاڑ دیتا ہوا گیا اور بعد میں یہ بھی مشہور ہوا کہ اس نے شیبانی کے کاسہ سر کا پیالہ بنوایا اور سونے سے مرصع کر کے پینے کا کام لیا۔ نیز کھال کھنچوا کے بُھس بھروایا اور اس کی عام تشہیر کرائی — یہ افواہ تھی، اس کی پوری

صحت کا علم نہیں ہوتا۔ مزید برآں خاں میرزا نے لکھا کہ بیس ہزار جنگ آزما جو زبردستی شیبانی کے لشکر میں فتح تاشقند کے بعد بھرتی کیے گئے تھے، اس کے شکست کھاتے ہی الگ ہو کر بھاگتے ازبکوں پر پلٹ پڑے اور انھیں لُوٹ لیا (اس پر بابر کو ضرور ہنسی اور اپنے تجربے یاد آئے ہوں گے) پھر ان مغلوں نے قندز میں خان میرزا کے پاس آکر درخواست کی کہ بابر بادشاہ کو بلایا جائے۔ پھر حیدر میرزا لکھتا ہے کہ جونہی بادشاہ نے خط کا مضمون پڑھا، کمال عجلت کے ساتھ قندز کو چل پڑا حالانکہ یہ عین وسط سرما کا موسم تھا اور بالائی درے بند تھے۔ مگر اس وقت تک بابر کو اپنی مملکت کے زیریں دروں کے راستے بھی خوب معلوم ہو چکے تھے۔ ازبکوں کی اس مصیبت کُبریٰ کو وہ سمجھا کہ سمرقند واپس لینے کا یہ خدا ساز موقع نکل آیا ہے۔

پتھر کے پُل پر جنگ اور فتح

اس سفر میں بابر نے نوعمر حیدر میرزا اور سعید خاں چغتائی کو ہمراہ لے لیا تھا۔ کیونکہ ان دونوں نے ساتھ لے چلنے کی منت سماجت کی۔ یہ دونوں سخت بے سروسامانی میں کابل آئے تھے۔ حیدر، حسین میرزا کا بیٹا تھا جس نے بابر کے خلاف بغاوت کی، شیبانی کے پاس جا کر اس کی ہجو کی لیکن شیبانی ہی کے حکم سے قتل ہوا۔ چغتائی بابر کے چھوٹے ماموں کا واحد سلامت ماندہ لڑکا تھا اور اسے بھی ہلاک کرنے کا شیبانی حکم دے چکا تھا۔ بابر نے دونوں کو جس محبت سے رکھا اس خوش دلی کا وہ آیندہ عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔ حیدر لکھتا ہے "(بادشاہ بابر نے) مجھ سے کہا ذرا غم نہ کھاؤ۔ شکر کرو کہ تم سلامت میرے پاس آ گئے تمھارے باپ اور بھائی کی جگہ میں موجود ہوں...... میرے لیے سخت رنج و غم کا دن تھا۔ جب کہ میرا باپ مارا گیا لیکن اب بادشاہ نے مجھ سے وہی پدرانہ شفقت فرمائی جیسی باپ کرتا تھا۔ جب سوار ہو کر باہر جاتا تو مجھے اس کے پہلو میں چلنے کی عزت حاصل ہوتی۔ میرے درس کا وقت ختم ہو جاتا تو بادشاہ یاد کر کے کسی کو بھیجتا کہ مجھے لے آئے...... جب تک میرا قیام رہا یہی پدرانہ سلوک کرتا رہا۔" سعید خاں نے اپنی شہادت کا اضافہ کیا ہے: "کابل میں میرے جو دن گزرے فکر و تشویش سے خالی تھے...... سب لوگوں سے میرے تعلقات دوستانہ تھے اور وہ سب میرے ساتھ مہر و محبت سے پیش آتے تھے۔ کبھی دردِ سر کی بھی شکایت مجھے نہیں ہوئی۔ بجز اس کے کہ زیادہ پی جانے سے سر بھاری ہو گیا ہو۔"

انہی دونوں کے بیانات سے سمرقند جانے کے واقعات واضح ہوتے ہیں۔ قندز میں سب اہلِ خاندان کا اجتماع ہُوا۔ اندرونی اختلافات بھی لازماً سر سرلتے رہے۔ پورے مجموعے میں قوت کا توازن مغول کے ہاتھ میں تھا جو اس وقت بغیر کسی سردھرے کے سرگرداں تھے۔ قدامت پرستی کی بنا پر یہ سخت کوش منگو تاشقند کے سابق والی کے بیٹے سعید خاں کے سوا اور کسی کی بادشاہی قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ اُن میں خفیہ کام کرنے کا قدرتی میلان تھا چنانچہ سعید خاں سے صیغہ راز میں درخواست کی کہ اپنا موروثی منصب سنبھالے۔ قدیم علم کھڑے کرکے مغلوں کی سنّت کے مطابق ان کی برکت حاصل کرے اور بابر کو جو پکا مغل نہ تھا، اپنی راہ جانے دے۔ چاہے اس میں لڑائی کی نوبت آ جائے۔ سعید خاں نے یہ پیشکش منظور نہیں کی۔ اس نے کہا "شیبانی کے سیلِ بے پناہ میں بابر بادشاہ نے مجھے پناہ دی اور بڑی عنایت سے پیش آیا۔ احکامِ الٰہی کے خلاف ہے کہ اپنے محسن سے احسان ناموشی کروں۔" دوسری طرف بابر کو پیام کہلا بھیجا کہ "خدا کی رحمت سے بہ کثرت لوگ آپ کی سرکار میں واپس آ رہے ہیں۔ خصوصاً مغل قوم جس کی تعداد اور قوت کسی سے کم نہیں اور جس کے بادشاہ دنیا کے بزرگ ترین بادشاہ ہوئے ہیں، وہ بھی آپ کی طرف رجوع ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں میرا آپ کے قریب رہنا دور اندیشی کے خلاف ہے۔ رفاقت لامحالہ مفارقت میں بدلنی پڑے گی اور ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا کہ آپ مجھے کسی اور جگہ بھیج دیں جہاں ہمارے تعلقات مہر و اخلاص کی استواری میں فرق نہ آ سکے۔"

بابر نے یقیناً چغتائی مغل بادشاہی کے وارث کا اشارہ سمجھ لیا اور اس کی شرافت و مروّت کا اعتراف کیا ہوگا۔ ایسے مخلوط لشکر میں دونوں کا حکم تو چل نہ سکتا تھا۔ بابر اپنی سلطانی سیادت کا دعویٰ رکھتا تھا اور ادھر بیس ہزار مغل وطن کی یاد میں بیقرار، سعید خاں کی بادشاہی کے طالب تھے۔ غرض جلد ہی فیصلہ کیا گیا کہ نوجوان شہزادہ اپنی "ذاتی" فوج لے کر نیم صحرائی مملکت "مغولستان" کو چلا جائے۔ رخصت کرنے سے پہلے بابر نے قدیم مغل رسم کے مطابق اس کی جانشینی کا دربار کیا اور "سعید چغتائی را اپنے باپ، یعنی بابر کے ماموں کی بجائے، خان بنا دیا گیا۔"

بعض مغل گروہ، خصوصاً ایوب بیگ چک کی برادری جنھوں نے بابر کی ملازمت میں آنے سے پہلے خسرو شاہ کی نوکری کی تھی، بابر ہی کی فوج میں رہ گئے۔ بعید شمالی علاقے میں نئے فرماں روا کی پختہ دوستی آیندہ بھی بادشاہ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ مغلوں کے چلے جانے سے متحدہ لشکر کا سب سے

توی جُزْ وجُدا ہوگیا، لیکن بابر نے سمرقند کا بنیا بانہ کوچ جاری رکھا اور اس شدّ و مدسے پگھلتی برف کے راستے بڑھے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی کم تعداد فوج میں بہت سے لوگ جو ادھر اُدھر دبک رہے تھے آکر شریک ہو گئے۔ حیدر میرزا کے (مقتول) باپ کے پُرانے رفیق بھی اسی کے پرچم تلے جمع ہوئے اور اس نے ازراہِ مصلحت اپنی سپاہ کی بھی سپہ سالاری نو عمر حیدر میرزا کے تفویض کر دی حیدر نہایت مسرور ہُوا اور اپنا پہلا معرکہ ازبکوں کی منتشر جمعیت سے پتھر کے پُل پر دیکھا جو آمد دریا کی ایک دھار پر بنا ہوا تھا۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی اور بابر کے پہلو میں ایک ٹیکرے پر کھڑا حیرت سے ہزاروں سواروں کا ادھر سے اُدھر دَوڑنا، چیخ پکار کے ہنگامے اور کشت و خون کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ایک بار جو ازبکوں نے نالہ اُتر کے اوپر چڑھنا شروع کیا تو لکھتا ہے کہ "بادشاہ کی نظر میرے قریب کے آدمیوں پر پڑی۔ دریافت کیا یہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا ہم حیدر میرزا کی جمعیت میں ہیں۔ بادشاہ میری طرف مخاطب ہوا اور کہا تم ابھی بہت کم عمر ہو اس خطرناک کام میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ تم میرے پاس رہو۔ مولانا محمد اور چند سپاہی تمھارے پاس ٹھہریں گے باقی جوانوں کو خان میرزا کی کمک کے لیے بھیج دو۔" اتنے میں میری جمعیت کے لوگ ایک قیدی پکڑ کر لائے۔ بادشاہ نے کہا شگون اچھا ہے۔ اس قیدی کو حیدر میرزا کے نام لکھا جائے۔"

مغرب کے قریب ازبکوں کی صفیں پراگندہ ہو گئیں۔ ان کے تین سپہ سالار اسیر کر کے لائے گئے "بادشاہ نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شیبانی نے مغل خانوں اور چغتائی سلطانوں کے ساتھ کیا تھا۔"

بابر فتح پانے کے بعد ستانے کا قائل نہیں۔ بے سرے ازبکوں کا پوری قوت سے تعاقب جاری رکھا اور درۂ آہن کے درے سے گزر کر کرشی کو لپیٹ میں لیتا ہوا سُرخ میدانوں تک پہنچ گیا کرشی میں اُزبک عبید خاں نے محافظ فوج جمع کر لی تھی۔ مگر بخارا پہنچے تو وہ "سپاہیوں سے خالی (؟) اشغول سے بھرا ہوا تھا۔" پھر فاتحانہ سمرقند پر بڑھے تو اُزبک بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس علاقے اور اوپر فرغانہ کے قلعوں سے ہر جگہ اُزبک جمعیتیں مار مار اپنے اہل و عیال کو لے کر واپس صحرائی علاقوں کو بھاگ رہی تھیں۔

نو سال کے بعد ۱۵۱۱ء میں بابر امیر تیمور کے شہر میں دوبارہ وارد ہُوا: "ساری نواح کے باشندے، کیا امیر کیا کسان، اہل حرفہ، اعیان و عمائد سبھی بادشاہ کی آمد پر شادمانی کا اظہار

کرنے گھروں سے نکل آئے۔ امرا نے اُسے گھیر لیا۔ غریب غُربا اپنے گھروں کی آرائش میں مصروف ہوئے۔
گلی کوچے بازار، بادلے اور زری سے سجائے گئے۔ جگہ جگہ قطعات اور تصویریں لٹکائی گئیں۔

یہ کسی جِنّ کا کرشمہ نظر آتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے وہ سب مانوس مقامات جہاں بازگشت لگاتا تھا اور خانوادۂ تیموری کے ممالک ایک مرتبہ پھر بابر کے زیرِ نگیں آگئے۔ اس کا بھائی کابل و غزنیں میں اس کی طرف سے حاکم تھا۔ قندز اور بدخشاں نئے والی خان میرزا کے اطاعت گزار تھے۔ اندجان سے تاشقند تک ہر شہر کے دروازے کھل گئے تھے اور نیم صحرا کی مغل ولایت میں اس کا حلیف سعید خاں فرماں روا ہو کر آگیا تھا۔ پہلی مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ بابر واقعی پادشاہ (یا شہنشاہ) کے لقب کا سزاوار ہو گیا ہے۔

لیکن یہ ظاہری احوال حقیقت سے دور تھا۔ شیبانی کے سدھائے ہوئے سپہ سالاروں کی قیادت میں خوفناک ازبک اگرچہ شمال میں پسپا ہوئے ـــــ اور وہ بھی شاہ اسمٰعیل کی قوت سے، لیکن پوری طرح مغلوب نہیں کیے گئے تھے۔ پھر مشترکہ دشمن شیبانی کے دفع ہونے کے بعد، بابر کو اس متعصب ایرانی سے مصالحت کی کوئی صورت نکالنی تھی۔ اور یہی وہ کوشش تھی جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اس بار سمرقند میں اس کی حکومت صرف آٹھ مہینے رہی۔

وقتِ ضرورت

ہمارے شیر اور شاہ اسمٰعیل کے درمیان جو مراسلت ہوئی وہ معمّا ہو کے رہ گئی ہے۔ بابر کی تزک سے ان سنین کے اوراق تلف ہو گئے لہٰذا اس کا اپنا بیان بھی مفقود ہو گیا۔ دوسرے اہلِ قلم جیسے حیدر میرزا اور مؤرخ خواندمیر کے بیانات بہت تشنہ اور متضاد ہیں۔ جنبہ داری، مذہبی تعصبات اور بعد کے سیاسی مصالح نے انھیں متاثر کر دیا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسی ہنری نوار اور شاہ فرانس کی "کیتھولک ہیوگنو" (فرانس کا احتجاجی فرقہ) مجادلۃ کے قصّے جو بعد کی افواہوں پر مبنی تھے۔ ہمیں رغبت تو ہوتی ہے کہ بابر کی نسبت کہیں کہ وہ سمرقند کو طریقِ سنّت کے عوض خریدنے پر مائل تھا لیکن یہ پوری سچی بات نہ ہوگی۔ ہر چند ہمیں ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ اس کے محرکات کیا تھے لیکن جو کچھ عمل کیا وہ پوری طرح واضح ہے اور یہی عمل اس کے افکار و استدلال ذہنی کی خبر دیتا ہے

جسے حیدر میرزا نے "اس کے وقت ضرورت" سے تعبیر کیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ صفوی نے اس کی بڑی بہن خانزادہ بیگم کو جنگ مرو کے بعد شیبانی کی لشکرگاہ میں پایا تو عزّت حرمت کے ساتھ بدرقہ دے کر بابر کے پاس بھیج دیا۔ یہ بلند حوصلہ جوڑ توڑ والی شہزادی شیبانی کے نکاح میں رہی اور اس سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا لیکن شیبانی نے اپنے دشمن بابر کی طرفداری میں اس کے ساز باز سے مشتبہ ہو کر طلاق دے دی اور ایک بڑے ازبک سردار سے اسے بیاہ دیا۔ یہ سردار اور شیبانی دونوں مرو میں ہلاک ہو گئے تھے۔ بظاہر خانزادہ کی بھائی سے دلی محبّت میں فرق نہ آیا تھا۔ اور بہرحال وہ ازبک دربار کے جملہ کوائف بابر کے پاس لائی تھی۔

پُراسرار صفوی کا یہ فعل مروّت و شائستگی کا آئینہ دار تھا۔ بابر نے بھی اس کے شکریے میں اپنے سفیر ہرات روانہ کیے۔ اسمٰعیل کی عنایت کا اعتراف کرنے کے علاوہ یہ بھی دریافت کرنا مقصود تھا کہ آئندہ روابط کی کیا شرطیں ہوں گی۔ پھر دوسرے کاموں سے فرصت ملتے ہی خان میرزا کو سفارت کا سربراہ بنا کر صفوی دربار میں بھیجا۔

واضح رہے کہ خانزادہ بیگم کو لے کر جو قزل باش محافظ آئے تھے، ان کے سرداروں نے بابر کے سمرقند پر جھپٹنے میں بھی عملی حصّہ لیا اور تیمور کے تاریخی تخت پر متمکن ہونے کے بعد بابر نے معقول تحفے تحائف دے کر انھیں رخصت کیا تھا۔ غرض یہ کہ اسمٰعیل کی طرف سے جو شرائط پیش ہوئیں وہ پتھر کے پل اور سمرقند پر بابر کے فتح پانے کے بعد ہی مرتب کی گئی تھیں۔ انھیں خان میرزا بابر کے پاس لایا اور اگرچہ اختلافی بیانات نے اُنھیں مبہم کر دیا ہے لیکن حقیقت میں وہ درشتی سے خالی نہ تھیں۔ شاہ اسمٰعیل نے تیموری وارث کو تخت سمرقند پر قائم رہنے میں مدد کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ بابر اس ایرانی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لے۔ مزید برآں وہ شرطیں جن کو مناقشے کے غبار نے دھندلا کر دیا ہے، یہ تھیں کہ آئندہ سکّے [illegible] اسمٰعیل اور بہ تصحیح مترجم) دوازدہ اماموں کے نام کندہ کرائے جائیں جو اس کی شہنشاہی کا [illegible] باضابطہ اعتراف ہوں اور اسی طرح خطبے میں (اپنی بجائے) شاہ کا نام پڑھوایا جائے۔

اسمٰعیل نہایت متعصب نوجوان تھا۔ بابر کے مزاج میں رواداری تھی۔ تیس برس کی عمر میں اٹھارہ سال جنگ و جدال میں گزارے۔ عزّتِ نفس رکھنے میں کسی سے کم نہ تھا۔ اسی زمانے میں خانزادہ بیگم نے ازبکوں کی قوت اور منصوبوں کی خوف انگیز تفصیلات سنیں اور قرینہ غالب یہی ہے کہ وہ پوری طرح

سمجھ گیا تھا کہ سمرقند جو محض خدائے تعالیٰ کی کریمی سے دوبارہ ہاتھ آیا، ایرانی فاتح خراسان کی مدد کے بغیر وہ اس قبضہ نہ رکھ سکے گا پھر بابر کے حلقے میں خاص خاص صوفیہ، چھپے ہوئے "ایشان" عالم خیال میں پرواز کرنے والے درویش اور سب سے بڑھ کر حضرت جامیؒ کی (جو راسخ العقیدہ سنی ہونے کے ساتھ صوفی بھی تھے) یاد باقی تھی۔ اس کے ذہن میں عقیدے کی یہ الجھن صاف نہ ہوئی تھی کہ خدا کو محیط کل (ہر جگہ ہر طرف موجود) مانا جائے یا سنی مذہب کے مطابق انسان سے بالکل جدا گانہ ہستی جس کی حسب احکام ربی عبادت فرض ہے۔ صفوی بادشاہ اوّل الذکر اعتقاد رکھتا تھا[1]۔ مرحوم شیبانی طریق آخر کا پابند تھا۔ بہ نظر بظاہر یقینی ہے کہ اس زمانے میں بابر کے دل میں شیعی عقائد کی بھی وہی حرمت تھی جیسی طریق سنت کی۔ یہ شہادت بھی موجود ہے کہ اس نے اسمٰعیل کی شرط کے مطابق بعض سکوں پر امام کا نام ضرب کرایا۔ اسی سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ بخارا اور سمرقند کے منبروں سے خطبے میں بھی شاہ اسمٰعیل کا نام پڑھوایا گیا ہوگا۔ اہل ملک میں اس سے بڑھ کر ناگواری کی بات نہ ہو سکتی تھی۔ بخارا بزرگان اولیا کے مقابر سے گھرا ہوا تھا۔ وہ سب سنی اہل علم و عرفان تھے اور شہر "قبّۃ الاسلام" یعنی (عقاید سنت والجماعت کا مرکز) کہلاتا تھا کم و بیش ایسا ہی سمرقند تھا۔ یہاں والوں نے کمال شادمانی سے بابر کا خیر مقدم کیا تھا کیا وہ اس لیے تھا کہ بابر ایک ملحد شیعہ کا خود کو باج گزار بنا لے گا۔ ایسے بے دین شاہ کا جس کے ہاتھ ان شہیدوں کے خون سے آلودہ تھے جنھوں نے ہرات میں سچے دین سے منحرف ہونا منظور نہیں کیا [حقیقت میں مسلمانوں کے معزز شیوخ سے شاہ اسمٰعیل کے روبرو جرح کی گئی اور بے گناہ قتل کر دیے گئے تھے] میرزا حیدر لکھتا ہے کہ "سب لوگ خصوصاً اہل سمرقند توقع کرتے تھے کہ کو ضرورت کے وقت بادشاہ نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کر لیا ہو، سمرقند کے تخت پر، جو خاص سنّت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تخت تھا، قدم دھرنے کے بعد وہ اسمٰعیل کی شاہی سے تبرّ[illegible] کرے گا جس کے مذہب کی نوعیت الحاد، اور نشان گدھے کی دُم ہے۔" بچارے حیدر میرزا کے دل میں لڑکپن کے باوجود اپنے ممدوح بابر کی عقیدت مندی میں سخت تزلزل آگیا کیونکہ

---

[1] مصنّف کا مطلب "وحدت الوجود" سے ہے۔ لیکن واقفیت کی کمی سے اس کا یہ سارا بیان نادرست خیال کیا جائے گا۔ شیعہ عقائد میں یہ اعتقاد شامل نہیں ہے اور نہ سنیوں کو اس سے مطلق انکار ہے۔

(مترجم)

پُرجوش سُنّی تھا۔ اب اس نے بادشاہ کے پہلو میں سوار ہونا چھوڑ دیا اور بیماری کے عذر پر جو واقعی تھی یا اختفا دی، اپنے کمرے ہی میں وقت گزارتا تھا۔ اس کا قول کہ بابر نے قزل باشوں کا لباس زیب تن کیا، فارسی زبان کا استعارہ ہے بعض مصنفوں نے اسے غلطی سے بیانِ واقعہ سمجھ لیا۔ بابر نے قزل باشوں کی چونچ والی ندے کی سُرخ کلاہ جس سے مسلمان نفرت کرتے تھے اور ان کا سُرخ پھاپنے کا کپڑا کبھی نہیں پہنا۔ البتہ اس لباس میں ایرانی عہدہ دار ہر جگہ اُس کے ہم راہ رہا کرتے تھے۔

ادھر معلوم ہوتا ہے ان ایرانی عہدہ داروں نے شاہ کو اطلاع دی کہ بابر کا برتاؤ باج گزار کا سا نہیں، بلکہ نخوت آمیز ہے۔ ۱۲-۱۵۱۱ء کے جاڑوں ہی میں شیر اپنی سیاسی ضرورت اور اس ملک کے مذہبی جذبات کے درمیان پھنس گیا۔ سمرقند والوں کو راسخ العقیدہ سُنّی شیبانی کے عہد حکومت کی شدّت سے یاد ستانے لگی۔ اس فرماں روا نے شیطان اور یزداں کے درمیان بہت امتیاز کیا اور اس میں کوئی ابہام نہ آنے دیا تھا۔ اس کی سنگ دلی صرف سیاسی خطا کاروں کا خون بہاتی تھی بخلاف وحشی اسمٰعیل کے جس نے اہلِ علم و عرفان کو شہید کیا اور وہ سوال کرتے تھے کہ کیا شیبانی خود شہید نہیں تھا۔

اسی جاڑے میں بابر نے شراب پینی شروع کی اور جب پیتا تو بے تحاشا پیے چلے جاتا تھا۔

۱۵۱۲ء میں برف پگھلنے کے بعد موسم بہار کے ہم قدم عبید خاں اور ازبک لشکر از سرِ نو منظم ہو کر شمال سے اُترا۔ بابر اپنی مغل جمعیت اور کابل کے آزمودہ کار سپاہیوں کو لے کر لڑنے نکلا۔ بظاہر سمرقند میں کوئی بھرتی نہیں ہوئی اور یہاں والے اس کے ساتھ نہیں گئے۔ ایک مقام حوض شاہی کے قریب اس کی مختصر فوج کو شکست ہوئی اور پیچھے دھکیل دی گئی۔ اس کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ سمرقند کی مدافعت کے لیے کافی ہوتی اور وہ تلخ تجربہ یاد تھا جب کہ یہاں کی بڑی فصیلوں کو معدودے چند محافظوں سے پہرہ دلوانے کی مصیبت اٹھانی پڑی تھی۔

دوبارہ اُسے سلامتی کی راہ وہی جنوب کی طرف کوہستان سیاہ سے گزرنے میں نظر آئی جہاں ایک سرحدی قلعے حصار میں تک گیا۔ اہل و عیال جس میں اب بہن خانزادہ اور دوسرے بیٹے کامران کا اضافہ ہو گیا تھا، ہمراہ تھے۔ بے غیرت بن کر صفوی شاہ سے مدد دینے کی درخواست کی۔ حیدر میرزا اپنے سرپرست کے ہمراہ نہیں گیا۔ افسردہ و ملول سمرقند ہی میں پڑا تھا کہ آئندہ

چند ماہ میں تقدیر کا پہیہ پھرنے کی خبر سُنی - یعنی یہ کہ مغرور صفوی نے اپنے گیارہ ہزار" ترکمان "شمشیر زن"
شکست خوردہ بابر کی مدد کے لیے بھیجے - ان کا سپہ سالار نجم ثانی بھی اپنے شاہ کی طرح غرور کے نشے میں
مست تھا - پھر کس طرح ان بے دینوں نے بابر کو لے کر دریا آمو کے قریب قلعہ کرشی کا محاصرہ کیا جہاں عبید خاں
کے کچھ گھڑ سوار اس وقت تک مقیم تھے - پھر کس طرح بابر کی رائے کے خلاف اور بغیر اس کی فوج کے خود یورش
کر کے قلعہ فتح کیا اور وہاں کے تمام باشندوں حتیٰ کہ دودھ پیتے بچوں اور معذور بوڑھوں تک کو ذبح کر ڈالا۔
بے خانماں شاعر بنائی بھی قزلباشوں کے اسی قتل عام میں جان سے گیا - اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کرشی کی
خونریزی نے اتحادیوں کے صلاح مشورے میں خرابی ڈالی - یوں بھی یہ اتحاد پہلے سے قابل اطمینان نہیں تھا۔
بابر کو کرشی کے سانحے نے تذبذب میں ڈال دیا - شیبانی خاں نے کبھی اپنی فوج کو اجازت نہ دی تھی کہ عام
شہریوں کا خون بہائیں - بخلاف اس کے نجم ثانی ان مسلمانوں کو جنھیں وہ کافر سمجھتا تھا، قتل کر کے فخر و شادمانی
سے پھولا نہ سماتا تھا - وہ بابر پر نکتہ چینی کرتا اور اس کے طرز عمل سے مشتبہ ہو گیا تھا - باہمی مشاورت میں اسی
ایرانی کا فیصلہ چلتا تھا - نتیجہ یہ کہ فوج میں نااتفاقی اور ناگواری پھیلی ہوئی تھی جب کہ نجم ثانی حریف پر چڑھ
دوڑا اور منہ کے بل گرا - کوتل غج پر بخارا کے راستے میں عُبید خاں نے دام بچھا رکھا تھا - یہاں، حیدر میرزا
اپنے پورے خطیبانہ انداز میں بیان کرتا ہے کہ "اسلام کی تلوار نے الحاد اور بے دینی کے ہاتھ قطع کر دیے۔
اسلام کی ہوائے نصرت و اقبال نے روافض کے پرچم اُلٹ دیے - ترکمانوں کو کامل ہزیمت ہوئی اور
میدان میں کھیت رہے - کرشی کے زخم تیر انتقام کے بخیے سے سیے گئے - امیر نجم اور تمام ترکمان مرداروں
کو ازبکوں نے جہنم واصل کیا - بابر بادشاہ شکست خوردہ و سرنگوں حصار کو پسپا ہوا -

آیندہ پشت میں بھی بابر اور اس کی مغل فوج پر ایرانی الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے غجدوان کے معرکے
میں نجم کے قزلباشوں کی مدد نہ کی اور پیچھے ٹھٹک رہے حالانکہ اسی موقع کے لیے انھیں ردیف میں رکھا
گیا تھا - ایسی روایتوں کے بعد اس طرح کے اعتراض و الزام ایک دوسرے پر دانستہ کیے ہی جایا کرتے ہیں لیکن
کیا ان الزامات کی کوئی اصلیت نہ تھی؟ بابر نے کرشی اور بخارا پر حملہ کرنے کے خلاف رائے دی تھی ممکن
تو ہے کہ اسی رائے کے مطابق اس نے اپنی فوج کو ان حملوں میں حصہ لینے سے روکا ہو - اور یہ بھی امکان
ہے کہ ایسے بخارا جیسے مقدس شہرت کے شہر پر وہی کچھ گزرنے کا اندیشہ ہو جو کرشی پر ترکمانوں کے ہاتھ سے
گزری تھی؟ بابر نے اس بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔

حصار واپس جاتے ہیں اس کی جان بال بال بچی۔ قزل باشوں کی ہزیمت کے بعد مغل اجیروں نے خود فائدہ اُٹھانا اور بابر ہی کو گرفتار کر لینا چاہا تھا۔ عین وقت پر اسے سوتے سے اُٹھایا گیا اور وہ گھوڑے پر چڑھ کر تن تنہا لشکر سے نکل گیا۔ تب مغلوں نے دیہات لوٹنے شروع کیے۔ برسوں بعد ان کے سردار ایوب بیگ چک نے جب کہ وہ اپنے وطن اور سعید خاں کی لشکر گاہ میں قریب مرگ تھا اقرار کیا کہ اُس رات بابر سے جو غدّاری مَیں نے کی تھی، وہ آج تک میرا جگر چھیلتی ہے۔ اسی سعید خاں کی پناہ میں حیدر میرزا، سمرقند کے سفّاکانہ کشت وخون سے بیزار ہو کر بعید شمال میں چلا آیا تھا۔

اس اثنا میں مغرب کی جانب جو واقعات پیش آئے ان کی وجہ سے شاہ اسمٰعیل کو اپنے لاؤ لشکر سمیت واپس جانا پڑا کہ ایک اور خوفناک سُنّی دشمن (عثمانی سلطان سلیم فاتح) سے مقابلہ کرے۔

جاڑوں میں اتنی برف گری اور سامان خوردنی کا ایسا قحط ہوا کہ حصار کے چھوٹے سے قلعے میں لوگ اسے خدا کا قہر سمجھے جو آپس میں مسلمانوں کا خون بہانے کے باعث نازل ہوا۔ بابر نے بدخشاں کی حکومت بدستور اپنے خالہ زاد بھائی خان میرزا کے ہاتھ میں رہنے دی اور خود ہٹیلے پن سے پھر جنوب کی آمو میں آ گیا۔ آیندہ پانچ سال (۱۵۱۳ء تا ۱۵۱۸ء) میں اس کے حالات کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ تر بلخ و قندوز کے درمیان سرحدوں سے چپکا رہا تا آنکہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ قدیم سلطنت کے کسی قطعے پر بھی قبضہ رکھنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ تب آخری مرتبہ اس نے سمرقند کے محلات اور ہرات کے باغوں کو خیرباد کہی اور کابل کو واپس روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ معروف پہاڑی دروں اور بستیوں سے اس نے طے کیا۔ سفر میں شراب ممنوعہ کے بارہا قدحے کے قدحے چڑھاتا رہا۔ ان سنین میں اس کا تیسرا بیٹا ہوا جس کا عرف "عسکری" (یعنی لشکر والا) رکھا گیا۔

شہر کابل کے دروازے پر چھوٹے اور مریل بھائی ناصر میرزا نے تپاک سے خیر مقدم کیا اور فخریہ کہا کہ مَیں نے کابل اور غزنیں کو برادر بزرگ، بادشاہ کے لیے محفوظ رکھا۔ بابر کو بھی اس جنگلی وطن میں یہ خیر مقدم دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن چند ہی روز گزرے تھے کہ ناصر کثرت مے نوشی سے بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

کابل میں اس مراجعت کے وقت خود بابر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ مفلس قلّاش لااُبالی شہزادہ نہ تھا جس کا دس برس پہلے اس شہر میں داخلہ ہوا تھا کہ بے نوائی کے باوجود ہمّت بلند اور منصوبے

بڑے بڑے تھے ۔ مراجعت کے وقت ناز و نخوت کی گردن ٹوٹ چکی تھی اور حال و مستقبل کی کچھ فکر نہیں رہی تھی ۔ لطف شراب میں افیون و بھنگ کا اضافہ کر لیا تھا اور آشفتہ مزاجی کی گھڑیوں میں خطا کاروں کو سخت عذاب دے کر قتل کرنے کے حکم نافذ کر دیتا تھا ۔ شکار جو پہلے بڑی تفریح کا مشغلہ تھا، اب محض جان داروں کو مار ڈالنے کا جذبہ رہ گیا تھا ۔

بابر کی طبیعت میں اس تبدیلی کی تاویل میں بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے موروثی "مغل" خون کا ظہور تھا ۔ لیکن اوّل تو اس کی رگوں میں "مغل" خون کی آمیزش بہت کم تھی، دوسرے اپنے فرغانہ کے عہد میں اس پر یہ بے رحمی کے دورے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے ۔

کابل کے ان افسردہ سنین میں خانزادہ بیگم اچھے دنوں کی یاد دلایا کرتی تھی ۔ اس نے علی یزدی کی کتاب "ظفر نامہ" جسے پہلے بھی پڑھا کرتا تھا، پھر پڑھی ۔ امیر تیمور کی فتوحات کی پُرتکلف فارسی میں مدح و ثنا پڑھ کر اسے اپنی ناکامی اور بھی نمایاں نظر آتی ہو گی ۔ جنگ میں شکست، سمرقند میں خود اپنے اہل ملک کا انحراف اور طعنے کہ بے دین صفوی کی جوتیاں چاٹتا ہے، زیر پرورش حیدر دوغلات کا اسے چھوڑ دینا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عمر بھر کے دشمن شیبانی کی شبیہ کا مرنے کے بعد بھی اس پر غالب آ جانا ـــ یہ سب باتیں بابر کو اپنی زندگی سے نفرت دلاتی تھیں ۔ اپنے آپ کو "پادشاہ" کے لقب سے تو ملقب کیا ۔ لیکن قوت کا مدار چند دانش مند مشیروں کے سوا، تھا تو اُن مغل شمشیر زنوں پر جن کی وفاداری پر کوئی بھروسہ نہ ہو سکتا تھا ۔ حکومت، وادی کے ایک قلعے پر ۔ اور حالت یہ کہ غلّے کے لیے افغانی قبائل پر تاختیں کرنی پڑتی تھیں ۔ ادھر شراب خوری کی معصیت میں روز بروز زیادہ مبتلا ہوا جاتا تھا ۔ "پادشاہ اسلام" ایک طرف کیا کسی مسلمان فرماں روا کی صورت یہ ہو سکتی تھی ؟

مغل سپاہ نے حسب معمول پھر جو غدر کیا، تو بابر نے وحشیانہ سفاکی سے انھیں کچلا اور اسی قسم کی بے رحمی قدیم افغانی باشندوں کی مورچہ بند بستیوں کو تاراج کرنے میں دکھائی ۔

بایں ہمہ بہ پختہ عمر بابر توہم کی قید سے چھوٹ گیا تھا ۔ کسی حلیف و مددگار کی اُسے تلاش نہ رہی تھی اور سن رسیدہ قاسم بیگ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کو اپنی رائے پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا ۔ اسے صرف اپنی ذات پر بھروسہ تھا اور وقتی ترنگ میں آ کر فتوحات حاصل کرنے کی امیدیں باندھنی بھی اس نے چھوڑ دی تھیں ۔ اس نے پہلی مرتبہ بعید افقوں پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی ۔ اس کی قدیم میراث

ازبک اور ایرانیوں میں بٹ گئی تھی اور اسے واپس لینے کا کوئی امکان نہ تھا۔ البتہ بدخشاں کی منفرد داری باقی تھی اور بابر نے پوری استقامت سے اس کے پہاڑی راستے کھلے رکھے ۔ یہ ہندوکش کے دشوار گزار بلند دروں سے گزر کر بدخشاں کے محفوظ حصار تک جاتے تھے ۔ یہ ولایت اس نے اپنے رشتہ دار خان میرزا کے سپرد کی اور برابر اس کا خبرگیراں رہا۔ بعض اہل الرائے باور کرتے ہیں کہ اسے قبضے میں رکھنے کی سخت کوشش کا مقصد یہ تھا کہ سمرقند کی بازیابی کے لیے بدخشاں سے مجبر کا کام لیا جائے ۔ لیکن ایک اور قرینہ یہ ہے کہ وہ اسے محفوظ رکھنے کا اس لیے خواہاں تھا کہ اگر کابل سے نکلنا پڑے تو وہاں پناہ لی جا سکے ۔ پہلے بھی ایک نازک وقت میں وہ اور قاسم بیگ بحث کر چکے تھے کہ ان کے سامنے دو ہی مامن ہیں : بدخشاں یا ہندوستان کا میدانی علاقہ ۔

ان اندھیرے دنوں میں بابر کا خیال پھر سندھ پار کے زرخیز میدانوں کی طرف منعطف ہوا ۔ معمولی تاخت ہی سے مواشی ، پارچہ ، اموال منقولہ کی معقول مقدار وہاں سے ہاتھ آگئی ۔ لڑکپن میں اس نے سمرقند کی ان تصاویر کو غور سے دیکھا تھا جن میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے مناظر دکھائے گئے تھے ۔ اس بڑی یورش کی تفصیلات ، اسی پر تکلف انشاپردازی میں ظفرنامے کے اوراق میں مطالعہ کی تھیں ۔ اپنی سرکش رعایا یعنی افغانی قبائل پر بار بار چڑھائیاں کرنے سے کہیں زیادہ نفع کا سودا اور یقیناً معقول بات یہ تھی کہ اپنی باقی ماندہ فوج کو لے کر خیبر کے پار جائے اور ہندوستان کے مال غنیمت سے اپنا خزانہ معمور کرے ۔

لیکن خیبر کا راستہ ہو یا سوات کے بلند پہاڑ ، یا درۂ قرم ، حملہ گزرگاہوں پر پٹھانوں کا پہرا تھا ۔ دریائے سندھ اور اس کے درمیان یہ قبائلی پٹی حائل تھی اور بابر کو یہ بھی معلوم تھا کہ کسی بے پروا سپہ سالار یا شکست خوردہ فوج کے ساتھ یہ عیسیٰ خیل ، یوسف زئی اور آفریدی کس قسم کا سلوک کرتے ہیں ۔ لہذا ہندوستان کے دولت کدوں تک پہنچنے سے پہلے ضروری تھا کہ ان پہاڑ کے خدائی فوجداروں کو یا کاملاً مرعوب کر دیا جائے یا دوست دار بنا لیا جائے ۔ سارے افغانوں کو مغلوب و محکوم کرنے کا خیال اس نے اب چھوڑ دیا تھا ۔

بابِ ششم

ہندوستان کا راستہ
افغان بی بی کی ضمنی نقل

پُرانے چینیوں کی ایک کہاوت ہے کہ "سڑکیں بدل جائیں، پہاڑ کبھی نہیں بدلتے" پھر مرورِ زمانہ سے شوارع ہی نہیں بدلتے ان کے آس پاس رہنے والے بھی کچھ نقل مکانی سے کچھ دخیل تہذیبوں کے میل سے بدل جایا کرتے ہیں یقینی ممالک میں سلطنتیں تک بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ لیکن اونچے پہاڑوں کے بسنے والے بالکل نہیں بدلتے اور یا اتنی خفیف تدریج سے بدلتے ہیں کہ ہم کو فرق کا پتا نہیں چلتا۔ سرحد ہسپانیہ کے پہاڑی باسک سب سے الگ تھلگ ہونے میں قاف کے گرجیوں کی مثل ہیں اور مدتوں تبت والوں کے مشابہ رہے، سوائے زمانہ حاضرہ کے۔

عجیب بات ہے کہ افغانستان کی پہاڑی قومیں، اپنی نامتغیر باشندہ چراگاہوں میں، سکندر یونانی کے زمانے میں بھی ویسی ہی تھیں، جیسی بابر کے عہد میں اور آج بھی ان کے نام تک قریب قریب وہی چلے آتے ہیں مزید برآں انھوں نے تاریخی انقلابات تماشائیوں کی طرح الگ رہ کے دیکھے اور بڑے بڑے واقعات عوامی حافظے میں لٹکائے رکھے۔ انھوں نے ان واقعات کو خود اپنے ہاں کی کہانیاں بنالیا جو ان میں اس طرح معروف ہیں جیسے مقامی مزارات، گو ہمارے لیے بڑے بڑے پتھروں کے یہ سرِ راہ مقبرے نامعلوم اولیا کے ہیں اور سان کی مذکورہ بالا قسم کی کہانیاں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثلاً سفید کوہ کے برفانی خط کے کنارے جو کرد قبائل آباد ہیں انھوں نے سکندر یونانی کا خود حصہ بنایا اور اسے تحریر بھی کرلیا ہے اس سکندر نامے میں یہ مشہور فاتح عجیب عجیب کارنامے انجام دیتا ہے۔ اتھاہ سمندروں کی تہوں تک

کھنگال ڈالنا اور فرشتے عزرائیل کے ساتھ مل کر سدِ سکندری تعمیر کرتا ہے کہ یاجوج ماجوج دیوار میں بند رہیں ـــــ اور یہ یاجوج ماجوج چنگیز خاں کے لشکر ہیں۔

بابر کے باب میں یوسف زئی پٹھانوں نے اس کی آمد کا خود ہی افسانہ گھڑا اور اس میں عشق و محبت کی چاشنی دے دی ہے۔ اسے ایسے لطائف سے رنگا ہے کہ صداقت کا پابند مورخ توسُن کر کانپ جائے گا۔ بایں ہمہ یہ بابر کی ایک تصویر ہے جسے قبائلی حافظے سے اُتارا گیا تھا۔

افغان بیگم کی اس نقل کا خلاصہ یہ ہے:

بابر جب کابل میں حکومت کرنے آیا تو شروع میں وہ یوسف زئیوں پر مہربان تھا لیکن ان کے جانی دشمن دِلّزاکوں کی باتوں نے اسے یوسف زئی سے سخت بدظن کر دیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ ملک احمد اُن کے سردار کو جب وہ کابل آئے تو قتل کرا دے۔ دِلّزاکوں نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ فوراً قتل کرانا ضروری ہے۔ ورنہ وہ ایسا چالاک ہے کہ بولنے کا موقع مل گیا تو کسی نہ کسی طرح بادشاہ سے جان بخشی کرا لے گا۔

ملک احمد کی آمد پر بابر نے بڑا دربار لگایا۔ شہ نشین کے تخت پر متمکن ہوا۔ احمد نے آداب بجا لانے کے بعد فوراً اپنے گلے کی گھنڈیاں کھول دیں۔ بابر نے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ وہ چپ رہا۔ آخر تیسری دفعہ سوال کرنے پر جواب دیا: "میں نے سُنا ہے حضور مجھے اپنے ہاتھ سے تیر مار کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خیال ہوا اتنے بھرے دربار میں جب کہ سب کی نگاہیں ادھر لگی ہوئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ حضور کا وار خالی جائے۔ اسی سے اپنا بھاری اَنگرکھا دار دگلا ہٹائے دیتا ہوں کہ تیر پوری طرح کارگر ہو۔"

یہ بات سُن کر بابر خوش ہو گیا اور اس سے کئی سوال کیے۔ ایک یہ تھا کہ سکندر کس قسم کا آدمی تھا؟

احمد نے کہا: "خلعت عطا کرنے والا۔"

پوچھا: "اور بابر؟"

احمد نے کہا: "وہ زندگی عطا کرنے والا ہے، کیونکہ میری جان مجھے واپس دے گا۔"

بابر نے کہا: "بے شک ایسا ہی ہو گا۔"

پھر تو بادشاہ ایسا مہربان ہوا کہ ہاتھ پکڑ کر تخلیے میں احمد کو لے گیا اور وہاں انھوں نے تین دفعہ شراب پی۔ پہلے بابر تھوڑی سی پیتا پھر وہی جام احمد کو دے دیتا تھا۔ شراب کا نشہ چڑھا تو بابر مست ہو کر ناچنے لگا۔ ملک احمد کے سازندے ساز بجاتے رہے اور خود ملک احمد جو فارسی خوب جانتا تھا۔ ساز پر مست

عمدہ گانے گاتا رہا۔ بابر ناچتے ناچتے تھک گیا تو ہاتھ بڑھا کر کہا "میں تمہارا رقاص ہوں[1]۔ لاؤ میرا انعام"
اس نے تین دفعہ مانگا اور ہر دفعہ ملک احمد نے ایک اشرفی اس کے ہاتھ میں رکھ دی۔ اس طرح احمد بخیر و سلامت
اپنی قوم میں واپس آیا۔

لیکن پھر بابر اُن کے علاقے میں فوج لے کر آیا۔ اُن کی زمینیں پامال کر ڈالیں مگر ان کا سنگر (قلعہ)
نہیں فتح ہوا۔ تب بابر نے جیسی اس کی عادت تھی، قلندر کا بھیس بھرا اور قلعے کے استحکام دیکھنے دیار
کے پڑاؤ سے ماہورہ پہاڑی پر گیا جہاں قلعہ واقع تھا۔ اس وقت (بہ تصحیح مترجم) عید قربان کا تہوار
منایا جارہا تھا اور ماہورہ پہاڑی کے عقب میں ملک احمد کے چھوٹے بھائی شاہ منصور کے ہاں بہت
سے لوگ جمع تھے۔ آج کے دن تک یہ جگہ "شاہ منصور کا تخت" کہلاتی ہے۔ بابر بھیس بدلے ہوئے
مکان کے پیچھے گیا اور صحن میں جہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی، کھڑا رہا۔ اس نے آنے جانے والے نوکروں سے
معلوم کر لیا کہ شاہ منصور کے ہاں بچے اور ایک لڑکی بی بی مبارکہ نام ہے جو اس وقت دوسری عورتوں
کے ساتھ ایک خیمے میں بیٹھی تھی۔ بی بی کی نظر قلندر پر پڑی تو اس نے روٹیوں میں سالن گوشت لپیٹ
کر ایک نوکرانی کے ہاتھ اسے بھیجا۔ بابر نے پوچھا یہ کس نے بھیجا ہے۔ نوکرانی کے بتانے پر کہ بی بی مبارکہ
نے، دریافت کیا وہ کہاں ہے؟ نوکر نے کہا "وہ تمہارے سامنے والے خیمے میں"۔ پادشاہ نے جو اُسے
دیکھا تو خوبصورتی دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ اس نے نوکرانی سے بی بی کی عمر اور مزاج کا پوچھا اور یہ کہ اس کی
کہیں منگنی تو نہیں ہوئی ہے۔ نوکرانی نے سنتے ہی کہا کہ جیسی وہ خوب صورت ہے ویسی ہی خدا نے اسے
نیک سیرت عطا کی ہے۔ عقل و حیا میں نظیر نہیں رکھتی اور نہایت متین اور خاموشی پسند ہے۔ تب
بابر وہاں سے واپس ہوا، مگر آتے میں روٹی سالن وہیں ایک پتھر کے پیچھے چھپا آیا۔

لشکر گاہ میں واپس آ کر اسے بہت اضطراب رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ قلعہ فتح نہ کر سکا تھا اور خالی
ہاتھ کابل جانے سے شرم آتی تھی، مزید برآں عشق کے جال میں پھنس گیا۔ آخر ملک احمد کو خط لکھا اور
شاہ منصور کی بیٹی مانگی۔ احمد کو سخت اعتراض تھا۔ وہ اس کا سبب یہ بتاتا تھا کہ بابر کے چچا اُلغ بیگ
اور خان میرزا ان غزنی سے بھی یوسف زئی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں، نتیجہ قوم کی خرابی کے سوا کچھ نہ نکلا۔

---

[1] مصنف نے یہاں "ACROBAT" لکھا ہے۔ لیکن نٹ قدیم ہندی زبانوں میں رقاص کو کہتے ہیں۔
اسی طرح متن میں "بخشیش" لکھا ہے جس کا ہم نے انعام ترجمہ کیا ہے۔ مترجم۔

دوسرے اس نے یہ بھی کہا کہ کوئی لڑکی شادی کے لائق موجود نہیں۔ جواب میں بابر نے بہت پُرشکوہ شاہانہ مراسلہ بھیجا۔ جس میں اپنے بھیس بدل کر شاہ منصور کے گھر جانے اور بی بی مبارکہ کو ایک نظر دیکھ لینے کا ذکر اور ثبوت میں گوشت روٹی پتھر کے پیچھے چھپا آنے کی شہادت لکھی تھی۔

احمد اور منصور پھر بھی تیار نہ ہوتے تھے۔ لیکن قبیلے کے جرگے میں لوگوں نے اصرار کیا کہ پہلے بیٹیاں دی جا چکی ہیں تو اب بی بی مبارکہ کو دینے سے انکار کرنا اور بادشاہ کو قبیلے کا دشمن بنانا درست نہ ہوگا۔ ملکوں نے کہا "اگر قبیلے کی اس میں بھلائی ہے تو بہت اچھا۔ یونہی سہی۔"

بابر کو رضامندی کی خبر پہنچی تو خوشی کے نقارے بجنے لگے جشن برپا ہُوا۔ دلھن کے لیے بیش بہا تحائف بھیجے گئے جس میں ایک تلوار بھی تھی۔ ادھر سے دونوں ملک بیٹی کو لے کر موضع تلش کے باہر تک آئے جہاں شاہی محافظ پیشوائی کو آئے تھے۔ منصور آئے تھے۔ منصور کے گھر کی پُرانی دایہ رُوبنہ اور بہت سے نوکر چاکر بی بی مبارکہ کے ہمراہ شاہی لشکر گاہ میں گئے۔ اس کے عین وسط میں بہت بڑا خیمہ نصب تھا۔ دلھن کو بڑے اعزاز اکرام سے اس میں اُتارا گیا۔ اس رات اور دوسرے دن امرائے کابل کی بیویاں ملنے کے لیے آتی رہیں۔ بی بی نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی اور ان کی رائے ہوئی کہ "بے شک دلھن بہت خوب صورت ہے لیکن ہمارے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آئی، اس میں دیکھ لینا کچھ بھید کی بات ہے۔"

بی بی مبارکہ نے اپنی نوکرانیوں سے کہہ دیا تھا کہ بادشاہ کے آنے کی خبر رکھیں۔ ملک احمد نے جس طرح بتایا تھا، وہ اسی کے مطابق بادشاہ کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔ نوکروں نے اس سے کہا "باہر بہت گہما گہمی اس لیے ہو رہی ہے کہ بادشاہ نماز پڑھنے جامع مسجد میں جانے والے ہیں" پھر اسی روز بعد نماز انھوں نے خبر دی کہ "بادشاہ تمھارے خیمے کی طرف آ رہے ہیں۔" بی بی مبارکہ فوراً تخت سے اُتر کے قالین پہ دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ اس کی خوب صورتی نے فرش کو چار چاند لگا دیے مگر بادشاہ اندر آئے اور وہ بہت جھک کر آداب بجا لائی تو بھی اپنے چہرے سے نقاب نہ ہٹائی۔ بادشاہ دیر تک اسے تکتا رہا، کہ تخت پہ بیٹھ کر بولا "میری افغانی بیگم، آؤ میرے پاس آکر بیٹھو۔" اس نے پھر جھک کر آداب کیا لیکن آگے نہیں بڑھی۔ دوبارہ بادشاہ نے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ کسی قدر بڑھ کر قدم بوس ہوئی۔ بادشاہ نے بےقرار ہو کر کہا "اجی آؤ آؤ، بیٹھ جاؤ" اس نے چہرے سے نقاب ہٹائی اور اپنا دامن بھی اوپر اٹھایا۔ بادشاہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بی بی نے کہا مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟ بادشاہ نے کمال عنایت سے کہا "کہو کیا کہنا ہے۔" تب بی بی نے کہا "سمجھ لیجیے کہ ساری

یوسف زئی قوم میرے دامن میں اکٹھی ہے۔ میری خاطر ان کے قصور معاف کر دیجیے۔ بابر نے جواب دیا "میں نے یوسف زئی کے سب قصور معاف کیے تمھارے سامنے ان کو تمھارے دامن میں ڈال دیا۔ اب میرے دل میں یوسف زئی سے کوئی کدورت نہیں رہی؟"

وہ پھر جھک کر آداب بجالائی۔ پادشاہ ہاتھ پکڑ کر اسے تخت پر لے گیا۔

جب نماز عصر کا وقت ہوا، پادشاہ تخت سے اٹھا تو بی بی مبارکہ جلدی سے کودی اور اس کی جوتیاں لا کے رکھیں۔ پادشاہ نے جوتی پاؤں میں ڈالی خوش ہو کر کہا "میں تم سے بہت خوش ہوا۔ تمھاری خاطر ساری قوم کی خطائیں بخش دیں"۔ پھر مسکرا کر کہا "یہ بات ضرور ملک احمد نے تم کو سکھائی ہوگی" وہ نماز کے لیے گیا۔ بی بی مبارکہ نے اپنے خیمے میں نماز کی تیاری کی۔

مضبوط اور بڑے قلعے کی تسخیر

اس پٹھانی لاف وگزاف کی داستان عشق میں حقیقت کا اچھا خاصا جزو موجود ہے۔ بی بی مبارکہ واقعی کابل کی حرم سرا میں داخل تھی اگرچہ تیموری نہ ہونے اور محض قبائلی بیٹی، نیز کم عمر ہونے کے باعث دوسری بیگمات سے کچھ الگ الگ رہتی تھی۔ بابر سے کوئی اولاد اس کے ہاں نہ ہوئی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے مشوروں میں سستہ بینی اور پٹھانوں کے بے تکے مزاج کے متعلق سمجھاتی رہتی تھی۔ مع ہذا اپنی قوم یوسف زئی کی حمایت کرتی، جس طرح قدیم ایرانی بادشاہ زرکسیز (زریر) کے روبرو ملکہ آستمر سفارش کیا کرتی تھی۔ محلسرا میں اور لوگ اسے "افغانی بیگم" موسوم کرتے تھے۔

بابر کی تزک دوبارہ ۹۲۵ھ (۱۹-۱۸ ۱۵ء) کی سردیوں سے شروع ہوتی ہے۔ اتنی مدت کے خلا کے بعد تحریر زیادہ دوٹوک اور باریک نگار ہو گئی ہے۔ اس میں یوسف زئی سے قول و قرار اور بی بی کو حبالۂ عقد میں لانا اس کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ان جاڑوں میں بڑی جمعیت لے کر وہ بالائی سندھ پر تاخت کرنے چلا تھا۔

"جمعہ کو یوسف زئی افغانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے سواد (سوات) کی جانب کوچ ہوا .... شاہ منصور یوسف زئی خوش ذائقہ، نہایت نشہ آور مٹھائی تحفۃً لے کر آیا۔ ایک حصہ میں نے کھایا۔ ایک طغائی کو، تیسرا عبداللہ کتاب دار کو دیا۔ اس میں ایسی منشیات ملی تھیں کہ مغرب کے بعد امرا مشورے کے لیے جمع ہوئے

تو میں خیمے سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ عجیب ہی نشہ تھا۔ ایک زمانے بعد تو اگر میں تینوں حصّے کھا لیتا تو بھی مجھے اتنا نشہ نہ ہوتا۔ .... اسی علاقے میں تھے جب یہاں ٹخنوں ٹخنوں برف پڑی۔ ایسا شاذونادر ہوتا ہوگا، کیونکہ مقامی لوگ بہت حیران ہوئے۔ سلطان (بہ تصحیح مترجم) اُویس سوادی کے مشورے سے یہاں والوں سے چار ہزار خروار چاول لشکر کے واسطے لینے تجویز ہوئے۔ سلطان اویس ہی لانے کے لیے بھیجا۔ ان جنگلی پہاڑیوں نے اتنا محصول کبھی نہیں بھرا تھا...... یوسف زئی قوم کی خاطر میں نے اپنے خیر خواہ ملک شاہ منصور کی بیٹی کی خواستگاری کی تھی جب کہ وہ اپنی قوم کا وکیل بن کے آیا تھا.... ہم اسی پڑاؤ پر تھے کہ اس لڑکی کے یوسف زئیوں کے خراج کے ساتھ آنے کی اطلاع ہوئی۔ شام کو شراب نوشی کا جلسہ ہوا جس میں سلطان سواد کو شریک کیا اور خلوت خاص دی گئی۔ کوچ کرتے ہوئے آگے چلے تو شاہ منصور کا بھائی طاؤس خاں اپنی بھتیجی کو اگلے پڑاؤ پر لایا......

امرا اور دِرِ نزاک (درّہ نازک) سرداروں سے مشورت ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ سال ہلالی ختم ہو رہا ہے۔ بُرج حوت کے دو دن رہ گئے ہیں۔ کاشتکار فصلیں اُٹھا کر لے جا چکے ہیں۔ اب سواد کی وادی میں بڑھے چلے گئے تو غلّہ میسّر نہ آنے سے لشکر کم رہ جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ سواد ندی سے پار ہو کر ان یوسف زئیوں پر تاخت کی جائے جو اپنے قلعے ماہورہ کے نیچے میدانوں میں ہیں (مگر سردیوں میں یہ حملہ نہ ہوا) آیندہ کسی برس کچھ پہلے آ کر فصلوں کے تیار ہونے کے وقت ان کی خبر لی جائے۔"

ان یادداشتوں میں افغانی افسانے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں:۔

یوسف زئی وکیل کے سامنے بابر کا نشے میں متوالا ہونا۔ بی بی مبارکہ کا اپنے قبیلے کے خراج کے ساتھ آنا۔ پھر اس قبیلے پر حملے کا ملتوی کر دیا جانا ۔ وغیرہ۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بابر نے پھر کبھی یوسف زئیوں کی چراگاہوں یا مزروعہ اراضی پر حملہ نہیں کیا اور عجب نہیں کہ اس گھومنے والے بادشاہ اور اس طاقتور قبیلے میں (جو وادیٔ سوات کی پہاڑی بلندیوں پر بسے ہوئے تھے اور سندھ کو جانے کا ایک راستہ ان کی زد میں تھا) مفاہمت کا بڑا سبب بی بی مبارکہ کی کوشش ہوئی ہو۔

وفادار قاسم بیگ کی ایک آخری کارگزاری یہ بھی تھی کہ اس نے اپنے بادشاہ اور ان سرکش قبائل میں ایک قسم کا عہد و پیمان کرا دیا۔ وہ قبیلے جو ہندوکش کی ڈھلانوں پر بستے تھے، اپنی خانہ بدوشی کی اس عادت کو بھی کسی طرح چھوڑنا نہ چاہتے تھے کہ موسم گرما اور سرما کی الگ الگ چراگاہوں میں آتے جاتے رہیں۔ پہاڑوں پہاڑ میں

ہیں ان کے گشت لگانے سے بڑی ناگواری ہوتی تھی اور بابر نے شروع میں کوشش کی تھی کہ وہ جانب کابل اپنی سرمائی وادیوں میں سکونت گزیں رہیں اور مجبور کرنا چاہا تھا کہ مستقل زراعت کر کے غلّہ پیدا کیا کریں۔ مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی اور مایوس ہو کر لکھتا ہے کہ جنگلی علاقوں کے ایمق اور ترک اپنی خوشی سے کابل کے قریب بسنے پر تیار نہیں ہوئے۔ بلکہ قاسم بیگ کے پاس پہنچے اور اس کی منت سماجت کی کہ ہمیں دوسرے علاقوں میں آنے جانے کی اجازت دلوائی جائے۔ قاسم بیگ نے بار بار سعی سفارش کی اور آخر میں نے اجازت دے دی کہ وہ قندز تک ایسی آمد و رفت رکھ سکتے ہیں۔"

جاڑوں میں ان پہاڑوں سے گزرنا خالی کُوچ نہ تھا۔ ہر منزل پر دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ ایک خبر لانے والے کا ذکر لکھا ہے کہ اسے کوئی اکیلا پٹھان ملا، اس نے سر کاٹ لیا لیکن لانے میں کہیں گر گیا۔ بابر مزاحاً لکھتا ہے کہ "بس یہی خبر تھی جو اس نے آکر ہمیں سنادی" خود بابر بھی ان خوبصورت، ویران پہاڑوں کے راستے میں جلّادیاں کرتا جاتا تھا حالانکہ ابتدائی عمر اور اپنی وطنی وادیوں میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ لکھتا ہے:۔

"درّہ متعام نامی موضع میں، ایک ملحد قلندر کا مقبرہ تھا جس نے ایک دو پشت پہلے یہاں آکر بہت سے یوسف زئی اور دلّہ زاکوں کے عقیدے خراب کیے تھے۔ یہ کوہ متعام کی ڈھلانوں پر ایک فراخ جگہ نہایت بلندی پر بنا ہوا تھا۔ میں نے سوچا ایک ملحد قلندر کا مقبرہ ایسی پر فضا، صاف جگہ نہ ہونا چاہیے۔ حکم دیا توڑ کر زمین کے برابر کر دو۔ جگہ ایسی روشن اور ہوادار تھی کہ میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا اور معجون (بھنگ کا میٹھا مرکب) کھائی۔"

مزاج کی اسی کڑواہٹ کا خمیازہ پہاڑی قصبے بجور (باجوڑ) کو بھگتنا پڑا۔ اس کے گرد مضبوط سنگین فصیل تھی۔ بابر کے بقول یہاں کے باشندے صحیح العقیدہ مسلمان نہ تھے بلکہ "جاہلی" مذہب کے لوگ تھے۔ ان کے "سلطان" کے پاس ایک دلّہ زاک پیامی کو بھیجا کہ دروازے کھول دے اور پادشاہ کی اطاعت قبول کریں۔ اس نے "واہی تباہی" جواب دیے اور انکار کیا۔ تب بابر نے اپنی مختصر فوج کا یہیں پڑاؤ کرایا اور لوہے کے جال کی ڈھالیں، چھتریاں، سیڑھیاں اور آلات قلعہ گیری تیار کیے۔ جن میں پہلی دفعہ اس کی کتاب میں آتشیں اسلحہ کا ذکر آیا ہے:۔

"جمعرات کو حکم دیا گیا کہ فوج والے زرہ اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سوار ہو جائیں۔ میسرے کو قلعے کے بالائی سرخ پر ندی پار کر کے شمال میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ قول (قلب لشکر) کو ندی اترے بغیر شمال مغرب

کے ناہموار میدان میں، اور ہیمنے کو دروازہ قلعہ کے مغرب میں گھوڑوں سے اُترنا تھا۔ جب دولت بیگ اور میسرے کے سردار مذکورہ بالا جگہ پر پہنچے تو سو ڈیڑھ سو آدمیوں نے قلعے سے نکل کر حملہ کیا اور تیروں کی بوچھاڑ کی۔ ہمارے سپاہیوں نے جواب میں تیر چلائے اور قلعہ والوں کو دُھس تک پیچھے ہٹا دیا۔ عبدالملک (ربہ تصحیح مترجم) خوستی دیوانہ وار گھوڑا دوڑاتا ہوا فصیل کے نیچے تک پہنچ گیا۔ اگر سیڑھیاں تیار ہوتیں تو ہم قلعے کے اندر داخل ہو جاتے ...... بجور والوں نے بندوقیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ان سے نہیں ڈرے بلکہ بندوق دغنے کی آواز سن کر بھی سامنے کھڑے بیہودہ حرکتیں کرتے رہے۔ اس روز استاد علی قلی نے اپنی توڑے دار بندوق سے پانچ آدمیوں کو نشانہ بنایا۔ دوسرے تفنگ اندازوں نے بھی اچھا کام کیا۔ ان کی گولیاں زرہوں تک کو توڑ گئیں۔ ڈھالوں اور چمڑے کے پردوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ شام ہونے تک آٹھ دس بجوری مارے گئے اور پھر انھوں نے ڈر کے مارے دھسوں کے اوپر سر نہیں نکالا۔ رات ہوتے ہی میں نے حکم دیا کہ آلات قلعہ گیری تیار کیے جائیں۔

جمعے کو صبح ہوتے ہی جنگی طبل بجوا دیے اور سب عسکری اپنی اپنی مقررہ جگہ، زرہیں پہن، زینے لے کر پہنچ گئے ...... اس دن بھی استاد علی قلی نے خوب کام کیا اور دو دفعہ آتش فرنگ (بندوق) چلائی ......

محمد علی دِنگ دَنگ اور اس کے چھوٹے بھائی نے زینوں سے چڑھ کر برچھوں کے جواب میں تلواریں ماریں۔ بابا یسائل فصیل پر چڑھ گیا اور تبر مار مار کر اس کو توڑتا رہا ...... پھر اور سپاہیوں نے ہجوم کیا مگر فصیل کے اندر سب سے پہلے ہی داخل ہوئے ...... چاشت کا وقت تھا جب کہ شمال مشرقی بُرج کو دولت بیگ کی جمعیت نے گرا لیا اور اندر گھس گئی۔ دشمن کو مار بھگایا اور عنایت الٰہی سے ایسا مضبوط، زبردست قلعہ دو تین ساعت نجومی کے اندر لے لیا گیا۔

اہلِ بجور باغی بے دین تھے کہ اسلام کا نام تک اپنی قوم سے اُڑا دیا تھا۔ لہٰذا اُنھیں قتل کیا اور بال بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ تیا سا کوئی تین ہزار مرد مارے گئے۔ تھوڑے سے قلعے کے مشرقی پہلو سے بچ کے نکل گئے۔ پھر میں قلعے کے معائنے کے واسطے داخل ہوا۔ فصیلوں، گلیوں، مکانوں میں مقتول پڑے تھے۔ چلنے والے لاشوں پر سے گزرتے تھے۔ سلطان بجور کے محل میں میرا قیام ہوا۔ یہ ولایت خواجہ کلاں کے تفویض کی گئی۔ نماز مغرب کے وقت میں اپنی لشکر گاہ میں واپس آ گیا۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجور والوں کا قلعہ نہ بہت بڑا تھا نہ مستحکم۔ انھوں نے آتشیں اسلحہ نہیں دیکھے

تھے اور نہ کسی باقاعدہ فوج کے حملے کا سامنا کیا تھا۔ کرشی میں ایرانیوں کے قتل عام کرنے سے بابر کو بہت رنج ہُوا تھا مگر یہ قلق بھی خود اسے شکست خوردہ پہاڑیوں کو بے تحاشا قتل کرانے سے باز نہ رکھ سکا۔

قلعے پر اس تیز و تند یورش کا حال پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دس برس کے عرصے میں بابر کی فوج کس قدر بدل گئی تھی۔ تربیت یافتہ سردار اپنا کام خوب جان گئے تھے اور خود شریک ہوئے بغیر وہ انھیں اپنے آپ کام انجام دینے کی اجازت دیتا تھا۔ دوست بیگ کے سوائے سرداروں کے نام بھی نئے نئے سُننے میں آتے ہیں۔ غالبًا یہ شمالی محاربات سے بچ کر آنے والے لوگ تھے۔ وہ اب سازباز یا بھاگ جانے کی تدبیریں نہیں کرتے۔ ناخواندہ مگر جاں نثار قاسم بیگ کی جگہ خواجہ کلاں لیتا ہے جو ذی علم، سیاست داں اور عمر شیخ میرزا کے ایک وزیر فرغانہ کا فرزند تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بابر کسی نہ کسی طرح یورپی اسلحہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان میں توڑے دار بندوقیں اور دو ایک توپیں بھی تھیں۔ یہ آتشیں اسلحہ اس کے پاس کس طرح پہنچے، یہ کیفیت تزک کے گذشتہ دہ سالہ اوراق کے ساتھ گم ہو گئی۔ توپ و تفنگ چلانے والوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عثمانلی ترک تھے جو دو تین پُشت سے توپ خانے، حتیٰ کہ بڑی قلعہ شکن توپوں سے بخوبی آشنا ہو گئے تھے۔ البتہ کسی تُرک کا ایرانیوں میں سے گزر کر جو ترکوں کے جانی دشمن تھے، اپنی فنی مہارت کے ساتھ کابل پہنچ جانا حیرت میں ڈالتا ہے۔ بہرحال یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ یہ کارگر ہتھیار اس وقت بحر خزر کے مشرق میں صرف بابر کے قبضے میں تھے۔ اسے ان کا بڑا شوق تھا اور وہ آیندہ برابر ان سے مفید کام لیتا رہا۔

سپاہیوں کی بہادری پر بدستور اس کی نظر رہتی تھی اور ان کی جانبازی کا دل کھول کر انعام دیتا تھا۔ وہ اس پر بھروسہ رکھتے تھے اور اسی سے وہ وفاداری آئی جو مختلف اقوام کے افراد پر اس کی بادشاہی کی پختہ بنیاد بنی۔ اتنا ضرور ہے کہ قاسم بیگ کے بغیر بابر کی سنگ دلی خونریزی کی روش بناتی چلی گئی۔

اپنے اہل خدمت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح بے تکلف ہونے کا ڈھنگ اُسے خوب آتا تھا۔ وہ ان کے روزانہ مشاغل کی خبریں رکھتا۔ ایک دن لکھتا ہے کہ درہ خیبر سے ہم واپس آئے تو دوست بیگ کو بہت تیز بخار ہو گیا۔ ایک اور دن کی یادداشت میں ہے کہ "آج میری سب سے اچھی بہری کھو ئی گئی۔ میر شکار نے اسے لق لق اور قاز کو بڑی خوبی سے مارنا سکھایا تھا۔ وہ پہلے بھی دو تین دفعہ اُڑ گئی تھی شکار پر اس طرح بے خطا جھپٹا مارتی تھی کہ مجھ جیسا اناڑی آدمی بھی نہایت کامیاب شکاری ہو گیا تھا۔ شکار میں

اپنے آدمیوں کی کارگزاری دیکھنے میں بابر اسی قدر توجہ رکھتا تھا جیسی میدان جنگ میں۔ بڑے شکار کی خاطر اس کے عسکری کوچ ملتوی کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر لکھتا ہے: "آج علی الصباح جنگل سے شیر کے دہاڑنے کی آوازیں آئیں۔ دیر نہ گزری تھی کہ وہ باہر نکل آیا۔ ہمارے گھوڑے بے قابو ہو کر ایک دم ڈھلانوں کھڈوں کی طرف بھاگے۔ شیر جنگل میں واپس چلا گیا۔ میں نے حکم دیا، جھاڑیوں کے پاس بھینسا لا کر باندھو کہ شیر پھر باہر آئے۔ وہ پھر دڑکتا ہوا نکلا۔ ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی۔ میں نے بھی ایک تیر مارا۔ خواجہ پیادہ نے بڑھ کر برچھا مارا تو اس نے بل کھا کے پھل کو منہ میں لے کے چبا ڈالا۔ تیروں کے بہت سے زخم کھا کے وہ پھر گھسٹتا ہوا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ بابا یساول تلوار کھینچ کے پیچھے پیچھے گھسا اور اس کے جست لگانے سے پہلے سر پہ تلوار ماری۔ ایک اور تلوار علی سیستانی کی کولھے پر پڑی۔ شیر بھاگ کر قریبی ندی میں کودا، وہاں اسے لوگوں نے مار ڈالا اور باہر کھینچ لائے۔ میں نے حکم دیا اس کی کھال اتار کر الگ رکھو۔"

وادیٔ سندھ میں تاخت کر کے گرمیوں کے آخر میں فوج واپس آ رہی تھی جب کہ درہ خیبر کے قریب جلسۂ شراب نوشی کے لیے قیام ہوا۔ کسی مقامی رئیس نے باریاب ہو کر تجویز کی کہ آفریدیوں پر حملہ کیا جائے۔ وہ درے کے نواح میں فصل اٹھانے کے لیے بال بچوں سمیت مقیم تھے۔ بابر نے قبول نہ کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت یوسف زئی کی فکر ہے۔ خواجہ کلاں کو سفر کی مختصر کیفیت لکھی تو خط کے حاشیے پر یہ شعر خود گھسیٹ دیا

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

اس کی مخاطب بی بی مبارکہ تھی[1] جسے حفاظت کی خاطر خواجہ کلاں کے پاس بجور چھوڑ گیا تھا۔

ہل ہل کی مےخواری

بابر کو نئی چیز معلوم کرنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ بجور میں بھورے بال، سفید چہرے کے بندر نظر آئے بڑی دیر تک ان کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ معلوم ہوا مداری انھیں سدھا کر طرح طرح کے تماشے کرنے سکھاتے ہیں۔ کابل میں کسی عورت کو مے نوشی کرتے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خیال آیا کہ اس نادر چیز کا تجربہ کیا جائے ایک روز جمعے کی شام کو شراب کے مزے لے رہا تھا اور بارہ سالہ بیٹے ہمایوں کو مرغابیاں شکار کرتے دیکھ رہا

[1] فارسی تزک سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ مترجم۔

تھا۔ آدھی رات تک نیند نہ آئی تو نوکروں کو چھوڑ کر چار باغ سے بازاروں کا گشت لگاتا ہوا چلا اور صبح ہوتے تردی بیگ کی کاریز پر پہنچا۔ تردی بیگ پستہ قامت ترک تھا جس نے فقیری چھوڑ کر سپہ گری اختیار کی اور فوج کا بہت اچھا سردار بنا تھا۔ وہ میرے آنے کی خبر سن کر چھوٹی چھوٹی ٹانگوں ہی سے دوڑا ہوا آیا۔ مجھے (بہ تصحیح مترجم) اس کی مفلسی کا حال معلوم تھا اور کوئی ایک سو شاہرخیاں (سکے) ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اسے دیے کہ شراب خرید لائے اور ایک بے تکلف جلسے کا انتظام کرے۔ وہ بہزادی گاؤں کو شراب لانے گیا اس کا غلام میرا گھوڑا نیچے درے میں لے گیا۔ میں کاریز کے پیچھے ایک ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ کوئی ایک پہر میں تردی بیگ شراب کی ایک ٹھلیا لایا اور ہم نے باری باری پینی شروع کی۔ تردی کے پیچھے پیچھے قاسم برلاس اور شاہزادہ بھی آئے۔ ٹھلیا لاتے دیکھ کر انھیں شبہ ہوا اور تردی بیگ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میری اُن کو خبر نہ تھی۔ غرض میں نے انھیں بھی بلا کر شریک صحبت کیا۔ تردی بیگ نے کہا ہُل ہُل آنگہ[1] بھی آپ کے ساتھ شراب پینا چاہتی ہے۔ میں نے کہا "آج تک میں نے کسی عورت کو شراب پیتے نہیں دیکھا۔ اسے بلا لو"

اتنے میں ایک قلندر وہاں آ نکلا ہم نے اُسے اور کاریز کے ایک نوکر کو بھی بُلا لیا۔ جس نے عود بجایا۔ شام تک یہ جلسہ ٹیلے پر جما رہا۔ پھر ہم تردی بیگ کے مکان میں گئے اور چراغ کی روشنی میں عشا تک دور چلا بڑے مزے کی بے تکلف صحبت رہی۔ میں ذرا لیٹ رہا۔ دوسرے لوگ ایک اور مکان میں اُٹھ گئے آدھی رات کو ہُل ہُل پھر آئی اور مجھے بہت دق کرنے لگی۔ میں نے نشے میں مدہوش ہو جانے کا بہانہ کر کے اُس سے پیچھا چھڑایا۔

عورت کا قصہ طے ہونے کے بعد اور دو دن تک باغوں کی سیر ہوتی رہی۔ موسم خزاں میں صبح کے وقت یہ نہایت دلاویز ہوتے تھے۔ ان میں بابر انگور کھاتا اور مناظرِ قدرت کا لطف اُٹھاتا رہا۔ ایک خزاں رسیدہ سیب کا درخت دیکھ کر خاص طور پر وجد کرتا ہے کہ "اس کے خزانی پتے اتنے حسین تھے کہ کسی مصور کا موقلم ایسے نہیں بنا سکتا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ بابر اضیر جسمانی تندرستی اور دماغ کی بیداری ایسی غیر معمولی رکھتا تھا کہ نشۂ شراب سے مغلوب نہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس حالت کو پہنچنے کے لیے وہ کبھی کبھی شراب میں دو آتشہ، سہ آتشہ عرق"

---

[1] یہ نام مشکوک ہے۔ فارسی تزک میں ہُل ہُل اتکہ لکھا ہے۔ مترجم۔

ملا لیا کرتا تھا۔ پنجاب پر حملے کے دوران میں ایک دن پی کر دریا پر کشتی میں سوار ہوا۔ وہاں بھی عشا کے وقت تک ہم عرق پیتے رہے جب اندھیرا بڑھا تو کنارے پر کشتی لگا کر گھوڑوں پر سوار ہوئے مشعلیں ہاتھ میں تھیں۔ گھوڑے دوڑاتے میں کبھی ایک طرف لڑھکتے کبھی دوسری طرف یعنی نشے میں حیوان لایعقل ہو رہا تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے بتایا کہ میں بگ ٹٹ گھوڑا دوڑاتا مشعل گھماتا ہوا لشکرگاہ میں داخل ہوا تو یہ بات مجھے مطلق یاد نہ تھی"۔

بابر تنہا کبھی نہ پیتا تھا۔ شراب کشی کے جلسوں میں موسیقی اور گپ شپ ہوتی رہتی۔ تاہم شراب کے ساتھ معجون کھا کھا کر بھی جب لوگ متوالے ہو جاتے تو وہ ان کی خبر رکھتا تھا۔ لکھتا ہے کہ (بہ تصحیح مترجم) شرابی اور معجونی کی کبھی نہیں بنتی۔ ایک بار کشتی میں یاروں کے ساتھ شراب کی محفل جمی۔ آسمان پر قوس قزح بہار دکھا رہی تھی۔ کشتی میں عرق کا دور چل رہا تھا۔ عرق پیتے پیتے اُکتا گئے تو ہم نے بھنگ پینی شروع کی۔ کشتی کے گوشے والوں کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ وہ شرابیں پیتے رہے نماز عشا کے وقت کشتی سے اُتر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کافی دیر سے ڈیروں میں پہنچے۔ محمد دبیگ) اور گدائی یہ سمجھ کر کہ میں صرف عرق پی رہا ہوں، شراب کی ایک گھڑیا، کارگزاری دکھانے کو لائے۔ باری باری گھوڑوں پر اُسے رکھ لیتے تھے۔ نشے میں گُن اور مست ہو رہے تھے۔ کہنے لگے" اس اندھیرے میں آپ کے لیے ہم یہ گھڑا بھر شراب لاد کر لائے ہیں۔ باری باری سے اُٹھا کے چلتے رہے"۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ اور نشہ کر رہا ہوں۔ بھنگ نوش اور شراب خواروں کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔ قریب تھا کہ آپس میں جھگڑا ہو جائے میں نے کہا صحبت کا مزا مت خراب کرو۔ جس کا جی چاہے شراب پیے اور جو چاہے بھنگ (معجون) ــــــ چنانچہ اسی کے مطابق الگ الگ شغل ہونے لگا۔ بابا جان "قابوس" (ساز نواز) نے شاہی خیمے میں عرق پینا پسند کیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھنگ نوشوں پر پھبتیاں کسنے لگے۔ بابا جان نشے میں دُھت ہو کر واہی تباہی بکنے لگا۔ یہ لوگ تردی بیگ کو جام پر جام بھر کر پلاتے رہے کہ وہ بھی نشے میں بے سدھ ہو گیا پھر جو دھاندلی مچی، میرے سنبھالے نہ سنبھلی۔ ہنگامے اور مشت مُشت نے مزا کرکرا کر دیا۔ اسی بے لطفی میں جلسہ برخاست ہوا"۔

بابر کا غور اپنی حالت پر

شراب خواری کے ان بے محابا جلسوں میں، بلکہ دھینگا مشتیوں میں بھی اوقات نماز کا بار بار ذکر آتا ہے۔ یہ اذان تو مسخرہ نہ تھا فجر، دوپہر، سہ پہر، مغرب اور عشا کی اذان دن کے چند حصوں کی واضح نشانی تھی ــ

بابر، وقت کا جسے اب ہم گھنٹوں میں شمار کرتے ہیں، اندازہ لگانے کا خاص مادہ رکھتا تھا[اس کے سامان میں گھڑی گھنٹے شامل نہ تھے اور نہ اس وقت تک یورپ میں بنتے تھے بجز کچھ انگھڑ آلات کے۔ تاہم اس کے تعلیم یافتہ ترک اور ایرانی مصاحب ثبات کا علم ضرورت کے مطابق رکھتے تھے۔ ان کے پاس برنجی تختیوں پر بڑے بڑے شہروں کے نام اور عرض بلد کھدے ہوئے ہوتے اور ایک سوئی تدریجی قوس پر سایہ ڈال کر وقت کا اندازہ بتاتی تھی۔ سوئی کا رُخ قطب شمالی کی طرف رکھا جاتا تھا۔ یہ ایک قسم کی "ساعتِ نجومی" یا گھڑی ہوتی جس کا بابر کی تحریر میں اکثر ذکر آتا ہے۔ دن کا آغاز غروب آفتاب سے کرتے اور سال قمری ہوتا تھا]

بابر کے ہم نشین مخمور ہونے کے متعین مقصد سے شراب پیتے تھے۔ (فرنگیوں کی طرح) کھانا کھاتے میں چسکی لگانا ان کے نزدیک فضول حماقت کی بات تھی۔ بابر کے اجداد خانہ بدوشی کے زمانے سے چھک کر پینے کے عادی تھے اگرچہ بعض لوگ نہیں بھی پیتے تھے۔ اس کے آخری چچا حسین بالیقرا کے ہاں یہ میخواری کے جلسے صرف سرشام یا سرشب جما کرتے تھے۔ عمر شیخ میرزا آگے چل کر آٹھ آٹھ دن رنگ رلیوں میں مست رہتا اور دونوں کا مزاج آخر میں، نشے میں یا بغیر نشہ بھی، غیر متوازن ہو گیا تھا۔ بابر بھی تیزی سے انہی کے قدم بہ قدم جا رہا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی تو زیادہ تر اسی کثرت شراب خواری سے جوانی میں مر گئے تھے۔ بابر سخت معرکوں کے وقت، کبھی کبھی پینی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ وہ اس عادتِ بد کی خرابیوں سے بے خبر نہ تھا۔ لکھتا ہے "میں نے اپنے ہاتھوں زندگی بگاڑی ہے اور سوائے اس کے کہ خدا رحم فرمائے میرا شمار بھی دوزخیوں میں ہوگا" اس کے تاثرات طرح طرح کے عجیب ہوتے تھے جنھیں وہ اپنی خواہش کا نتیجہ سمجھتا۔ ارادہ کیا تھا کہ چالیس برس کی عمر میں شراب چھوڑ دے گا۔ اب جو یہ سال قریب آتا چلا تو اس نے اور زیادہ پینی شروع کر دی۔ نشے باغوں میں انگور کی کثرت دیکھ کر اس سے رہا نہ جاتا اور سبزہ و گل کی سیر میں لطف مے کشی کا اضافہ کرنے چلتے چلتے گھوڑے سے اتر پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ بھیشِ اور تیز بخار میں خون بھی آنے لگا تو اسے اپنے اعمال، خصوصاً ہزل نویسی پر پشیمانی ہوئی کہ جس قلم سے حضرت جامی کی تقلید میں اسمائے حسنہ لکھے جائیں وہ بے علم ہزل سے آلودہ ہو۔ نیت کر لی کہ آئندہ ایسی شاعری نہ کرے گا اور قلم توڑ ڈالے گا پھر افاقہ ہوا تو کابل میں ایک دل پسند پہاڑی پر شراب کا چھوٹا سا حوض سرخ سنگ سماق سے بنوایا۔ یہاں گرمی کی راتوں میں رنڈیوں کے ناچ اور مطربوں کا گانا ہوتا۔ حوض کے کنارے پر اپنا شعر کھدوایا تھا جسے لافانی شاعری تو نہیں کہہ سکتے مگر افکار وہی تھے جو کبھی استادِ دہیات حکیم عمر خیام، بلکہ خود حضرت جامی کے ذہن میں خلش پیدا کرتے ہوں گے: ۵۔

"نوروز و نوبہار و مے و دلبرے خوش است   بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

بابر ترنگ میں آکر شعر کہا کرتا تھا، خواہ ناصحانہ ہوں یا رندانہ۔ تیموری دور میں اعلیٰ قابلیت کی نشانی یہی تھی کہ مضمون کے مناسب بندش الفاظ میں آدمی استادی دکھائے۔ اگرچہ ترکی شعر لکھنے میں بابر کو علی شیر نوائی سے سبقت لے جانا کبھی نصیب نہ ہوا تاہم اس کے کلام میں گہرائی زیادہ ہے وہ متین خیالات کو نغمے کی زبان میں ادا کرنے کا قدرتی میلان رکھتا ہے۔ اس پر انابت کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ خواجہ احرار کے ارشادات کو ترکی میں نظم کرتا کہ عام لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔ ضلع جگت میں اسے بہت لطف آتا اور بلاغت و بیان پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا ایک نیا رسم الخط "بابری" بھی ایجاد کیا تھا۔ شاعر پیشہ اشخاص سے مسابقت کرنے میں اسے باک نہ تھا مگر تعجب ہے کہ موسیقی کے معاملے میں احتیاط سے کام لیتا اور انوکھی، من مانی قسم کی راگنیاں نکالنے کے سوا، شاذ و نادر ہی کوئی ساز بجاتا ہوگا۔ ہاں دوسروں کے ساز بجانے پر اچھی یا بری رائے لگانے سے باز نہ رہتا تھا۔

سالہا سال وہ خود ایک بڑی مثنوی "مبین" لکھنے میں مصروف رہا۔ یہ اپنے بیٹوں ہمایوں اور کامران کو اس کی نصائح ہیں۔ ترکی زبان میں عقائد و اعمال کے سوا حکمرانوں کے مالی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثنوی کی طرز مولانا رومیؒ اور صوفی شعرا سے لی ہے۔ فلسفیانہ افکار اور عملی نصیحتوں کو گویا نظم لطیف کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ممکن ہے اپنے بیٹوں کو اسے پڑھنے میں ترغیب کے لیے یہ پیرایہ اختیار کیا ہو اور یا یہ کہ اپنے ذوق کی تسکین مقصود ہو۔ یہ مثنوی جزءً روسی میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا بابر کی اُن تجاویز کا پتا دیتا ہے جو سرزمین افاغنہ سے اخذ محصول کے بارے میں اس نے سوچی تھیں۔ چونکہ آئندہ وارث ہونے والے بیٹوں کے واسطے لکھی ہیں۔ لہٰذا انھیں اس کی آخری رائے سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس مفلس ملک کے مستقل کاشتکاروں اور قبائلی لوگوں سے کس طرح مالیہ وصول کرنا مناسب سمجھتا تھا۔ اسے پڑھ کر منکشف ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس مملکت میں تیموریوں کا وہ جاگیرداری نظام جو سمرقند میں رائج تھا کہ بڑی بڑی جاگیریں امراکو دے دی جاتی تھیں اور وہ ٹھیکے کے اصول پر مالیہ لے کر حکومت کو مقررہ محصول ادا کرتے تھے، چلانے سے دستکش ہو گیا تھا اور اس کی بجائے اراضی، گلّے اور تجارت پر براہ راست محصول عاید کرنا چاہتا تھا۔ زمین کا مالیہ بہت کم رکھا تھا اور پیداوار کا لحاظ کیے بغیر پیمائش پر شرح مقرر کر دی تھی کہ مزارعین کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کی ترغیب ہو۔ پھل کے درختوں پر خواہ کاشت کیے گئے ہوں یا خود رَو، سالانہ پیداوار کا ایک عُشر لگایا تھا۔ بھیڑ بکری کے گلّوں پر فی صد ایک راس لی جاتی تھی۔ گائے بیل میں تیس پر ایک، گھوڑوں میں چالیس پر ایک جانور، اور اونٹوں میں پانچ پر کسی وجہ سے ایک بھیڑ مقرر تھی۔ گلّے والوں کو اختیار تھا کہ جنس کے بجائے اس کی قیمت سکّے میں ادا کر دیں۔ مقامی تاجر

نیز آنے والے کاروانی تاجروں سے تہ بازاری یا درآمد کا محصول لیتے تھے اور غیر مسلم یعنی ہندو اور یہودی مال کا بیسواں حصہ ادا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کابل کے خزانے میں زیادہ تر اجناس جمع کی جاتی تھیں۔ اور ان کا بڑا حصہ بازار کے دکانداروں اور گلہ بانوں سے وصول ہوتا تھا۔ بابر کو ہمیشہ ٹوہ رہتی تھی کہ کوئی خرابی پیدا ہو تو خود تفتیش کرے نئے نئے تجربوں کا شوق سچ بچے (کاریزیں) بنوانے اور باغ لگانے سے پورا کرتا تھا۔ اور جگہ جگہ پھر کر باغ لگوانے کی بدولت "باغبان بادشاہ" (یا باغ ساز) کہلانے لگا تھا۔

گلبدن بیگم کے وقائع

بابر کی سرگزشت میں تیسری دفعہ پھر ایک خلا آتا ہے۔ یہ ۱۵۲۰ء کے اوائل میں جاڑے کے ایک دن سے شروع ہوا جس میں وہ خوشی خوشی قرآن مجید کی ایک سورۃ تلاوت کرتا ہے، پھر کابل آتے ہیں دو ایک ندیوں کو پایاب عبور کرتا ہے اور مغرب کے قریب آرام لیتا ہے کہ گھوڑے جو (دانہ چارہ) کھالیں۔ یہاں سے تزک منقطع ہونے کے بعد پھر ۱۵۲۴ء میں وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ ان چھوٹے ہوئے سنین کے واقعات کا حوالہ کہیں کہیں آ گیا ہے لیکن دوسری شہادتیں بہت کم میسر آتی ہیں۔ حیدر میرزا دوغلات ان دنوں سعید خاں سے منسلک تھا، جو کاشغر میں حکومت کر رہا تھا اور بلند پہاڑوں کے پار کے حالات سے اس کا قریب قریب کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ مورخ خواند میر صفوی دربار میں رک گیا اور کابل کے پہاڑی گوشۂ خمول کی خیر خبر لینے کے بجائے، بزرگ تر واقعات کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ بایں ہمہ قرائن موجود ہیں کہ کابل کی حالت اچھی تھی ذرائع آب پاشی کی بدولت فصلوں کی پیداوار بڑھ گئی اور باہر سے منگائی ہوئی قلمیں درخت بن کر پھل لانے لگی تھیں۔ سب سے بڑھ کر فلاح وخیر کا قرینہ یہ کہ دور دور کے خطوں سے جنگ جدال کا بازار گرم تھا۔ عمال و عمائد پادشاہ کی مملکت میں نقل مکان کر کے آ رہے تھے کہ امن و سلامتی کے علاوہ تھوڑی بہت خوش حالی سے بہرہ مند ہو سکیں۔ جھگڑے اور جنگ جو افغان قبائل آپس میں کشت و خون کرتے رہیں بابر کے انتظامات میں خلل ڈالنے کی اب جرأت نہ کر سکتے تھے۔ وہ ان پر پوری نگرانی رکھتا تھا۔ شمال میں ازبکوں کی حکومت تھی۔ وہ بھی افغانی ملکوں کی طرح گزر بسر کر رہے تھے۔

لیکن ان سنین کے بارے میں بلا توقع ہمیں ایک نوجوان عورت کی شہادت ملنی شروع ہوتی ہے۔ یہ بابر کی بے تکلف (؟) کھولت کی بیٹی گلبدن بیگم ہے جس نے ایک مدت بعد اپنے بھتیجے اکبر بادشاہ کی درخواست پر خاندان

کے بعض مردوں کی طرح، حالاتِ زندگی قلم بند کیے تھے۔ وہ بچوں کی اس نئی پود میں تھی جن کی مائیں تیموری خاندان کی نہ تھیں اور جو مصائب گذشتہ کی پریشانی اور سمرقند کی عظمت رفتہ کے ملال واندوہ کی بجائے دربار کابل کی خوش دلی کی فضا میں پلے تھے۔ گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ اس کے باپ کو سابقہ وطن کی یاد نہیں رہی تھی۔ کم سے کم بابر اپنے چھوٹے بچوں سے سمرقند واندجان کی باتیں نہیں کرتا تھا اور تقدیر کی کارستانی سمجھیے کہ اس کی تیموری شہزادیوں بیویاں، کابل میں سکونت کرنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ چکی یا فوت ہو چکی تھیں۔ محل سرا میں ان غمناک واقعات کے ضرور تذکرے ہوتے ہوں گے جنھیں گلبدن سنتی ہو گی۔ ورنہ ثلث صدی میں یہی ایسا زمانہ تھا کہ اس خاندان کو محفوظ مامن کی تلاش میں رخت سفر باندھنا نہیں پڑا۔ نرسلوں والی، بل کھاتی ندی کے کنارے ٹیکرے پر قصر شاہی اور بالا ئی مرغزار میں چار باغ ان کے مستقل ٹھکانے بن گئے تھے۔ شروع میں سن رسیدہ قاسم بیگ بیگمات کے مجمع میں عہد رفتہ کی یادگار کے طور پر بزرگ ومشیر کی خدمت انجام دیتا تھا۔ قلعے کے دروازوں کو کسی ہتیار بند دشمن کی آمد کا خوف نہ تھا۔ گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ بابر کا کابل میں آنا اس کے حق میں فال نیک ثابت ہوا ورنہ پہلے اس کے جتنے بچے ہوئے سب ضائع ہو گئے۔ کابل آکر ایک نہ دو اٹھارہ بچے ہوئے اس سے بڑھ کر نیک فالی کا ثبوت اور کیا ہو گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ گلبدن بیگم، توہم پرست نہ تھی بلکہ صحیح معنی میں مذہبی خاتون تھی۔ ان دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔ سب سے بڑا بھائی ہمایوں پورا توہم پرست تھا۔ اپنے خوابوں کی تعبیروں اور دن کے شگونوں کی تلاش میں رہتا۔ دس برس کی عمر تھی کہ صبح باہر جانے تک کا اس نے شگون لیا۔ جس کا محل سرا میں مذکور ہوا۔ وہ سڑک پر راہ چلتوں کے نام دریافت کرتا کہ پہلا کون تھا، دوسرا، تیسرا کون، پھر تینوں نام لکھ کر مستقبل کا شگون لیتا۔ پرانے مصاحبوں نے سمجھایا کہ فال کے لیے ایک ہی نام کافی ہے۔ تین تین کو جمع کرنے سے الجھن پیدا ہو گی۔ مگر کمسن شہزادہ نہ مانا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ تفاؤل میں جن تین کے نام آئے ان کے معنی: مطلوب، سلامت، فتح تھے۔ ہمایوں کو یقین ہو گیا کہ یہ خدا کی طرف سے بشارت ہے کہ اس کی خوش حالی کی آرزوئیں پوری طرح بر آئیں گی۔ بابر کو رمالوں وغیرہ کا مدت سے اعتبار نہیں رہا تھا۔ لیکن افسردہ مزاج اور تنہائی پسند ہمایوں کی باتوں پر تحمل کرتا تھا۔ خان میرزا کا انتقال ہوا تو بدخشاں کی حکومت ۱۲ سالہ ہمایوں کے تفویض کی اور اس کی ماں ماہم سمیت اس ولایت کی سرحد تک بیٹے کو پہنچانے آیا۔ کئی دن ٹھہر کر چیدہ چیدہ مشیر اس کے پاس چھوڑے کہ ہمہ وقت حال کے نگران رہے۔ دور رہنے کی یہ تجویز بھی غالباً ماہم بیگم

کی خواہش کے مطابق بابر نے قبول کی تھی اور اسے برابر خط لکھتا رہتا تھا۔ اگرچہ شکایت کرتا ہے کہ ہمایوں بہت کم اور مختصر جواب دیتا ہے۔

ہمایوں کے بدخشاں چلے جانے اور بابر کے باہر گشت لگاتے رہنے کی وجہ سے گلبدن کو بچپن میں بڑے بھائی اور باپ کی معیت کا بہت کم موقع ملا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا اور پہلی دفعہ سندھ کے پار باپ کے پاس آئی تو بہت ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے سامنے گئی۔ محل سرا کی اکثر خواتین کی طرح وہ بھی نہایت دین دار لڑکی تھی اور اہل خاندان کے حق میں خدا سے رحمت و کرم کی دعائیں کرتی رہتی تھی لیکن باطنی علوم و اعمال سے واسطہ نہ رکھتی تھی۔

کابل کی چھوٹی سی سرکار میں، شاہی خاندان" ایام بے تاج" کے زمانے سے اب تک بہت کچھ بدل چکا تھا۔ محل سرا میں ایسن دولت جیسے ہٹیلے مزاج کی کوئی خاتون" تاتاری مادر شاہ" کی حاکمانہ شان سے حکم چلانے والی نہیں رہی تھی۔ ولی عہد (ہمایوں) کی ماں ماہم محل کے اندر گوشہ نشینی پر قانع تھی اور زیر نظر زمانے میں بیرونی معاملات کی طرف آنکھ اٹھا کے نہ دیکھتی تھی اگرچہ اس کا شوہر بار بار جاتا اور تماشا کرنے والے بندروں سے لے کر پشاور کی منڈی کے نفیس ریشم تک طرح طرح کے تحفے بیویوں، بچوں کو لا کر دیتا رہتا تھا۔ مگر نقد روپے کا انعام وہ صرف اپنے دو بیٹے کو عنایت کرتا تھا۔ افغان بی بی (مبارکہ) کبھی کبھی اس کے سفر میں ہمراہ جاتی تھی۔ حیرت ہے کہ کابل کی حرم سرا میں وہ بہت ہر دلعزیز تھی جس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ وہ بے اولاد رہی۔ بہر حال کابل کے گوشہ سلامتی میں سبھی بیویاں خوش رہتی تھیں۔ بابر کی ہر بار مراجعت پر ان کا خوشی منانا اور ضیافتیں کرنا اسی خوش دلی کی صریحی دلیل ہے۔ ایک مرتبہ اس کے دل میں آئی کہ اپنی آمد کو چھپائے رکھا اور جب شہر کی ندی پر پہنچ گیا تب کہیں لوگوں نے اسے دیکھا۔ ایک دم سارے شہر میں گڑبڑ مچ گئی۔ دونوں بڑے بیٹے پیشوائی کے لیے دوڑے۔ انھیں اتنا وقت نہیں ملا کہ (بہ نصیحتِ مترجم) گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے آدمیوں کی معیت میں قاعدے سے شہر کے باہر آ کے ملتے۔ شہر اور ارک کے درمیان پل پر ملے۔ بابر کو ان کی گھبراہٹ دیکھ کر بہت لطف آیا۔

اس کا کنبہ کچھ نئی طرح سے بڑھا۔ بہت سے پناہ گزین اس میں آملے۔ خانزادہ بیگم جس کا گلبدن پر بڑا رعب تھا، بچوں کو چار و ناچار ازبکوں میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے گلبدن صحرائی بیگم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ایک علاتی بہن اپنے لڑکے سمیت شمال سے فرار ہو کر آئی۔ خان میرزا متوفی کا بیٹا سلیمان، بابر کی پرورش میں

دیا گیا تھا۔ اس نے اسی کو والئی بدخشاں نامزد کیا اور ہمایوں قائم مقام شاہ (یا والی) کر دیا گیا۔ کئی لڑکیاں اور بابر کا چھوٹا لڑکا عسکری محل سرا میں تعلیم و تربیت پاتے تھے۔ سلیمان بھی اسی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ ہرات، بلخ، بخارا سے اہل علم و ہنر بھاگ بھاگ کر کابل آتے تھے۔ خطاطی، دینیات، تاریخ، شعر شاعری اور ضروری السنہ سکھانے پر مامور تھے۔ اسی تعلیم و تربیت کی بدولت گلبدن فارسی قریب قریب اسی طرح بے تکلف لکھتی ہے جیسے اس کا باپ ترکی لکھتا تھا۔ اس نے اسے اپنی تزک کا نام نہیں دیا بلکہ "ہمایوں نامہ" موسوم کیا لیکن حقیقت میں وہ سارے خاندان ہی کی سرگزشت ہے جو اب ہندوستان پر حکومت کرنے کو ابھر رہا تھا۔

ممکن ہے ماہم امیر خاندان سے نہ ہو۔ اس کا ٹھیک حال اور خود لفظ کے معنی معلوم نہیں۔ گلبدن بیگم اسے "آغم" یعنی میری آقا لکھتی ہے۔ بہرحال وہ ولی عہد کی ماں اور محل سرا میں حاکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے چار بچے تھوڑے تھوڑے دن ہی جی کر ضائع ہوئے جب چوتھا مرا تو اس نے ایک من مانی فرمائش کی اور بابر نے اس کی خاطر منظور کر لی۔ وہ ان دنوں بجور پر فوج لے جا رہا تھا۔ اگرچہ یہ تحریر کچھ دن بعد کی ہے کہ ہمایوں کی ماں کے کئی بچے ہوئے اور گزر گئے تھے۔ ہندال ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہم اسی نواح میں تھے جب ماہم کا خط آیا کہ اب جو بچہ ہو، خواہ بیٹا یا بیٹی، آپ مجھے دیں۔ میری قسمت سے جیتا رہے تو میں اسے پالوں گی۔" میں نے جمعے کو یوسف علی (رکابدار) کو ڈاک دے کر کابل روانہ کیا۔ اسی میں ایک خط ماہم کو لکھ کر بچہ ہندال جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا، اسے دے دیا" حاملہ ماں دلدار بیگم تھی۔ اسی کے ہاں آئندہ گلبدن پیدا ہوئی۔ وہ ماہم سے عمر میں چھوٹی تھی۔ پھر بھی شاہی بیگمات کبھی کبھی جو کسی کا بچہ گود میں لے کر پالتی تھیں وہ عموماً ادنیٰ درجہ کی ہوتی تھیں اور بادشاہ بابر کے محل میں ایسا ہوا بھی نہ تھا۔ عجب نہیں بڑھاپا آتے دیکھ کر ماہم کو کسی اور کا بچہ پالنے کی ہڑک اٹھی ہو اور یا جب اپنے پیٹ کا بچہ زندہ نہیں رہا تو کسی اور بیوی سے بادشاہ کا فرزند پالنے کی خواہش ہوئی ہو۔ دلدار کو یہ بات ناگوار تھی مگر بادشاہ کا حکم ماننے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

ماہم نے یہ درخواست بھی کی کہ بادشاہ خود فال نکالیں، بیٹا ہوگا یا بیٹی۔ بابر نے مضحکہ کیا کہ یہ سب عورتوں کے اوہام ہیں۔ تاہم بیوی کی خوشی پوری کرنے کے لیے ایک بڑی بوڑھی عورت کو بلا کر دو نام دو پرچوں پر لکھ کر الگ الگ چکنی مٹی کے اندر لپیٹے کر دیے (غلے)، پانی کے پیالے میں ڈلوائے کہ ان میں سے جو پہلے کھل جائے اور اندر سے کاغذ نکل آئے اسی کے مطابق واقع ہوگا۔ اس موقع پر بابر لکھتا ہے کہ بیٹا ہونے کی فال نکلی۔ دو چار مہینے بعد دلدار کے ہاں بیٹا ہوا اور ماہم نے دوسرے ہی دن بچے کو اپنے محل

میں لے آئی۔ دلدار بیگم کو صبر سے انتظار کرنا پڑا کہ جب مناسب موقع ہاتھ آئے تو اپنے بچّے کو واپس حاصل کرے۔ [ہنداِل یعنی ہند والا، اس کا آگے چل کر عرف رکھا گیا تھا] مگر ماہم کو اسی پر سیری نہیں ہوئی اور چونکہ اپنا کوئی بچّہ نہ رہا تھا (ہمایوں بھی باہر چلا گیا تھا) لہٰذا اس نے تین برس بعد پیدا ہونے والی گلبدن کو بھی طلب کر لیا چنانچہ یہ لڑکی بھی اس وقت سے متلوّن مزاج ماہم ہی کی نگرانی میں لے لی گئی، جب کہ کچھ سمجھ بوجھ اسے آگئی تھی۔ پھر بھی سب سے اہم شخصیت یعنی اپنے باپ کے آنے جانے کی اسے مشکل ہی سے خبر ہوتی تھی۔ البتہ قلعے سے اس کی سواری کو نیچے ندی کی سڑک پر گزرتے دیکھا کرتی ہوگی جہاں انبوہ کثیر لہراتے جھنڈے لیے اس کے جلو میں حرکت کرتا اور آراستہ پیراستہ گھوڑے اچھی سے اچھی چال دکھاتے نظر آتے تھے۔

یہ ۱۵۲۵ء کی سردیوں کا ذکر ہے جب کہ سخت پالا پڑ رہا تھا لیکن گل بدن بیگم نے بڑی ہو کر کتاب لکھی تو اس گذشتہ تاریخی واقعے کی نسبت صرف اتنا لکھا کہ "آفتاب برج قوس میں تھا جب بادشاہ ہندوستان کے لیے منزل بہ منزل روانہ ہوا"

اس کوچ میں چند منزل بعد ہمایوں کے بدخشاں سے امدادی فوج لے کر آنے کا دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ زمانۂ قیام میں بابر ایک دہ اتی باغ میں ہر ہفتہ چار دن شراب نوشی کے جلسے کر کے دل بہلاتا رہا۔ چالیسویں سالگرہ سے شراب چھوڑنے کی نیت کی تھی۔ اس توبہ پر تو عمل نہ کر سکا مگر ہفتے میں چار دن (ہفتہ، اتوار، پیر، منگل) شراب نوشی کے قرار دیے۔ باقی دنوں میں معجون کا نشہ کرتا تھا۔ آخر سُست قدم بیٹا لشکر میں پہنچا۔ بابر نے فوجی سرداروں کے روبرو سخت سُست کہا معلوم ہوا کابل میں ماہم نے منت سماجت کر کے ہفتہ بھر تک ٹھہرائے رکھا تھا۔ آگے کوچ میں بھی ہمایوں برداشتہ دل ہی رہا۔ وہ اسے بھی ایک اور احمقانہ تاخت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ اس مرتبہ بابر واپس کابل آنے والا نہ تھا۔

حملۂ ہندوستان کی چیستان

بابر توضیح کرتا ہے کہ جس وقت سے میں نے ملک کابل فتح کیا، برابر ہندوستان کو زیر نگیں لانے کا منصوبہ سوچتا رہا۔ مگر میرے امرا کبھی تو فتنہ و فساد اٹھاتے، کبھی میرے بھائیوں سے مل کر سازشیں کرتے تھے۔ ان وجوہ سے میں اپنے ارادے پر عمل نہیں کر سکا۔ بارے یہ موانع راستے سے دور ہوئے اور ارباب اعلیٰ، ادنیٰ، عاقل یا احمق کوئی شخص دربار میں ایسا نہیں رہا جو اس لشکر کشی کی مخالفت کا دم بھرتا۔۔۔۔ قلعۂ بجور کو یورش کر لینے (۱۵۱۹ء)

کے بعد سے میں خاص طور پر ہندوستان کے معاملات پر ہی متوجہ رہا۔"

مگر یہ دعوے کے بہت بعد کی تحریر ہے جسے زیب داستان کے لیے خیال کرنا چاہیے کیونکہ سالہا سال پہلے جب شیبانی کے آگے سے سمرقند چھوڑ کر فرار ہوا تو کابل پر حملہ کرنے کی تفصیل سے کیفیت لکھی ہے، وہاں ہندوستان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے صحیح ہوگا کہ وہ سالہا سال سے اس حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا یا اُسے شمالی ہندوستان پر اپنے جدِ امجد تیمور کی فتوحات کے باعث کوئی دعویٰ پیدا ہو گیا تھا۔ سو برس پہلے تیمور کی یورش مال و دولت کی تلاش میں، قابلِ حیرت ایک جھپٹا تھا جو شہر دہلی کی الم ناک تباہی پر منتج ہوا اور حملہ آور لوٹے چھینے ہوئے ہاتھیوں کی قطار پر اموالِ غنیمت لاد کر سمرقند لے گیا۔ اس ایک صدی سے زیادہ مدت قبل کے حالات بابر نے تیموری محاربات کے سلسلے میں بار بار مطالعہ کیے اور وہ ان کی نوعیت سمجھتا تھا۔ دریائے سندھ کے پار کا قبل ازیں کوئی دعوے اس کو نہ تھا اور اد مرجو تاختیں کیں ان کی نسبت حیدر میرزا نے بھی اپنی تاریخ میں دور بیٹھ کر یہی مشاہدہ کیا کہ وہ ہندوستان میں کئی مرتبہ تاخت کر کے واپس ہوا۔" دوسرے لفظوں میں یہ خانہ بدوشوں کے سے حملے تھے کہ جب تک کابل کا انتظام درست ہو، رسد حاصل کرنے کی غرض سے سرحد پار تک کیے گئے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "سرحد پر پہنچ کر ہمیں خیال ہوا کہ بھیرہ نزدیک ہے۔ اگر ہم بھاری سامان چھوڑ کر آگے بڑھ چلیں تو عجب نہیں کچھ غنیمت اہلِ فوج کے ہاتھ آ جائے۔" یہ صحیح ہے کہ ۱۵۱۹ء کی بجور کی مہم میں جب وہ سندھ پار کر کے اُترا تو جیسا کہ بیان کرتا ہے، اس نے لوٹ مار کی ممانعت کی اور اس کی بجائے باشندوں سے باقاعدہ محصول لینے کا حکم دیا تھا۔ بلکہ کہیں کہیں رسمی طور پر محافظ دستے بھی متعین کر دیے تھے لیکن اُسے پلٹتے دیر نہ ہوئی تھی کہ یہ مُٹھی بھر آدمی نکال دیے گئے۔ خود اُس کا پورا لشکر اس مہم میں دو ہزار جنگ آزماؤں سے زیادہ پر مشتمل نہ تھا اور حقیقت میں برسوں تک اس کی جمعیت اتنی نہیں ہونے پائی تھی کہ سندھ پار کی بے حساب آبادی کو زیرِ نگیں لانے کا خیال دل میں لاتا۔

البتہ ۱۵۲۵ء تک اس نے گھر کا انتظام درست کر لیا تھا۔ اور بے شبہ اتنی مدت میں سرزمینِ کابل کی [illegible] پر نہ صرف بادشاہ بننے بلکہ حکمرانی کرنے کا گر سیکھ لیا تھا اور یہ قابلیت بڑے صبر و تحمل اور غور و فکر کی بدولت حاصل کی تھی۔ اپنے آخری حریف شاہ بیگ ارغون سے قندھار بھی پھر لے لیا تھا۔ ارغون جنوب کی طرف سندھ کی گرم سرزمین میں ہٹ گیا تھا۔ مغرب کی جانب بھی بادشاہ کی عملداری ایران کے ایسے ہی گرم ریگستان تک وسیع تھی۔ شاہ بیگ ارغون بدسگالی سے کہا کرتا تھا کہ بابر کی بڑھتی ہوئی فوج کو زیادہ زمین درکار ہو رہی ہے۔ لیکن اب اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اُدھر گھٹنے شاہ اسمٰعیل صفوی کو عثمانلی ترکوں نے بمقام چلدران ۱۵۱۴ء میں ایسی قیامت

کی شکست دی کہ حواس جاتے رہے اور پھر اس نے مشرقی اقطاع کو پریشان کرنے کی کبھی جرأت نہ کی۔

قندھار بابر نے اپنے دوسرے فرزند کامران کو تفویض کیا اور خود کابل کے باغوں سے نہایت مانوس ہو گیا تھا۔ بیس برس تک مشقت جھیلنے کے بعد اب وہ اس ملک کو اپنا ملک اور یہاں کے باشندوں کو اپنی رعایا کہہ سکتا تھا۔ لکھتا ہے کہ "ہماری آنکھیں اسی زمین اور یہاں والوں پر لگی ہوئی ہیں"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یکایک اسے کیا سوجھی کہ جو کچھ قدر قلیل حاصل کر لیا تھا، اس سب کی بازی شمالی ہندوستان کی فتح کے لیے لگا دے؟ بابر نے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب کبھی نہیں دیا۔ اس کا روا روی میں لکھ دینا کہ سالہا سال سے یہ منصوبہ باندھ رہا تھا، یا یہ کہ وہ ان ممالک پر جہاں بڑے بڑے ترک سلاطین اور خصوصًا امیر تیمور کی فرماں روائی رہی، کوئی حق وراثت رکھتا ہے۔ محض نمائشی باتیں ہیں اور آئندہ قرنوں میں اکثر تاریخ نویسوں نے انھیں صحیح سمجھ لیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر کابل سے ان سرحدوں میں چلتے وقت تک وہ کوئی منصوبہ ایسے کام کرنے کا سوچتا جیسا کہ آئندہ دہ سال میں فی الواقع اس نے انجام دے لیے، تو اس کی حالت کچھ ایسی مانی جاتی جیسی ایک بار اس نے تردی بیگ کی تحریر کی کہ وہ "نشے میں پاگل" ہو گیا تھا۔ اس کی فوج کی تعداد پر نظر کیجیے کہ کوچ شروع ہوا اور ہمایوں کچھ تاخیر سے آکر شریک ہوا تو باقاعدہ جائزہ لیے جانے پر لڑنے والے سپاہیوں کا شمار سات ہزار قلم بند ہوا۔ ہمیر میں خدمت گار، باربرداری وغیرہ کاموں کے جملہ آدمی پانچ ہزار تھے۔ اس برائے نام لشکر سے ہندوستان کی عظیم افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے چل پڑنا کسی طرح خیال میں نہیں آتا۔ سکندر مقدونوی بابر سے زیادہ بے باک جرأت رکھتا تھا اور اپنے آگے کے مشرقی ممالک کا بھی اسے نہایت مبہم تصور تھا بلکہ ہندوستان کے دریاؤں کے پار قریب میں ایشیائی سمندر کے موجود ہونے کا یقین تھا۔ پھر بھی جب سرحد کے دروں سے نکل کر بڑھا تو کہیں بڑی فوج زیر علم تھی۔ بخلاف اس کے بابر خوب جانتا تھا کہ آگے کتنا وسیع ملک ہے۔ فی الواقع اس نے ان امور پر اچھی طرح غور و خوض کیا تھا۔

گمان غالب یہ ہے کہ اس مہم تقدیر آزمائی کا محرک بعض ذاتی مصلحتیں تھیں جن کو تزک میں اس نے تحریر نہیں کیا۔ اس کی عمر بیالیس برس کے قریب ہو گئی تھی اور تیس برس ٹھکانا ڈھونڈنے کی جد و جہد نے لازمًا مضر اثر ڈالا تھا۔ جوانی میں اس کی قوت کا یہ حال تھا کہ ایک بار دونوں بغلوں میں ایک ایک آدمی کو دبائے ہوئے فصیل پر دوڑ لگائی اور ہر چند ابھی تک خاصی توانائی باقی تھی پھر بھی اکثر رشتہ داروں کا اپنے سامنے گزر جانا دیکھ کر اسے یہ ناگزیر خاتمہ ضرور یاد آتا ہوگا اور اسی کے ساتھ یہ خیال کہ پھر اس کے متعلقین پر کیا گزرے گی؟ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہی کا بوجھ اٹھائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اہل و عیال کے علاوہ ان آ[illegible]

سنین میں بہت سے پناہ گزیں کابل پہنچے اور اس نے ان کی خبر گیری بھی اپنے ذمّے لے لی تھی۔ پھر قدیم امرائے امرا تقریباً سبھی صاحبِ اہل و عیال تھے اور انھیں بسر بُرد کے لیے زمین داری درکار تھی۔ ولایت کابل کی غیر آباد وادیوں میں اتنے بہت سے حصّے لگانے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

خود اپنے گھرانے کے بارے میں بابر کی تشویش کے اسباب کچھ خلافِ معمول تھے۔ اُن دنوں بابر کی عمر کے بادشاہوں کے عموماً کئی کئی سیانے بیٹے ہوتے جو کبھی باپ کی خدمت و اطاعت میں اور کبھی اس کے خلاف سازباز میں مصروف رہتے۔ بابر کے ابتدائی عمر میں بچّے نہیں ہوئے۔ سب سے بڑا ایک ہمایوں تھا کہ سترہ سال کا ہو جانے کے باوجود نگرانی کا محتاج تھا۔ عسکری اور ہندال ہنوز بہت چھوٹے اور محل سرا میں پرورش پا رہے تھے۔ وہ گلبدن اور دوسری بہنوں یا ماؤں اور خاندان کی سن رسیدہ مستورات کی طرح خود کچھ کرنے کے لائق نہ تھے۔ بابر کو سلیمان سمیت ان بچّوں اور بی بیوں کی کفالت کا خیال تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لڑکے جوان ہوں گے تو انھیں کونسی ولایت یا جاگیر گزارے کے لیے دی جائے گی؟ خود ساز" بادشاہ" کی دنیا سے رحلت کے بعد یہ بادشاہزادے اور کنبے کی بہت سی خواتین شاہی توقیر کے ساتھ کہاں رہیں گی اور کس طرح گزر اوقات ہوگی؟ اس بات کو محض اتفاقی نہیں کہہ سکتے کہ نئے مولود کا عرف ہندال (ہند والا) تجویز کیا گیا تھا۔

تنگنائے کابل کے مقابلے میں اپنی شمالی میراث کا حال بھی شیر کو پیچ و تاب میں لاتا ہوگا۔ آج وہاں کے تمام نامی گرامی بلاد پر اُزبک خاں کی بادشاہی تھی: تاشقند، سمرقند، بخارا، کرشی وغیرہ اس کے باج گزاروں میں بٹے ہوئے تھے۔ مغلوں کے قدیم قانون یسا کا نفاذ ہو رہا تھا جس سے بابر کو سخت نفرت تھی۔ نیج ندی کی مہلک جنگ کے بعد تیموری سلطنت کی باقی اراضی جنگلی ازبک سرداروں میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ پھر تھوڑے دن کے لیے جو قزل باشوں نے اسے سمرقند میں شاہ شطرنج بنائے رکھا اس ذلّت کی خلش بھی شیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔

تزک میں چند مرتبہ اس نے قدیم یونانی مقنّن سولن کا قول (جانے بغیر) اپنے لفظوں میں دہرایا ہے کہ آدمی کی زندگی کا اصلی صلہ وہ شہرت اور نیک نامی ہے جو مرنے کے بعد اسے حاصل ہو۔ امیر تیمور کے اس وارث کی نسبت جو عمر بھر کے لیے سمرقند چھوڑ کر بھاگا، آیندہ نسل کے شاعر کیا لکھیں گے؟ بابر خود ہجویہ شعر کہنے میں مشّاق تھا، وہ آسانی سے تصوّر کر سکتا تھا کہ یہ نظمیں کیسی کیسی طعن آمیز ہوں گی؟ یہاں پھر ہمیں خیال آتا ہے کہ یہ محض اتفاقی بات نہ تھی کہ ہندوستان پر حملہ کرتے وقت اس نے لکھا کہ میں تیموریوں کی گزشتہ میراث

واپس لینے چلا ہوں۔

غجدوان کی شکست نے اسے بہت مفید سبق دیا تھا۔ خود اس کا بیان تزک کے مفقود اوراق میں گم ہوگیا لیکن حیدر میرزا بتاتا ہے کہ ایرانی رسالہ جس کی قوت بے پناہ مانی جاتی تھی، اس کے غرور کی گردن کیسی عجیب طرح ٹوٹی۔ اس کا قول ہے کہ قزل باش سواروں کے دیوانہ وار حملوں کو عبید خاں کی اس جنگی تدبیر نے خاک میں ملا دیا کہ اس نے بخارا کے باغوں اور نہروں کے کنارے پیادہ تیر انداز لگا دئیے تھے جو ایرانی رسالے پر باڑیں مار رہے تھے۔ ان علاقوں میں پیادہ تیر انداز پہلے کبھی میدان میں نہ آئے تھے۔ اس مشاہدے کے علاوہ بابر کو یہ اطلاعات بھی ضرور پہنچی ہوں گی کہ مہیب سلطان سلیم (فاتح) نے تھوڑی مدت بعد چالدران کے معرکے میں ینی چری برقندازوں سے کیسا کام لیا۔ یہ فوج آڑے کر پیدل لڑی اور اسمٰعیل صفوی کے سوار لشکروں کے پرخچے اڑا دیئے۔ بابر نے خود بھی زرہ پوش پیادہ صفوں کو لڑانے کا تجربہ کیا اور اب اس کے قبضے میں یہ کرشمہ خیز آتشیں اسلحہ اور ان کے چلانے والے ترک استاد بھی آ گئے تھے۔ وہ جزئیات پر گہری نظر رکھتا تھا اور ضرور سمجھ گیا ہوگا کہ عجب نہیں نیزہ بردار سواروں کا دور ختم اور مورچہ بند پیادوں کا زمانہ آگیا ہو۔ بہرحال جب وہ آمدِ سرما میں خیبر سے نکل کر چلا تو توڑے دار بندوقچیوں کی چیدہ جمیعت اور توپوں کی اچھی خاصی تعداد اس کے جلو میں تھی۔

بابری حملے کا ایک پہلو صرف عہد جدید والوں کے ذہن میں چیستان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لشکر کابل کو نہ کوئی ملکی سرحد عبور کرنی پڑی نہ قدرتی۔ افسانہ نویسوں کو یہ بیان کرنے میں بہت مزا آتا ہے کہ از منۂ قدیم سے نیم وحشی حملہ آور ہندستان کے دروازوں یعنی درہائے خیبر وغیرہ سے آباد و مزروعہ ممالک ہند پر قبضہ جمانے کے لیے گھس آتے تھے۔ وہ قدیم آریوں، پھر سکندر یونانی اور آگے چل کر چنگیز و تیمور کی اور آخر میں بابر اور اس کے ترکوں کی آمد کا یہی نقشہ دکھاتے ہیں۔ کہانی بہت صاف اور ولولہ انگیز ہے لیکن صداقت سے بہت دور ہے۔ کوہ سلیمان اور ہندوکش کے جھرمٹوں سے قدرتی پہاڑی سرحد کا موہوم خیال دراصل انگریزوں کے زمانۂ دراز تک ہندوستان خاص پر حکومت کرنے سے پیدا ہوا جب کہ انھوں نے شمال مغربی سرحد پر اپنی فوجی چوکیوں کا سلسلہ ان غضب آلود پہاڑوں کے دامن میں قائم کیا۔ جن پر کپلنگ کے زمانے میں پہاڑی قبیلے آباد تھے۔ جس دن یہ انگریزی چوکیاں اٹھائی گئیں وہ حدِ فاصل و حائل بھی باقی نہیں رہی۔ دریائے سندھ کے مشرقی طاس میں آج بھی پٹھان بستے ہیں۔ جیسے

بابر کے عہد میں بستے تھے۔ کہانیوں کا خیبر آمدورفت کے اور راستوں کے منجملہ ایک شارع عام ہے جو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ تاریخ کا صحت سے مطالعہ کیا جائے تو پہاڑی بلندیوں کے کنارے کنارے جاتی ہوئی کوئی حدِ فاصل نہیں ملے گی۔ حملہ آور آریوں سے پیشتر وادیٔ سندھ کی تہذیب مغرب میں ہڑپّہ (کنار راوی) اور پہاڑوں میں ڈیرکوٹ کے آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر سکندر یونانی دریا کے راستے ساحل بحر تک جا کے رخصت ہوا تو اشوک راجہ کی عملداری میں وہ اقطاع شامل تھے جو کابل و قندھار کہلاتے رہے ہیں صحرائی (چنگیزی) مغول جو خوارزمیوں کو شکستیں دیتے ہوئے بڑھے، سو وہ بھی بلا روک پہاڑوں کو طے کر کے دریائے گبیر (اٹک) تک پہنچ گئے تھے اور محض ہندوستان کے میدانوں کی گرمی کی تاب نہ لا کر واپس ہوئے۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی کی سلطنت کو ان پہاڑوں کے سلسلوں نے میدانی علاقوں میں دور تک پھیلنے سے نہیں روکا۔

اگر کوئی قدرتی سرحد تھی تو وہ عریض اور طغیان آور سندھ دریا جو پہاڑی دروں سے پچاس تا سو میل آگے بہتا ہے۔ بابر نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو یہ بھی مشاہدہ کیا کہ دریا کے دوسری طرف زمین کی ہیات بدل جاتی ہے۔ پھر کابل کے صاف مطلع کی بجائے ہندوستان کا ابرآلودہ آسمان چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ کسانوں کے گاؤں اور پالتو جانوروں کے گلے تک، شہری تمدن، کھلے میدانوں کی تجارتی سرگرمی، نیز بارانی زراعت کے اثرات سے بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ انتہا یہ کہ پرندے اور جنگلی جانور بھی مختلف ہیں۔

دینِ اسلام، مشرق میں جہاں سلاطین دہلی کی حکومت رہی، بہت آگے تک نفوذ کر چکا تھا۔ بعید گنگا کی ایک بڑی معاون (جمنا) کے کنارے گرمی ماری دِلّی اور سندھ دریا کے مابین پانچ ندیوں کی زرخیز زمین پنجاب واقع تھی جسے بالائی سندھ اور اگلی ندّیاں قطع کرتی ہوئی گزرتی تھیں۔ سرسبز پنجاب کے جنوب میں تھل کا بھیانک ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ آثارِ قدیمہ کی شہادتیں بتاتی ہیں کہ ہند کے عظیم جزیرہ نما کا یہ گوشہ کبھی الگ الگ ٹکڑوں میں حد بند نہیں رہا بلکہ صدیوں سے مختلف اقوام و ملل، کاروانوں، تاجروں کی عام گزرگاہ تھا۔ یہیں ٹیکسلا کا قدیم شہر آباد تھا جہاں چین و ایران کی بعض صنّاعیوں کا اتّصال ہوا۔ گندھارا کے مندروں میں وہ بُت تراشے گئے جنھیں یونان کے تربیت یافتہ ہاتھوں نے بنایا تھا۔ یہاں کی شاہراہوں سے بیش سے بیش بہا اجناس کے وہ قافلے گزرا کرتے تھے جن کی کبھی کبھی مال سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاروں کی صورت میں بابر نے اندجان میں جھلک دیکھی۔

القصّہ بابر کابل ندی کے کنارے کنارے خیبر کی سرخی مائل پہاڑیوں کے درے سے نکل کر آیا تو وہ کسی جداگانہ معاشرے کو چھوڑ کر کسی دوسری نئی قوم پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے کافی مدت پہلے ۱۵۱۹ء میں بھی پنجاب کے دوسرے دریا (چناب) تک دیکھ بھال کر گیا تھا۔ اپنے محرکات کی تو اس نے صراحت نہیں کی کہ آج چار سو برس بعد ہم محض قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں لیکن اس کی منزل مقصود خاصی طرح واضح تھی۔ وہ مانوس، سایہ دار پشاور سے چل کر بالائی سندھ کو قلعہ پر عبور کرنا، پھر نمک کے پہاڑوں سے گزر کر ملک پنجاب پر چھا جانا چاہتا تھا۔ دل کش راوی کے کنارے پنجاب کے صدر مقام لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب پر اپنا تسلّط مضبوطی سے قائم اور اسے سلطنت کابل میں شامل کرنا مقصود تھا۔ مفتوحہ ملک کی قدرتی سرحدیں جنوب میں تھر اور شمال میں ہمالیہ، ہندوکش کے کوہستان ہوتے۔ وہ اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ پنجاب کو زیر نگیں لانے میں، ایک منزل آگے دہلی کے طاقتور بادشاہ سے اُسے کوئی نہ کوئی تصفیہ کرنا ضروری ہوگا۔ مدتوں پہلے وہ دیکھ چکا تھا کہ جب تک سمرقند پر قبضہ نہ ہو فرغانہ کی چوڑی پٹی ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں ضروری تھا کہ دہلی کو مصالحت سے یا بزور مستقل بنا دیا جائے۔ کیونکہ ٹھان لی تھی کہ پنجاب کا خطۂ فراخ اپنا، اور لاہور کو دوسرا کابُل بناؤں گا تاکہ گنگا کی بالائی وادی سے آمُو کی بالائی وادی بدخشان تک میرا حکم چلے۔ نیچے تپتے ریگستان اور اوپر وسط ایشیا کے بلند کوہستان اس کے پاسبان رہیں۔

وہ راز کی بات جس کی بابر نے اپنے سپہ سالاروں اور فرزند ہمایوں کو بھی خبر نہ کی، یہ تھی کہ جب تک اس کی فتوحات پکّی نہ ہو جائیں وہ سندھ کے پار ہی ٹھیرا رہے گا۔ اسے آیندہ پناہ گزین بننا منظور نہ تھا۔ اور اب کے اس ارادے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابر پلٹ کر پھر کبھی کابُل نہ آیا۔

باب ہفتم

پانی پت اور کنواہہ

کابل سے حتمی کوچ!

۱۵۲۵ء کے ناخوش گوار دسمبر میں جو لشکر خیبر کے نکلے سے نکل رہا تھا اس کی رہنمائی کا ملا بابر پر منحصر تھی۔ تنہا اُسی کی ذات خیل و سپاہ کی تقویم کا باعث تھی اور خود اسے اپنا عزم فقط اس امید پر دھکیلے لیے جا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اقبال اس کا یاور و مدد گار ہو جائے گا۔

مگر بابر تقدیر کی نیرنگیوں سے ناواقف نہ تھا۔ سفر میں دوبارہ پیچش ہوئی اور سینے سے خون آیا۔ ایک سال قبل تقدیر ہی نے (یا اس کی اپنی بے تدبیری نے) لاہور سے اس کی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا تھا جب کہ وہی حلیف جنھوں نے اسے پنجاب آنے کی دعوت دی، پلٹ گئے اور اس کی مٹھی بھر فوجوں کو اکیلا چھوڑ دیا جو بادشاہ دہلی کا کسی طرح مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ تاہم بعض محافظ دستے وفادار سرداروں کے ماتحت، قلعوں میں ڈٹے رہے۔ یہ قلعے پنجاب کے دوآبوں میں واقع تھے اور بابر کا انھیں گھیرے سے نکالنا لازم تھا۔ اپنے بخار اور خون آور کھانسی کو اس نے اپنی توبہ شکنی کے گناہ کی سزا خیال کیا۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق:

" فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

(جس نے اپنا عہد توڑا، سو اپنی ہی جان پر توڑا، اور جس نے پُورا کیا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے تو اسے وہ جلد اجرِ عظیم دے گا۔")

لکھتا ہے کہ "میں نے بار دگر توبہ اور ضبطِ نفس کا ارادہ کیا کہ آئندہ غیر مشروع خیالات دل میں نہ لاؤں گا نہ زبان سے ان کا اظہار کروں گا۔ اپنا قلم میں نے توڑ دیا...... اس شام کوچ کر کے علی مسجد

ہیں ٹھہرا (خیبر کے دہانے کا قلعہ) یہاں گھاٹی تنگ ہوگئی ہے۔ میں ہمیشہ ایک ٹیکری پر اپنے خیمے نصب کراتا ہوں۔ رات کو نیچے لشکرگاہ میں الاؤ جلائے گئے تو خوب روشنی اور عجیب طرح کا چراغان کا لطف آیا اسی لیے میں اس منزل میں شراب پیا کرتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی پی.... سحر سے پہلے معجون کھائی اور دن کو روزہ رکھا۔ دوسرے دن لشکرگاہ سے گینڈوں کی جھاڑیوں کی طرف چلے۔ بگرام (لشپاور) کے قریب رودِ سیاہ کو عبور کیا اور بہاؤ کے رُخ حلقہ بنا کے چلے۔ اتنے میں کسی نے خبر دی کہ قریب کی جھاڑیوں میں ایک گینڈا ہے۔ سواروں نے درختوں کے اس جھنڈ کو گھیر لیا۔ ہم باگ ڈھیلی چھوڑ کر حلقے میں شامل ہوئے۔ غل شور مچانے سے گینڈا جھاڑیوں کے اندر سے نکل آیا۔ ہمایوں اور پہاڑ سے آنے والوں نے کبھی گینڈا نہ دیکھا تھا انھیں اچھا تماشا ہاتھ آیا۔ کوئی کوس بھر تک تیر مارتے ہوئے پیچھا کرتے گئے۔ گینڈے نے کسی آدمی یا جانور پر حربہ نہیں کیا اور وہ اور دو اَور گینڈے گرائے گئے۔ بہت دن سے میرے دل میں تھا کہ ہاتھی اور گینڈے کا مقابلہ کرا کے دیکھا جائے۔ اس شکار میں مہاوت ہاتھی کو لائے۔ گینڈا ہاتھیوں کی جانب جھپٹا مگر جب ایک مہاوت نے ہاتھی کو آگے بڑھایا تو وہ سامنے نہ ٹھہر سکا، بلکہ دوسری طرف دوڑ گیا۔

اس دن بگرام آ کر میں نے چند (کل ۶ یا ۷) سرداروں اور بخشیوں کو مقرر کیا کہ دریا کے معبر پر کشتیوں کا انتظام کریں اور سب اہلِ لشکر کا جو دریا اتریں نام لکھتے جائیں۔ اس رات مجھے اسہال اور کھانسی میں خون آیا۔ بہت فکر ہوئی، لیکن خدا کی رحمت سے دو تین روز میں آرام ہوگیا۔ ہم بگرام سے چلے تو بارش ہونے لگی۔ اگلی منزل کابل ندی پر کی۔

یہاں خبر ملی کہ دولت خاں اور غازی خاں نے [جو پہلے بابر کے حلیف تھے اور اب حریف تھے] بیس تیس ہزار آدمی جمع کر لیے اور کلانور فتح کر کے اب لاہور پر چڑھائی کرنے والے ہیں [جہاں بابر کا محافظ دستہ متعین تھا] فوراً ایک قاصد سرپٹ دوڑایا گیا کہ ہمارے آدمیوں کو خبر دے کہ "ہم منزل بہ منزل آ رہے ہیں۔ ہمارے آنے تک لڑائی نہ کریں"۔

ہفتے کو آبِ سندھ سے عبور کیا اور دوسرے کنارے پر اُترے، جن سرداروں کے سپرد کشتیوں کا انتظام تھا انھوں نے خبر دی کہ فوج میں اچھے بُرے، چھوٹے بڑے، سپاہی اور نوکر سب ملا کر بارہ ہزار لکھے گئے۔

امسال میدانوں میں بارش بہت کم ہوئی لیکن دامن کوہ میں اچھی ہوئی اور مزروعہ اراضی کو سیراب کر گئی۔ اسی بیہ میں نے پہاڑوں کے نیچے نیچے سیال کوٹ کا راستہ اختیار کیا۔ گکھڑوں کا علاقہ طے کرتے میں ایک ندی ملی جس کے پیٹے میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے جوہڑ بن گئے تھے اور ان سب میں پانی کڑی تا تھہ ہاتھ بھر منجمد ہو گیا تھا۔ اتنی برف ہندوستان میں شاذونادر پڑتی ہے۔ آیندہ جتنے سال میں ہندوستان میں رہا میں نے اس طرح کی یخ کبھی نہیں دیکھی۔

سندھ سے پانچ منزلیں چل کر چھٹے پڑاؤ پر میں ایک دن اور ٹھیر گیا کہ لوگ سامان رسد حاصل کریں۔ اس روز ہم نے عرق پیا۔ ملّا پرغزی نے طرح طرح کی کہانیاں سنائیں۔ اسے اتنا بولتے نہیں دیکھا تھا۔ ملّا شمس بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ پینے پلانے والے تک بس نہیں کی۔ ہر قسم کے اہل لشکر جو غلّہ لینے گئے تھے، کھیتوں کو چھوڑ دور تک جنگلوں پہاڑیوں کے اندر گھس گئے کہ شاید کوئی قیدی پکڑ لائیں۔ اس بے احتیاطی کی بدولت خود اپنے کئی آدمی ضائع کروا آئے۔

اگلے روز جہلم کو پایاب جگہ سے عبور کیا اور کناروں پر منزل ہوئی۔ ولی (ر بہ تصحیح مترجم) قزل نے حاضر ہو کر سیال کوٹ کو (جو اس کی تحویل میں دیا گیا تھا) چھوڑنے کی مجبوری بیان کی۔ میں نے کہا تم سیال کوٹ میں نہ رہ سکتے تھے تو دوسرے امرا کے پاس لاہور کیوں نہیں چلے گئے؟ اس کا معقول جواب نہ دے سکا لیکن فوج کشی کا موقع تھا، اُسے سزا نہیں دی۔ اسی پڑاؤ سے سیّد طوفان اور سیّد لاچین کو ایک ایک کوتل گھوڑا دے کے روانہ کیا کہ سرعت سے لاہور جا کر سرداروں سے کہیں کہ وہاں لڑائی نہ لڑیں بلکہ ہم سے سیال کوٹ یا پسرور آ کر ملیں۔ افواہ سُنا تھا کہ غازی خاں نے چالیس ہزار فوج فراہم کر لی ہے اور دولت خاں نے دو دو تلواریں کمر سے باندھی ہیں اور جنگ پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے مثل یاد آئی کہ "تو سے دس اچھے" اور دل میں کہا کہ جب تک لاہور کے سردار آکر شریک نہ ہو جائیں، جنگ کرنا ٹھیک نہ ہو گا۔ ان کا انتظار کرو۔" قاصد بھیج کر ہم چناب کی طرف چلے اور اسے اُتر کر دوسرے کنارے پڑاؤ لگایا۔ میں کنارے کنارے سیر کرتا ہوا ایک پہاڑی تک گیا جہاں دریا کی گہری شاخ کے اوپر قلعہ بنا ہوا ہے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ ارادہ کیا کہ سیال کوٹ والوں کو یہاں لا کر بسایا جائے [سیالکوٹ میں پانی کے خراب ہونے کی وجہ سے] خدا نے موقع دیا تو ایسا کیا جائے گا۔ پھر کشتی میں بیٹھ کر لشکر گاہ کو واپس آیا۔ کشتی میں مے کشی کا جلسہ جما۔ بعض نے عرق، بعض نے ہلکی جَو کی شراب ("بوزہ") پی۔ بعض نے معجون کھائی۔ نماز عشا کے وقت میں

کشتی سے اُترا۔ میرے خیمے میں آ کر بھی کچھ شراب پی گئی۔ گھوڑوں کو آرام دینے کے لیے ہم یہاں ایک روز اور ٹھیرے۔

جمعے ۲۹ دسمبر کے دن سیال کوٹ میں اُترے۔ ہر دفعہ جب میں ہندوستان آیا، جاٹ گوجر اپنے پہاڑی جنگلوں سے نیچے اُتر کر گائے بھینسیں لوٹ لے جاتے تھے۔ یہ منحوس لوگ اس ملک کے لیے بلائے جان ہیں۔ اس مرتبہ ہم نے ملک اپنے زیرِ نگیں لیا ہے مگر یہ موذی پھر لوٹ مار کرنے اُترے۔ جب سیال کوٹ میں لشکر پڑا تھا تو بستی سے پڑاؤ آنے جانے والوں پر بھی انھوں نے دست درازی کی اور ہنگامہ مچایا۔ اچھے بھلے آدمیوں کے کپڑے تک اُتروا لیے۔ میں نے چوروں کو ڈھونڈوا کر پکڑا اور دو تین کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیے۔

سیال کوٹ سے ایک سردار کے بھائی شاہم کو سرپٹ لاہور بھیجا کہ لاہور کے حکام سے دشمن کی صحیح خبر لائے کہ وہ کہاں ہے اور ہم کس طرح مقابلہ کریں گے۔ تاکید کر دی کہ قابلِ اعتماد آدمی کو بھیج کر معلوم کریں اور ہم کو اطلاع دیں۔

پڑاؤ پر ایک سوداگر نے خبر سنائی کہ عالم خاں نے سلطان ابراہیم سے شکست کھائی۔"

پھر وہ سب سازش کرنے لگے

شیر کا یہ کوچ جس میں وہ دو دو تین تین منزلیں مارتا ہوا پنجاب کی ندیاں عبور کرتا ہوا چلا، اپنے آزمودہ کار ترک سرداروں کو گھیرے سے نکالنے کی غرض سے تھا۔ ان سرداروں کو لاہور میں ڈٹے رہنے کا حکم تھا اور وہ سازش بغاوت، بدعہدی کے اس طوفان میں جو ہندی مسلمانوں میں آیا ہوا تھا، اپنی مفوضہ خدمت بڑی ہنرمندی سے انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں دغا اور بے وفائی کا یہ ساز غالباً سلطان ابراہیم لودھی کے مزاج کی وجہ سے جنبش میں آیا کہ وہ ایک لائق باپ کا تنگ دل حریص بیٹا تھا۔ ۱۵۱۷ء میں اس کے باپ (سکندر لودھی) نے تقریباً سالم "ہندوستان" ترکے میں چھوڑا تھا جس کی حدود گنگا سے سندھ تک وسیع تھیں اور کئی طاقت ور راجپوت ریاستیں اس میں شامل کر لی گئی تھیں۔ لیکن ابراہیم نے بادشاہ ہو کر اپنے اکثر بڑے بڑے امرا کو دشمن بنا لیا جو نسلاً افغانی اور طبعاً سرکش تھے۔ سن رسیدہ عالم خاں، ابراہیم سے جبراً بادشاہی چھین لینے کی تگ و دو میں سندھ پار کابل گیا کہ بابر ہی ایک بیرونی بادشاہ مدد دینے کے

قابل نظر آتا تھا۔ عالم خاں کا بھتیجا دولت خاں ابراہیم کی طرف سے پنجاب کا صوبہ دار تھا، اس نے اپنے لیے الگ یہی درخواست کی تھی۔ امرائے ہند کی اس دُہری غدّاری ہی سے بابر کو ترغیب ہوئی اور گذشتہ سال وہ لاہور تک تاخت لایا تھا۔ اس کی فوج تعداد میں کم، لیکن ایک ہی پیوستہ، باقاعدہ جمعیت تھی جو ایک خاص مقصد لے کر ملک میں داخل ہوئی اور مزاحمتوں کو بلا دِقت ہٹاتی ہوئی دلکش راوی کے کنارے لاہور پہنچ گئی۔ یہاں آکر پتا چلا کہ بڈھا دولت خاں سارا پنجاب خود لینے کی امید لگا رہا ہے، حالانکہ یہی وہ صوبہ تھا جسے بابر اپنی سلطنت کابل سے الحاق کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ ابھی تک دہلی یا وہاں کی حکومت پر کسی حملہ کرنے کا خیال اُسے نہ آیا تھا۔

اسی سال جب بابر واپس کابل گیا کہ بلخ کی طرف جو فتنہ و فساد ازبکوں نے برپا کیا تھا، اسے فرو کرنے کے لیے ہمایوں کی مدد سے تازہ افغانی فوج بھرتی کرے، تو یہاں دولت خاں اور اس کے بھتیجے غازی خاں نے اپنی فوجیں تیار کرنی شروع کیں کہ پنجاب میں متعیّن کابلی جمعیتوں کو نکال باہر کریں۔ انھوں نے بابر کی سپاہ کو دو حصّوں میں بانٹ دینے کی بھی تدبیر کی تھی اور اگر اسے دولت خاں کا بیٹا دلاور خاں بروقت ان کے فریب کی اطلاع نہ دے تو عجب نہیں بابر کو سخت نقصان اُٹھانا پڑتا۔ پھر گذشتہ گرمیوں میں سن رسیدہ عالم خاں دوبارہ دربارِ کابل میں ایک نئی بہ تجویز لے کر آیا کہ بابرؔ دولت اور غازی خاں کی سرکوبی کے علاوہ، قابل نفرت مگر طاقتور ابراہیم لودھی کو دہلی سے دفع کرے کہ عالم خاں کا تخت و تاج پر قبضہ ہو جائے اور پھر اپنا مرغوب خاطر صوبہ پنجاب وہ شوق سے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ قرار داد کر کے عالم خاں اس پیرانہ سالی میں اُفتاں وخیزاں پھر سندھ کے پار واپس گیا۔ لیکن اب جو اصل مقام معرکہ میں بابر آیا تو رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ عالم خاں جو لاہور کی محافظ فوج کے نام بابر کے خط لایا تھا۔ باغیوں کے صدر گروہوں، یعنی دولت خاں اور غازی خاں سے خود مل گیا اور اُن میں یہ نئی سازش کی کھچڑی پکائی گئی کہ تینوں مل کر ابراہیم سے دہلی چھین لیں اور ادھر بابر کے لاہوری دستے کا قلع قمع کر کے اُسے بڑھنے سے روکے رکھیں۔ کیونکہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ بابر کے پاس جنگ آزما سپاہیوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ چنانچہ بابر پریشان ہو کر جلد سے جلد لاہور آرہا تھا اور اپنے دشمنوں کے ٹھیک ٹھیک مقام، ارادوں اور لشکروں کی صحیح خبروں کا جویا تھا۔

سازشوں کا دھواں اس کے گرد چھایا ہوا تھا۔ لیکن اصلی طاقت در حریف دھوئیں کے عقب

ہیں ابراہیم لودھی ہندوستان خاص کا فرماں روا تھا جس کی فوجیں دہلی و آگرہ میں پڑی تھیں اور دوسرا راجپوت ریاستوں کا وہ جتھا جو مسلمانوں کے خلاف آگے جنوب میں گٹھ جوڑ کر رہا تھا۔ اس طرف سے پہلی اطلاع بابر کو جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ ملی کہ عالم خاں نے ابراہیم لودھی سے شکست کھائی۔ اس کی تفصیل بابر نے اس طرح تحریر کی ہے: "کابل میں مجھ سے رخصت ہو کر عالم خاں، سخت گرمی اور ساتھیوں کو تکالیف ہونے کے باوجود دو دو منزلیں روزانہ طے کرتا ہوا، لاہور گیا۔ انہی ایام میں ازبک سرداروں نے بلخ پر پیش قدمی کی تھی لہٰذا میں فوراً اُدھر چل پڑا۔ عالم خاں نے لاہور میں میرے سرداروں سے اصرار کیا کہ ہمیں غازی خاں سے مل کر دہلی آگرے پر فوج کشی کرنی چاہیے۔ یہی بادشاہ کا حکم ہے۔ میرے سرداروں نے جواب دیا۔ ہم غازی خاں پر کیونکر بھروسہ کریں۔ ہمیں بادشاہ حکم دے چکا ہے کہ جب تک دربار کابل یا لاہور وہ یرغمال نہ بھیجے، اس کے ساتھ میل نہ کیا جائے۔ تمھیں وہ شکست دے چکا ہے۔ تم کس برتے پر اس سے اتحاد کرتے ہو۔ اور اس اتحاد کا فائدہ بھی کیا ہوگا؟ یہ کہہ کر انھوں نے انکار کر دیا۔ عالم خاں نے اپنے بیٹے شیر خاں کو دولت خاں اور غازی خاں کے پاس بھیجا اور پھر سب نے مل کر یہ سازش پکائی کہ دولت اور غازی تو ادھر (پنجاب) کے سب قلعوں کو سنبھالیں اور عالم خاں دوسرے امرا کو ہمراہ لے کر دہلی اور آگرے پر قبضہ جمائے..... چنانچہ وہ منزل بہ منزل دہلی روانہ ہوئے۔ اسے گھیرے میں تو لے لیا۔ لیکن نہ وہاں کی فوج کی ناکہ بندی کر سکے نہ یورش کر کے شہر فتح کر سکے۔ ان کی سپاہ شمار میں کم و بیش تیس ہزار ہو گی۔ سلطان ابراہیم کو ان کے مقابلے میں آنے کی خبر ہوئی تو فوراً سوار فوج تیار کر کے لڑنے آیا۔ اہل سازش اپنی لشکر گاہ سے اس کا سامنا کرنے چلے مگر آپس میں بحث کر کے طے کر لیا کہ "دن کے وقت لڑائی ہوئی تو بد دل افغاں جو ابراہیم کے لشکر میں ہیں، بدنامی کے ڈر سے اسے چھوڑ کر ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔ لیکن رات کے وقت حملہ کیا جائے جب کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تو ہر کوئی اپنا اپنا راستہ لے گا۔"

"دو دن سہ پہر کے بعد وہ کوئی چھ کوس کے فاصلے سے چلے اور دونوں دن فیصلہ نہ کر سکے کہ شب خون ماریں یا واپس پلٹ جائیں۔ رات کے دو دو پہر گھوڑوں پر چڑھے بیٹھے رہے۔ آخر تیسری رات کو وہ بھی پچھلے پہر کے ختم ہوتے، انھوں نے چند ڈیروں اور چھپروں پر حملہ کیا۔ غل غور مچا کر ان میں آگ لگا دی۔

سلطان ابراہیم صبح کی پہلی نوبت بجنے تک اپنے سراپردے سے اُٹھ کر نہ آیا۔ عالم خاں کے آدمی ان

ڈیروں کا سامان لوٹنے اور دوسرے خیمے تاکنے میں مصروف تھے جب کہ دن نکل آنے پر ابراہیم کے اہل لشکر نے دیکھا کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ ایک ہاتھی لے کر لڑنے نکلے۔ عالم خاں کے آدمی ہاتھی کے سامنے نہ تھم سکے اور بھاگ پڑے۔ عالم خاں (بہ تصحیح مترجم) میانِ دوآب کے علاقے سے فرار ہوتا ہوا، نواح پانی پت میں آیا..... سرہند سے گزرتے ہوئے اسے ہماری پیش قدمی کی خبر ملی۔ اس کا بیٹا دلاور خاں جو ہمیشہ میری خیر خواہی کرتا رہا اور اس کی وجہ سے دو تین مہینے قید میں ڈالا گیا، باپ کے ہمراہ تھا مگر اب اسے چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے پاس سلطان پور چلا گیا اور چند روز بعد میرے پاس حاضر ہوا۔ عالم خاں اور اس کے باقی ماندہ رفیق ستلج عبور کر کے دامنِ کوہ کے ایک قلعے میں چلے گئے۔"

افواہوں کی وبا سی پھیلی ہوئی تھی مگر بابر نے کوچ جاری رکھا۔ ہر منزل پر بکھرے ہوئے مغل دستے، آزمودہ کار سردار جیسے محمد علی ڈنگ ڈنگ[1] آتے اور شریک لشکر ہوتے۔ دشمن کی ایک بڑی جمعیت (جانب لاہور) راوی کے کنارے سنی گئی۔ بابر سیدھا ان کے خلاف بڑھا اور دوبارہ حریف کہ اس موقع پر دولت اور غازی خاں تھے، قوت آزمائی کی جرأت کیے بغیر عزم مصمّم کے سامنے سے بھاگتے نظر آئے۔ غیر منظم دشمنوں کا الگ الگ منتشر ہونا عین بابر کے حسب مراد تھا۔ اس نے اپنے لاہوری سرداروں کے ماتحت جو علاقے سے واقف تھے، تعاقب میں ایک فوج روانہ کی اور تاکید کی کہ خاص طور پر غازی خاں کی تلاش کی جائے جو اچھا لڑنے والا تھا۔ ضعیف العمر عالم خاں کو اس کے چند روزہ حلیف چھوڑ گئے تھے۔ وہ ایک پہاڑی قلعے میں کچھ خطرناک نہیں رہا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ "افغان اور ہزارہ قبائل کا ایک میرا لشکر اس قلعے کے نزدیک سے گزرا اور قریب تھا کہ قلعے کو حملہ کر کے چھین لے لیکن رات ہو گئی۔ اُدھر قلعہ والے اندھیرے میں نکل جانا چاہتے تھے۔ ان کے گھوڑے دروازۂ قلعہ میں ایسے پھنسے کہ نکل نہ سکے۔ وہاں کچھ ہاتھی بھی ہوں گے جنھوں نے کئی گھوڑے روند کر ہلاک کر دیئے۔ عالم خاں گھوڑے پر سوار ہو کر نہ نکل سکا تو اندھیرے میں پیدل بھاگ نکلا اور سخت تکلیفیں اٹھاتا ہوا کسی نہ کسی طرح غازی خاں کے پاس پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ مگر وہاں اس کی کچھ آؤ بھگت نہیں ہوئی آخر ہار کر میرے پاس حاضر ہونا پڑا۔"

اس کے آنے سے قبل خود بابر راوی اُتر کر (۲۲ جنوری) اپنے ہراول دستے کے پیچھے پیچھے ملوت

---

[1] تزک فارسی میں "جنگ جنگ"۔ مترجم۔

کوچیا جہاں نشیبی پہاڑیوں کے اس قلعے میں دولت خاں نے پناہ لی تھی۔ پورے لشکر نے جمع ہو کر قلعہ گھیر لیا۔ پنجاب کا یہ سابق صوبہ دار اب اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا، اس کا ایک نو عمر پوتا قلعے کے باہر آیا کہ بادشاہ سے قبول اطاعت کی شرائط کا پتہ چلائے۔ وہ یہ وعدہ لے کر واپس گیا کہ ہتھیار ڈال دیئے تو عفو و درگزر کا سلوک ہوگا، مقابلہ کیا تو بزور مغلوب کیا جائے گا۔ اگلے دن بابر سوار ہو کر قلعے کی دیکھ بھال کو نکلا کہ اندر والے محصور بھی اسے دیکھ لیں۔

" اب دولت خاں نے پیام بھیجا کہ غازی خاں پہاڑوں میں نکل گیا مجھے معافی مل جائے تو قلعہ حوالے اور خود خدمت کرنے کو حاضر ہوں۔ میں نے خواجہ میر میراں کو بھیجا کہ اس کے دل سے خوف دور کرے اور اپنے ہمراہ باہر لے آئے۔ وہ اپنے ساتھ بیٹے کو بھی لایا۔ میں نے حکم دیا کہ دونوں تلواریں جو مجھ سے لڑنے کو باندھتا تھا، اب گردن میں ڈال کر سامنے لایا جائے۔ یہاں تک نوبت آنے پر بھی اس کی اکڑ نہیں گئی۔ خیرہ چشمی سے حیلے کرتا تھا۔ سامنے آ کر جھکنے میں بھی تامل کیا۔ میں نے نوکروں سے کہا پاؤں کھینچ کر تعظیم کراؤ اور میرے روبرو بٹھا دو۔ پھر ایک ہندوستانی زبان جاننے والے سے کہا کہ میں جو کچھ کہوں لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے اسے سناؤ۔ میں نے کہا " اس سے کہو کہ میں تجھے باپ کے لفظ سے یاد کرتا تھا اور تیری توقع سے بڑھ کر عزت و تکریم کرتا رہا۔ تجھے اور تیرے لڑکوں کو در بدر پناہ لیتے پھرنے سے بچایا۔ تیری حرم اور اہل و عیال کو ابراہیم کی قید میں نہیں جانے دیا۔ تیرے باپ کا تین کروڑ کا ملک تجھے دیا۔ بتا تو سہی میں نے تیرے ساتھ کونسی برائی کی تھی کہ تو نے مجھ سے لڑنے کے لیے دو دو تلواریں کمر سے باندھیں؛ اور فوج لے کر میرے ملک کو اقطاع پر چلا کہ فتنہ و فساد برپا کرے ؟"

بڈھے سے کوئی جواب نہ بن پڑا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اور حقیقت میں جواب دے بھی کیا سکتا تھا۔ خواجہ میر میراں کے پاس اسے رکھے جانے کا حکم دیا۔ ہفتے کو میں خود قلعے کے دروازے پر گیا اور گھوڑے سے اتر کر ایک ٹیکرے پر کھڑا ہو گیا کہ ان کے سب کنبے اور زنان خانہ کے لوگ حفاظت سے روانہ کر دیئے جائیں۔ ..... اگرچہ غازی خاں کی نسبت گمان تھا کہ جا چکا ہے لیکن بعض لوگ کہتے تھے ہم نے اسے قلعے کے اندر دیکھا ہے اسی واسطے اپنے ذاتی نوکر اور معتمد علیہ دروازے کی پاسبانی کے لیے مقرر کیے کہ وہ دھوکہ دے کے نکلنے نہ پائے اور زر و جواہر چوری سے لے جاتے دیکھیں تو ضبط کریں۔ رات کو بھی میرا قیام ٹیکرے پر رہا پھر قلعے کے اندر سیر کرنے گیا۔ غازی خاں معمولی سا شاعر اور

مطالعے کا بڑا شوقین تھا، میں خاص طور پر اس کا کتب خانہ دیکھنے گیا۔ متعدد کتابیں بہت اچھی تھیں چند ہمایوں کو دیں اور چند کامران کو (قندھار) بھیجیں۔ علمی مسائل کی اور بھی بہت سی کتابیں تھیں مگر اتنی بیش قیمت نہ نکلیں جیسی اوّل امید تھی...... قلعہ ملوت محمد علی (جنگ جنگ) کے، جس نے اس کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی، تفویض کیا گیا اور دو سو (یوسف زئی) افغان سپاہی پاسبانی کے لیے اُسے دیے۔ خواجہ کلاں کئی اونٹوں پر غزنیں کی شراب میں لایا تھا، لہذا اسی کے ڈیرے میں جہاں سے قلعہ اور لشکر گاہ نظر آتی تھی، ہم نے جلسہ لگایا۔ بعضوں نے عرق پیا۔ کسی نے شراب، ملا جلا جلسہ تھا۔"

عزم وہمت کی رکاب میں پاؤں ڈالتا ہوں

جنگی مصروفیات کے ہنگام میں بھی ہمارا شیرا پنے پٹے ہوئے حریفوں پر حرف زنی کیے بغیر نہیں رہا۔ لکھتا ہے کہ دولت خاں سلطان پور جاکر، جسے اپنے عہدِ اقتدار میں بنایا تھا، مرگیا اور غازی خاں کو جو پہاڑیوں میں چھپتا پھرتا تھا، نام دھرتا ہے کہ وہ بے شرم باپ، بھائی بہنوں کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اور سعدیؒ کا قطعہ نقل کرتا ہے کہ

به بیں آں بے حمیّت را کہ ہرگز ۔۔۔ نخواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را ۔۔۔ زن و فرزند بگزارد بہ سختی

ذاتی ننگ و ناموس کا ہندوستان کے سپاہی پیشہ مسلمانوں میں بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں والے یہ مشاہدہ کیے بغیر نہیں رہے کہ اگرچہ بادشاہ ترک دمغل اور افغان غارتگروں کی فوج لیے چڑھ آیا ہے اور اپنے دشمنوں سے سختی اور سنگ دلی میں کمی نہیں کرتا، تاہم اسے عزّت نفس کا پاس ہے، بات کا سچا ہے اور اپنے اسیروں کے ساتھ غیر معمولی عفو و درگزر سے پیش آتا ہے۔ راوی عبور کرنے کے بعد ابھی ہتھیار کی تیزی کم ہو گئی تھی اور اس کے پاس ہندوستان کے عمائد و رؤسا کے دوستانہ خطوط، اور ان میں سے بعض اصالتاً بھی آنے لگے تھے۔ ایسے ملک میں جہاں ہر شکیبری پگڈنڈوں اور بلندی پر مضبوط گڑھ بنے دیکھے تھے، بابر نے لوگوں کو اپنی طرف یہ میلان اقبال مندی خیال کیا۔ جنگل جھاڑیاں تک بندروں اور موروں سے معمور تھیں۔ اثناء سفر میں بوڑھا عالم خاں ایک قلعے سے نکل کر تنہا پیادہ پا قبولِ اطاعت کے لیے حاضر ہوا۔ بابر نے اس کی آمد سن کر گھوڑے اور پیشوائی کے لیے سردار بھیجے کہ توقیر و عزت سے لے کر آئیں۔

سلاطین دہلی کے خاندان کے ایک ایسے بزرگ فرد کا ہاتھ آجانا عین مفید مطلب تھا۔ مفت کے یرغمال حلیف کے ساتھ سیاسی مصالح کے مطابق عزت و حرمت کا برتاؤ کیا گیا۔ اس کا بیٹا دلاور خاں پہلے بھی بابر کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا، اب دوبارہ معافی کا خواستگار بن کر حاضر ہوا۔ قیدی امیروں کے فدیے یا معافی کے بارے میں (بہ تصحیح مترجم) اُسے شریکِ مشورہ کیا گیا۔

موسم بہار کی ابتدائی گرمی میں برف پوش ہمالیہ کے دامن میں سفر کرنا پُر لطف تھا۔ اسی میں بڑے بڑے زرخیز اقطاع جو لڑنے والے دشمنوں سے چھینے تھے، جاں نثار سرداروں کو عطا کیے گئے ہندوستان کے رئیسوں کو بھی نظر آ گیا کہ بادشاہ کے خلاف لڑنے کی بجائے اس کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہو جانا زیادہ نفع کا سودا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر ابھی سے ملک پر فرماں روائی کے اصول و ضوابط اپنے ذہن میں مرتب کر رہا تھا۔

سرہند کے قریب ایک گستاخ سا ہندوستانی امیر لشکر میں آیا اور کہا مجھے سلطان ابراہیم نے سفیر بنا کر بھیجا ہے، بابر بھی اپنا سفیر جوابًا شہنشاہ دہلی کے دربار میں روانہ کرے۔ بابر کو ترنگ سوجھی۔ دو پہرہ داروں کو حکم دیا کہ وہ سفیر بن کر سلطان ابراہیم لودھی کے پاس جائیں"۔ لودھی نے ان بیچاروں کو قید میں ڈال دیا تھا، لیکن عین رہائی پت کی جنگ کے وقت وہ چھوٹ کر نکل آئے"۔

اسی سلسلے میں بادشاہ نپولین کی طرح آغاز جنگ کے قریب قلم کی جولانی دکھاتا ہے:

"اب میں نے ہمت کی رکاب میں پاؤں رکھا اور توکل علی اللہ کی باگ ہاتھ میں لے کر ابراہیم لودھی خلف سلطان سکندر لودھی افغان سے لڑنے چلا جو ممالک ہند کا حاکم اور پائے تخت دہلی میں مقیم تھا۔ اس کا لشکر شمار میں ایک لاکھ اور اس کے اور ماتحت سرداروں کے جنگی ہاتھی ایک ہزار بتائے جاتے تھے.... ایک رات ہم ایک سوکھی ندی کے کنارے اُترے۔ دیکھ بھال کرتے گھوڑوں پر چلے تو چند کوس آگے ایک اور آب رواں کی ندی ملی جس کا بہاؤ چار یا پنچ پَون چکیوں کو چلانے کی قوت رکھتا تھا۔ مقام خوش منظر ہوا لطیف تھی۔ اس کے بالائی گھاٹ پر جہاں سے پانی پہاڑیوں سے نکل کر نیچے آتا ہے میں نے "چار باغ" بنانے کا حکم دیا..... اس مقام پر خبر ملی کہ سلطان ابراہیم دہلی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اسی طرح حمید خاں حاکم حصار (شمال مغرب دہلی) سے دس پندرہ کوس آگے بڑھ آیا ہے۔ ابراہیم کے لشکر کی خبر لانے کتہ بیگ اور حمید خاں کی فوج کا حال معلوم کرنے مومن اتکہ بھیجے گئے..... ہم انبالہ کے

برابر سے چل کر ایک بڑے تالاب کے کنارے اترے۔"

ظاہراً بادشاہ کو دامن کوہ سے میدان میں آنا پسند نہ تھا۔ اس کے ولایتی سپاہی اور سردار پہاڑوں کے موسم و مناظر سے مانوس تھے حسب معمول وہ یہاں بھی نئی بھرتی سے فوج کے کھاتے بھر رہا تھا۔ اگرچہ خوب جانتا تھا کہ یہ نو وارد فوجی نظم و ضبط کے بہت کم پابند ہوتے ہیں۔ مگر ابراہیم کے آہستہ آہستہ بڑھنے کی خبر سن کر اس نے فوراً کام شروع کیا اور میمنہ کی پوری جمعیت ہمایوں کی سپہ سالاری میں حمید خاں کے خلاف روانہ کی، تاکہ نوجوان شہزادے کی جنگی قابلیت کا امتحان کرے۔ فوج کی تعداد بہت معقول اور چیدہ آزمودہ کار سردار جیسے خواجہ کلاں، خسرو کوکلتاش، محمد علی جنگ جنگ ہمراہ کیے۔ ان کی موجودگی میں ہمایوں کو شاید خود کچھ بھی نہ کرنا پڑا ہوگا لیکن بہرحال وہ وہاں تھا۔

حصار کے لشکر سے، اوّلاً ہراول دستے کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مغل سوار بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہوئے دشمن پر جا پڑے اور جب اس نے ہر طرف سے سمٹ کر انھیں گھیرنا چاہا تو کنارِ افق سے اصل فوج اُبھرتی ہوئی دکھائی دی، معلوم ہوا کہ ہراول کو آگے بڑھا کے لڑانا حصار کے سارے لشکر کو سامنے لے آنے کی چال تھی۔ قدرتی طور پر حصار والوں نے اپنا رُخ دوسری جانب پھیرا۔ لیکن مغل حملہ زن رسالے کی طرف سے یہ منہ پھیرنا غضب ہوگیا۔ پھر اُن کے قدم نہ ٹکے۔ ہمایوں کے منتخب سرداروں نے مار مار کے بھگا دیا اور دور تک پیچھا کیا۔ کئی سو قیدی، چند جنگی ہاتھی اور معقول مال غنیمت ہاتھ آیا۔

بابر نے ہمایوں کی نعمتمند فوج کی خوب قدر افزائی کی تفنگچیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو زنبورے دار بندوق سے اُڑا دیں۔ ہمایوں کو خلعت فاخرہ، اسپ خاصہ اور ولایت حصار عطا کی گئی۔ خوش ہوکر لکھتا ہے کہ "یہ اس کی پہلی مہم اور پہلا معرکہ تھا۔ ہماری آیندہ کامیابی کا بہت اچھا شگون ہوا۔" رفیقوں کے اور زیادہ دل نشین کرنے کی غرض سے ہمایوں کے پہلی بار ڈاڑھی منڈانے کی رسم بھی منائی گئی۔ وہ اس وقت اٹھارہ سال کا ہوگیا تھا۔

بایں ہمہ بابر پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا سہارا چھوڑنا نہ چاہتا تھا کہ فوج کی رفتار بہت سست تھی اس امید میں کہ دہلی کا لشکر عظیم شاید بڑھ کر ناہموار زمین پر لڑنے کی جسارت کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور بابر کو گنگا کے مشہور معاون دریائے جمنا کے کنارے تک بڑھ کر دشمن کا انتظار کرنا پڑا۔ پڑاؤ سے حسب معمول وہ گرد و نواح کا جائزہ لینے روانہ ہوا:

دریا کو پایاب اُتر کے میں (موضع) سرسادہ کی سیر کو گیا۔ یہاں چشمے سے ایک نالہ نکلا ہے۔ بڑی جگہ نہیں۔ یہاں ہم نے معجون کھائی۔ نردی بیگ کو یہ جگہ پسند آئی اور اس نے تعریف کی تو میں نے کہا "سرسادہ تمھارا ہے"۔ یعنی اسی کو بخش دیا۔ میں نے ایک کھلی کشتی میں سائبان ڈلوالیا تھا کہ دریا میں سیر کے کام آئے۔ کبھی کبھی ہم بہاؤ کے رُخ نیچے (دشمن کی بیرونی چوکیوں کی جانب) تک لے گئے"

ان کلمات سے بابر کی بے پروائی ظاہر ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنی سپاہ کا میلانِ خاطر معلوم کرنے کی فکر میں تھا۔ نئی مردم شماری کی گئی تو اس کی تعداد بھی اتنی نہ نکلی جتنی توقع تھی۔ جنگ کا انتظار کرتے کرتے کچھ لوگ تھک گئے اور لشکر چھوڑ کر چل دیے تھے۔

مغل سواروں کا چھاپا

" لشکر میں بعض اشخاص متردد تھے۔ تردد اور خوف سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ خدا نے جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ نہیں ٹل سکتا۔ پھر بھی سچ پوچھیے تو اس قسم کی پریشانی یا اندیشہ مندی پر گرفت نہیں کرسکتے میرے آدمی اپنے گھروں سے دو تین مہینے کی راہ پر، زحمتِ انتظار کھینچ رہے تھے۔ ایک اجنبی قوم سے مقابلہ تھا جس کی زبان ہم نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ آپس میں کہتے تھے کہ ہمارے حریف لشکر کی تعداد ایک لاکھ اور اس میں ایک ہزار جنگی ہاتھی ہیں۔ ابراہیم کے ہاتھ میں اپنے باپ دادا کی ساری جمع جتھا تھی لیکن یہ روپیہ اس نے اپنے رفقائے جنگ میں تقسیم نہیں کیا۔ بیٹھا سکّے گنتا رہا۔ جنگ کا ساز و سامان تیار نہیں کیا۔ جیسا کہ تجربہ کار سپہ سالاروں کا دستور ہے۔ نہ وہ فیصلہ کرسکا کہ ٹھیرا رہے، ہٹ جائے یا لڑ پڑے"

یہ باتیں بڑے معرکے کے کئی ہفتے بعد تحریر کی گئی ہیں، اور دل پسند خیال آرائی سے خالی نہیں۔ ہر چند بابر حریف کی کثرت فوج کی افواہوں کو وقعت نہیں دیتا تھا، تاہم اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ مقابلتاً ابراہیم کی سوار فوج کے مقابلے میں اس کے رسالوں کا پلڑا بہت ہلکا ہے۔ حکومت دہلی نے جن جنگ جو باج گزاروں کی امدادی فوج طلب کی وہ تعداد میں نیم ویراں کابل سے چوگنے تھے۔ دو پشت سے اس خاندان کے بادشاہ فتح پر فتح پاتے رہے تھے۔ پھر یہ کہ بابر تو سندھ پار کے پہاڑوں سے اتنی دور چل کر آیا اور ابراہیم کو اپنی دہلیوں کے حصار بند مقام سے تیس میل سے زیادہ چلنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔

پچھلے ہفتے سے بابر کی فوج لشکر گاہ کی تیلی پٹّی کے گرد قصبہ پانی پت سے بائیں جانب باڑ تیار کر

کر رہی تھی اس کے کنارے کنارے سامان کے سات سو چھکڑے چرمی رسّوں سے باندھے تھے اور تھوڑی تھوڑی دُور پر چوڑے فصل چھوڑے تھے، جن میں عثمانی ترک ماہروں کی توپیں زنجیروں کے پیچھے لگائی گئی تھیں۔ بعض کھلے فصل وہ تھے جن میں چرمی جالیاں تفنگچیوں کی حفاظت کے لیے بنائی تھیں اور قطار کے بائیں سرے پر زیادہ چوڑی جگہ چھوڑ دی تھی کہ یہاں سے دو دو سواروں کا پرا جھپٹ کر دشمن پر جا گرے۔ مطلب یہ کہ بابر نے مدافعت کا پورا انتظام کیا اور جوابی حملے کے لیے جگہ نکال رکھی تھی۔ لیکن سپاہ دہلی نے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں کی اور ادھر سپاہ کابل کو دشمن کی کثیر سوار فوج کے ہوتے پہاڑی کے دامن کی طرف ہٹنے کا موقع نہ تھا۔

ایک دفعہ بابر نے اپنے معتمد علیہ اور مغل برادری کے چین تیمور سلطان کو فوج دے کر بھیجا کہ دہلی کے لشکر عظیم کے ایک پہلو پر ضرب لگائے۔ تیمور سلطان کچھ قیدی اور مال غنیمت بھی لایا، مگر دہلی والوں نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اسی طرح مغل سوار تیر اندازوں نے بڑھ بڑھ کر کئی بار انھیں تنگ کیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

یہ چالیں تو نہ چل سکیں لیکن اتفاقی اسباب نے لشکرِ دہلی کو اس بڑے حملے پر آمادہ کر دیا، جس کی بابر تدبیریں کر رہا تھا۔ بعض نئے ہندوستانی حلیفوں نے لشکر دہلی پر شبخون مارنے کا مشورہ دیا۔ انھیں امتحاناً آگے بھیجا اور عقب میں مدد کے لیے مسلح سوار تیار رکھّے گئے۔ جیسا کہ اکثر ہُوا ہے، شبخون مارنے والے راستہ بھول گئے یا لشکر دہلی کے قریب جمع نہ ہو سکے اور صبح ہوتے ہی سلطان ابراہیم کے رسالے جنگی ہاتھی لیے ہوئے مقابلے میں نکل آئے۔ باہم جھڑپ ہوئی اور پھر دن نکلنے سے پہلے حملہ آور واپس ہوئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے پیر میں تیر کا زخم آیا۔ ہمایوں حفاظت سے فوج نکال لانے پر مامور ہوا اور اس نے یہ خدمت انجام دی۔ مگر اس چُوک جانے کے باعث ابراہیم اور اس کے سرداروں کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے دن کے وقت پوری فوج سے مغلوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ "صبح کو جب اچھی طرح روشنی ہو چکی تھی، اطلاع ملی کہ دشمن صف بندی کر کے بڑھ رہا ہے۔ فوراً ہم نے زرہ پہنی، ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔"

پانی پت کے میدان میں اس روز (۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء مطابق ۸ رجب ۹۳۲) کیا ہُوا، اس کی صاف صاف کیفیت معلوم نہیں ہوئی۔ ابتدائی زمانے میں بابر اپنی فوج کی اگلی صفوں کو لڑایا کرتا تھا۔ پانی پت میں بجور (باجوڑ) کی طرح وہ سپہ سالار اعلیٰ کے مقام پر لڑنے والوں کے عقب میں رہا۔ لہٰذا اس کے

صرف احکام، تقررات، فوجوں کو ادھر سے اُدھر پھیرنے کا ذکر آتا ہے۔ تاہم اس قدر پتا چل جاتا ہے کہ دہلی کے سواروں کا دل بادل تیز تیز بڑھ کر مغل مورچہ بندی کے سامنے پہلے ٹھٹکتا اور پھر ٹوٹ کر حملہ کرتا ہے۔ ہندوستان کے امراء، رؤسا خود مطلب سلطان ابراہیم سے کیسے ہی ناراض ہوں، میدان جنگ میں انھوں نے دیوانہ وار دلیری دکھائی۔ بابر کو تھوڑی ہی دیر میں میمنہ سنبھالنے کے لیے فوج ردیف سے کام لینا پڑا۔ دوسرے حصّوں میں بھی سبک پا دستے جنھیں جوابی حملوں کے لیے لگا رکھا تھا، صفِ جنگ سلامت رکھنے کے کام میں لائے گئے۔ حتّٰی کہ محمد علی جنگ جنگ جسے تیر نے بیکار کر دیا تھا، اسے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی جمعیت میں آکر شامل ہو گیا۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ تیروں کی باڑوں نے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں کا منہ پھیر دیا۔ مغل انتہائی میسرے کی خندقوں اور جھنکاڑ کے مورچوں سے برابر چمٹے رہے۔ رومی (ترک) استاد محفوظ آڑ سے برابر توپیں بھر بھر کے آتش زنی کرتے رہے تا آنکہ رفتہ رفتہ "پلٹانے والے" دستے بازو کے سروں تک نکل آئے۔ بائیں جانب تو وہ لڑائی میں مخدوش طور پر پھنس گئے اور بابر کو آخری ردیف سوار بھیج کر ان کی مدد کرنی پڑی، لیکن دائیں طرف کے دستے وُلی قرملی اور ملک قاسم کی قیادت میں کھلی جگہ نکل آئے اور سلطان ابراہیم کے بازو پر عقب سے جھپٹ کر گرے۔ دوپہر ہوتے دوسرا بازو بھی دھکیل کر مغلوں نے وسط میں گھیر لیا اور اب یہ غیر مرتب انبوہ توپ و تفنگ کی مار اور ترکوں کی چھوٹی پُر قوت کمانوں کی تباہ کُن باڑوں کی عین زد میں آ گیا۔ سوار فوج کو آتش باری سے بچنے کی کوئی نہ سوجھی۔ غول کے غول پھٹ کر پلٹنے اور واپس دہلی کو بھاگنے لگے۔ مختصر یہ کہ مورچہ بند پیادوں نے حملہ آور سواروں کو مغلوب کر لیا۔ اور باقاعدہ فوج کی جنگی تدابیر شجاعت ذاتی پر غالب آئیں۔ بابر کی ماہرانہ سپہ سالاری نے ابراہیم کی اندھا دھند یورش کو شکست دی۔ سلطان دہلی مقتولوں کے ڈھیر میں مرا ہوا ملا۔ بابر نے حکم دیا کہ اسے عزّت حرمت سے مسنون طریق پر دفن کیا جائے اور اپنے سردار خلیفہ کو اس کام پر نگرانی کے لیے بھیجا۔ لکھتا ہے کہ "آفتاب ایک نیزہ بلند ہوا ہوگا۔ جب کہ جنگ کا پہلا تصادم ہوا۔ دوپہر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ زوالِ آفتاب کے ساتھ دشمن کو شکست فاش اور ہمارے رفیقوں کو فخر و مسرت نصیب ہوئی۔ خدائے تعالیٰ کی رحمت و کرم سے یہ دشوار کام ہمارے لیے آسان ہو گیا۔ وہ لشکرِ کثیر آدھے دن میں زمین پر منتشر غبار بن گیا۔ ابراہیم ہی کے گرد و پیش کے پانچ چھ ہزار آدمی مارے گئے۔ میرا اندازہ تھا کہ دوسرے مقتول ۱۵ تا ۱۶ ہزار ہوں گے لیکن

بعد میں آگرے آ کے ہندوستانیوں سے سنا کہ اس جنگ میں کم وبیش چالیس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔

" دشمن کو شکست ہوتے ہی سواروں کی پکڑ دھکڑ، بھاگنوں کا تعاقب شروع ہوا، امیرے آدمی ہر درجے کے امیر ورتبیں گرفتار کرکے لائے (ہندوستانی) مہاوتوں نے ہاتھیوں کے غول کے غول لاکر حوالے کیے۔ شروع میں خیال تھا کہ ابراہیم فرار ہوگیا اور اسی لیے میں نے تیزی سے اس کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ پھر سوار ہوکر اس کے لشکرگاہ، خیمہ وبارگاہ کا معائنہ کیا اور ایک تلاؤ کے کنارے اتر پڑا۔ نماز عصر کے وقت میرے چھوٹے برادر نسبتی خلیفہ کو ابراہیم کی لاش ملی اور اس کا سر کاٹ لایا۔

" اسی روز ہمایوں میرزا کو (بابر اس جنگ کے بعد سے اپنے بیٹے کی شہزادگی کو لفظ "میرزا" سے بطور خاص نمایاں کرتا ہے۔) خواجہ کلاں اور خازن دلی کے ہمراہ مختصر سامان لے کر بہ عجلت آگرے جانے کا حکم دیا کہ شہر پر قبضہ اور وہاں کے خزانوں پر پہرہ بٹھا دیں۔ دوسرے سردار مامور کیے گئے کہ سیدھے دہلی جائیں اور وہاں کے خزانوں کی نگرانی کریں۔ اگلے دن ہم خود چلے لیکن گھوڑوں کو آرام دینے کی خاطر کوس بھر چل کر جمنا کے کنارے اُتر گئے اور دو دن ٹھیر کر (دہلی میں) پہلے شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ کی (بہ تصحیح مترجم) زیارت سے مشرف ہوئے پھر شام کو قلعۂ دہلی میں داخل ہوئے اور رات وہاں بسر کی۔ دوسرے دن خواجہ قطب الدین رحمۃ کے مزار پر حاضری دی...... سلطان بہلول اور سکندر لودھی کے مقابر اور باغوں کی سیر کی۔ لشکرگاہ میں واپس آکر کشتی میں بیٹھے اور عرق پیا۔

" دہلی کا فوجدار ولی قرمی کو بنایا گیا...... خزانوں پر مُہر لگا دی گئی۔ جمعرات کو جمنا کے کنارے شہر تغلق میں [تغلق آباد۔ بابر یہاں کے ترک ناموں پر زور دیتا ہے تاکہ اس ملک کے سابقہ ہم نسل سلاطین ترک، تغلق اور غزنویوں کی یاد دلائے] جمعے کو میں لب دریا اُردو میں رہا۔ مولانا محمود اور شیخ زین دیگر ہمراہیوں کے ساتھ دہلی میں جمعہ پڑھنے گئے۔ میرے نام کا خطبہ پڑھا اور مساکین میں روپیہ تقسیم کرکے واپس آئے۔

اس ضمن میں بابر پہلی مرتبہ اپنے " بادشاہِ کابل ودہلی " کے اعلان کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ۲۷ اپریل ۱۵۲۶ء (۱۵ رجب ۹۳۲ھ) پہلا جمعہ تھا جس دن سے مغل سلاطین اعظم کے پہلے مغل بادشاہ کی حکومت کا آغاز ہوا اگرچہ خود بابر اپنے آپ کو مغل کہلوانا سخت ناپسند کرتا تھا۔

قلندر بابر کی شہرت بادشاہی

پانی پت کی ناگہانی مصیبتِ کبریٰ شمالی ہند پر بجلی بن کر گری۔ ابراہیم کا جسم زیرِ زمین نابود ہوا، فوج کا تار و پود ایسا بکھرا کہ پھر کبھی نہ جڑا۔ سلاطین لودھی کے اور کسی وارث کو ہمّت نہ ہوئی کہ افغانی پہاڑوں سے آنے والے فاتح کے خلاف میدان میں نکلے۔ لوگ اس مقامِ جنگ تک سے بچ کر نکلتے تھے۔ رات کے وقت رہگیروں کا بیان تھا کہ اندھیرے میں روحوں کی انھوں نے نالہ و زاری سنی۔

بابر ایسے توہّمات کو کیا گردانتا تھا۔ صدر مقامات پر اس کا فوری قبضہ کرا لینا، کہ جنگ کی خبریں بھی لوگوں کو نہ پہنچی تھیں، شاہی محلّات، خزائن ذخیرہ پر ایک دم پہرے بٹھا دینا، عام باشندوں کو مرعوب کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لڑائی میں اس کی فوج کے نقصانات اتنے کم ہوئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لہٰذا علاقے میں پھیل کر وہ پوری طرح مسلط ہو گئی۔ انھیں غارت گری یا دشمن کے اہل و عیال کو ستانے سے روک دیا گیا تھا اور اس طرزِ عمل نے عوام پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ اسی طرح بڑے (کوہِ نور) ہیرے کا قصّہ لوگوں میں زبان زد ہو گیا۔ وہ یہ کہ ہمایوں اپنا دستہ لے کر آگرے پہنچا تو شہر کے حکام نے باضابطہ اطاعت قبول کی البتہ درخواست کی کہ قلعے کے ان مقامات میں داخل نہ ہو جہاں بادشاہ کے ذاتی اسباب کے کارخانے اور یرغمال میں آئے ہوئے لوگ رہتے تھے۔ ہمایوں کو بھی شہر میں جبر و قوّت سے کام لینا پسند نہ تھا لہٰذا اپنے سپاہی قلعے کے باہر رہنے دیے اور دروازوں پر باپ کے آنے تک پہرہ لگا دیا۔ یرغمال کے لوگوں میں گوالیار کے راجہ کے بیوی بچے بھی تھے۔ یہ دولت مند راجہ پانی پت میں مارا گیا اور اس کے اہل و عیال نے قلعے سے نکل کر اپنے وطن جانے کی کوشش کی، ہمایوں کے پہرہ داروں نے انھیں حراست میں لے لیا مگر مال و اسباب پر دست درازی نہیں کی۔ عالی خاندان ہندو عورتوں نے غالباً شہزادے کو خوش کرنے کی غرض سے حسبِ دستور نذرانے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ بہت سے بیش قیمت جواہرات نذر کیے۔ انھی میں کوہِ نور ہیرا تھا۔ یہ گلابی رنگ کا بھاری ہیرا ہمایوں کے ۳۲۰ رتی (۸ مثقال) تُلا [بہت سے گرم و سرد دیکھنے اور تراش خراش کے بعد جب یہ ہیرا ملکہ وکٹوریہ کے قبضے میں آیا تو اس وقت بھی ۱۸۶ قیراط اس کا وزن تھا] بابر قلعے کے باہر آگرے کی لشکرگاہ میں آیا تو ہمایوں نے باضابطہ پیشوائی کی اور وہ ہیرا بھی جسے عاید کرا لیا تھا، پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کی سرگذشت سنی۔ عملی آدمی کی طرح شوق سے اُسے آنکا۔

لکھتا ہے کہ اس کلاں الماس کی قیمت اکثر جوہر شناس ساری دنیا کی ڈھائی دن کی خوراک کے برابر بتاتے ہیں۔ وزن میں آٹھ مثقال معلوم ہوا۔ ہمایوں نے مجھے گزرانا تھا۔ میں نے وہیں اسی کو دے دیا۔" بابر نے قیدیوں اور پیر غمایوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ قریب قریب سب کو نہ صرف معاف کیا بلکہ وطن میں یا اور کہیں زمینداری دے کر رخصت کیا۔" ابراہیم کی ماں کو سات لاکھ مالگزاری کا پرگنہ عطا کیا اور آگرے سے دو میل پر مکان دیا کہ قلعہ سے نکل کر وہ اپنے نوکروں سمیت وہاں جا رہے۔

جمعرات کے دن عصر کے وقت ہم آگرے میں داخل اور ابراہیم کے محل میں اُترا۔"

قریب دو ہفتے اس لیے اپنے آپ کو خلوت ہی میں رکھا۔ دہلی کی مسجد جامع میں دو سربرآوردہ علماً نے جمعے کے خطبے میں اس کا نام پڑھا اور ہمایوں نئی حکومت کے سپہ سالار کی حیثیت سے نمایاں رہا جب کہ باپ گھوڑوں کو ستانے یا جمنا میں کشتی رانی کرنے ہی میں مصروف رہا۔ جس وقت بیٹے نے دنیا کا کلاں ترین ہیرا جس کی قیمت بے حساب تھی، نذر گزرانا تو اسے بھی کمال استغنا سے اسی کو دے دیا۔ یہ محض مفرط سخاوت نہ تھی بلکہ دراصل وہ اپنے مُوجی بیٹے کی اپنے ساتھ دلی وابستگی کا طالب تھا۔ پانی پت کے بڑے میدان کارزار میں ہمایوں خوب لڑا۔ بابر اہلِ عسکر کی نظر میں اس کی توقیر بڑھانی چاہتا تھا۔

بابر کے ان سوانح حیات سے اب اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے طرز فکر و عمل کا پتا چلانا سہل نہ تھا۔ اس میں عام آرا اور قرائن کے خلاف چلنے کی ایک عجیب ذہانت پائی جاتی ہے۔ بالفعل وہ خاص طور پر اپنی سپاہ کو اس کی کارگزاری کا صلہ دینے پر متوجہ تھا۔ وہ اسے بڑے خطرناک حملے کے لیے اتنی دور لایا اور کھلے میدان میں کہیں زیادہ سوار فوج سے اسے لڑایا جو اصولِ حرب کے اعتبار سے مہلک اقدام تھا۔ ان جاں بازیوں کا انعام دیا جانا ضروری تھا چنانچہ سلطان ابراہیم کے محل میں قیام کے بعد ہی مقفل خزانوں کا بڑا حصّہ فوج والوں کو دے دیا گیا۔ یہ مغل جاگیرداری ہندوستان کی روایات کی مخالفت تھی کیونکہ یہاں رانا، راجا، بادشاہ بلکہ معمولی جاگیردار تک روپے پیسے کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے۔ بابر نے ستر لاکھ (جو غالباً تین لاکھ ڈالر امریکی کے معادل مگر قوتِ خرید میں بڑھے ہوئے تھے) شہزادہ ہمایوں کو دیے اور اس کی جمعیت نے جو کچھ لوٹا تھا، وہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ بڑے بڑے سپہ سالاروں کو دس لاکھ (چاندی کے سکّے) فی کس دیے اور بے حساب ساز و سامان، ہتیار، گھوڑے عطا کیے۔ ہر امیر وزیر کو ٹھیک ٹھیک تناسب سے انعام ملا۔ بندوقچی، شمشیرزن، سائیس، باورچی، گاڑی بان بہیر و بنگاہ

کے مزدور خیمہ نصب کرنے والے تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی مٹھیاں غیر متوقع سکّوں سے نہ بھر گئی ہوں۔ بابر کی بخشش کا رنگ یہی تھا۔ وَلی خزانچی پر جو کچھ گزری ہو اس کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ پھر یہ تقسیم زر، اراضی اور مواشی کی تقسیم کے علاوہ تھی جس نے سردار و سپاہی سب کو خوش حال کر دیا۔ اسی داد و دہش کی بنا پر دہلی سے یہ افواہ ملک بھر میں منتشر ہوئی کہ نئے بادشاہ نے سارا خزانہ جو ہاتھ آیا تھا، لُٹا دیا اور اپنے لیے قلندری حصّے کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ اسی افواہ نے مغلوں کی بنائی ہوئی پہلی مساجد میں سے ایک مسجد کے کتبے میں جگہ پائی جس میں یہ الفاظ کندہ تھے کہ "قلندر بابر دنیا بھر میں بادشاہ مشہور ہے۔"

خود بابر نے ایک شعر میں اس خیال کو ادا کیا ہے کہ "ہر چند میں درویش برادری میں شامل نہیں۔ لباس شاہی میں بھی میرا دل ان کے ساتھ ہے۔"

اس کی بے نظیر فیاضی کا وہ اثر ہوا جس کی خود اسے امید نہ تھی۔

پہرہ دار (عسس) کی ایک اشرفی

شہزادی گلبدن بیگم نے اس جشنِ مسرت کی کیفیت لکھی ہے، جو کابل میں فتح کی مفصّل خبریں اور تحائف و ہدایا کے آنے پر منایا گیا۔ یہ خدمت کسی معمولی آدمی کے نہیں، بڑے وزیر خواجہ کلاں کے سپرد ہوئی تھی [اگرچہ یہ واقعات گلبدن بیگم نے بڑی عمر میں، اکبر بادشاہ کے عہد میں قلم بند کیے، لیکن اسے بچپن میں اس جشن کی تقریبات اور محل سرا کی باتیں یاد ہوں گی]

"پانچ بادشاہوں کی جمع جتھا اس (بابر) کے ہاتھ آئی تھی، سب اس نے بانٹ دی۔ ہندوستان کے امیروں کو اتنی کثیر دولت لٹا دینا بہت شاق گزرا .... خواجہ کلاں نے کہا، حضرت پادشاہ نے میرے ہاتھ یہ تحائف اپنی خالاؤں، بہنوں اور حرم کی جملہ مستورات کے لیے ارسال فرمائے ہیں۔ خود فہرست بنا کر دی ہے اور ہدایت کی ہے کہ دربار کے باغ میں ہر بیگم کا شامیانہ اور قناتیں لگا کے نام بہ نام تحفے تقسیم کیے جائیں اور پھر سب مل کر اس فتح بزرگ پر خدا کا شکرانہ بجا لائیں ......"

ہر بیگم کو ابراہیم کی ناچ گانا جاننے والی کنیزوں میں سے ایک کنیز، یاقوت و جواہر اور موتیوں کی بھری ہوئی کشتی، سکّوں اور صدف سے بھرے ہوئے دو خوان، نو پارچے کے قیمتی خلعت دیے جائیں گے۔ بہنوں اور بچّوں کو، دُوسرے عزیز و اقارب بھائی اور ان کی بیویوں کو، دَدا، مغلانیوں کو — سب کو جو اس

شکرانے کی تقریب میں شامل ہوں، زرِ نقد اور خلعت الگ دیے جائیں گے۔

"چنانچہ ہم سب حضوری باغ میں خوشی خوشی تین دن رہے۔ فہرست کے مطابق تحفے تقسیم ہوئے ہر کوئی نازاں تھا اور شکر کے سجدے کر کے حضرت پادشاہ کے عمر و اقبال کی دعائیں مانگتا تھا۔ چوکیدار عسس کے واسطے بھی بادشاہ نے خواجہ کلاں کے ہاتھ ایک بڑی اشرفی بھیجی تھی۔ (غالباً یہ چوکیدار بابر کے باپ عمر شیخ میرزا کے محل کا آدمی تھا اور اس کا خاص خیال کیا جاتا تھا) اس کا وزن تین سیر شاہی تھا لیکن خواجہ سے بادشاہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر عسس پوچھے میرے لیے کیا تحفہ بھیجا ہے تو کہہ دینا بس ایک اشرفی۔ جیسے وہ معمولی اشرفی ہو۔ چنانچہ خواجہ کلاں نے ایسا ہی کہہ دیا۔ عسس بہت بگڑا اور تین دن تک بکتا جھکتا پھرا۔ پھر بادشاہ کے حکم سے اس اشرفی میں چھید کر کے ڈوری باندھی اور عسس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گلے میں لٹکائی گئی اور محل سرا میں پھرایا گیا۔ اب جو اس نے ٹٹولا اور اتنا وزن دیکھا تو خوشی سے بے حال ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا دیکھو کوئی میری اشرفی کو ہاتھ نہ لگائے۔ بیگمات نے الگ اسے چاندی سونے کے سکے دیے اور یہ بھی ستر اسی ہو گئے تھے۔"

بابر کی فیاضی اپنے خاندان یا کابل تک محدود نہ تھی۔ قندز و غزنین تک تحائف کے انبار گئے اور دور دست بدخشاں کے کاشتکاروں اور ان کے بیوی بچوں نے چاندی کے سکے پائے۔ سمرقند میں یہاں کے مہاجرین کو حصہ گیا اور حج کرنے والے اس کے تحائف مکہ معظمہ لے کر گئے۔ ساتھ ہی اعلان ہوا کہ "امیر تیمور یا چنگیز خاں کی نسل کے ہر شخص کو دعوت ہے کہ ہمارے دربار میں آئے اور حسبِ ہمت، و قدر منت فائدہ اٹھائے" بالفاظ دیگر سالہا سال کی آوارہ گردی کے بعد شیر کو لائق سکونت سرزمین مل گئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی نسل و نژاد کے جتنے افراد سلامت ہوں۔ انھیں بلا کر پوری قوم کا مرکز بنائے۔ یہ رائے کسی وقتی ترنگ میں آ کر نہیں قائم کی گئی تھی۔ بلکہ جب سے ہندوستان میں آیا یہاں کی سرزمین، پانی، سبزیاں، چرند، پرند، ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتا رہا اور سفر یا لشکر گاہ میں برابر اس مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔ لوگ جو کچھ آ کر کہتے وہ عموماً اسے خود دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاتھیوں کی خوراک کو غور سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ ایک ہاتھی کٹی ہوئی پولیاں دس اونٹوں کے برابر کھا لیتا ہے۔ گہرے بہتے دریا کو اس طرح پار بھی کر سکتا ہے کہ اوپر کی لدی چیز کو پانی ذرا نہ چھوئے۔ تین چار مل کر اتنی بڑی توپ کے چھکڑے کو کھینچ سکتے ہیں جسے چڑھانے میں چار سو آدمی درکار ہوں۔ ہاتھی سدھانے کے طریقے دیکھے اور رائے قائم کی کہ "بہت عقل مند جانور ہے۔ عادت کی بات سمجھتا

ہے اور اس کا حکم ماننا ہے۔"

چرس رسّے سے پانی کھینچنے کا ہندوؤں کا طریقہ بابر کو پسند نہیں آیا کہ بیل کی واپسی میں رسا کیچڑ پانی، گوبر میں گھسٹتا آتا ہے اور وہی چرس کے ساتھ کوئیں میں ڈالا جاتا ہے۔

نیل گاؤ سمیت پانچ قسم کے ہرنوں کی کیفیت لکھی ہے۔ موش نما جانور یعنی گلہری کو پھرتی سے درختوں پر چڑھنے اُترنے دیکھ کر اسے بہت لطف آیا۔ دوسری ولایات کے اکثر جانوروں سے واقف تھا، لہٰذا لوگوں کے جھوٹے سچّے قصّے سُن کر یقین نہ کرتا تھا۔ مثلاً گینڈے کی طاقت کی روایتیں۔ اس مہیب صورت یکشاخہ جانور کو یورپ کے سیّاحوں نے شروع میں دیکھا تو بہت ڈرے اور طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ بابر نے انھیں تو باور نہیں کیا، البتّہ تسلیم کرتا ہے کہ گینڈا گھوڑے کو سوار سمیت اپنے سینگ پر اُٹھا کر اچھال سکتا ہے جس کا خود تماشا دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ سوار جو اس طرح اُچھالا گیا "کرگدن زدہ" کہلانے لگا تھا۔ ہندوستان کے طرح طرح کے طوطے دیکھے اور ان میں چمکتے رنگوں، سیاہ گردن اور چونچ والے کو بہت پسند کیا جو ایسی باتیں کرتا ہے کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا وہ صرف آوازوں کی نقل کرنی سیکھ جاتا ہے یا سمجھ کر بھی بات کر سکتا ہے؟ ایک ملازم نے کہا کہ سیاہ چونچ کا طوطا پنجرے میں تھا۔ اس پر سِنی چڑھائی گئی تو وہ پکارنے لگا "میرا چہرہ کھولو، مجھے سانس لینے دو۔" بابر لکھتا ہے "راست و دروغ برگردن راوی مگر جب تک خود نہ دیکھے ایسی بات کا یقین کرنا مشکل ہے۔"

بہت سے گانے والے نیز مردار خوار پرندے دیکھے۔ مور کا گوشت امتحاناً کھایا۔ بہت سی مچھلیاں کھائیں ایک دفعہ مچھیروں کو دیکھا کہ جال کو پانی سے کوئی ایک ہاتھ اونچا لیے کھڑے ہیں، مچھلیاں اُڑ اُڑ کر پھنس جاتی ہیں صرف ایک مچھلی تھی جو گز بھر اوپر سے اُچھل کر صاف پار گئی۔ ہندوستان کے پھل کچھ بہت مزے دار نہ نکلے سب میں بہتر آم تھا جس کی خربوزے کی طرح تعریف کی جاتی تھی۔ بابر کے نزدیک یہ پال کے ہی اچھے ہوتے تھے لکھتا ہے "عمدہ قسم کا آم واقعی بہت اچھا ہوتا ہے لیکن ایسی اچھی قسمیں ہر جگہ بہت کم پائی گئیں۔"

اوّل اوّل وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ہندو اپنی ذاتی یا طبقے کے نام سے منسوب ہوتے ہیں اور قبائل یا خاندان سے موسوم نہیں ہوتے۔ لکھتا ہے "ہندوستان کے اکثر باشندے بُت پرست ہیں۔ بُت پرست کو "ہندو" کہا جاتا ہے۔ بہت سے ہندو تناسخ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کاریگر، مزدور، سرکاری کارندے سب ہندو ہیں۔ ہمارے ملک میں صحرائی لوگ قبائلی نام رکھتے ہیں۔ مگر یہاں شہروں اور کھیتوں میں کام

کرنے والے بھی الگ الگ تو میں بن گئی ہیں۔"

آگرے میں داخل ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے جب بابر نے ہندوستان میں توطن اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ اور اسے ان کرابل لشکر میں بڑی ناگواری پھیلی۔ اور تو اور سب سے ممتاز مشیر خواجہ کلاں بھیا اُسے چھوڑ بھاگا۔ بابر لکھتا ہے "سب سے بڑھ کر ہندوستان چھوڑنے پر خواجہ کلاں تلا ہوا تھا۔ آخر اسے تحفے اور سوغاتیں بانٹنے اور کابل کا انتظام کرنے کے نام سے بھیج دیا گیا۔" پھر بھی لوگوں میں بددلی دیکھی تو..... "

(باضافۂ مترجم) انھیں سمجھا بجھا کر رضا مند کیا۔ ہندوستان میں دارالسلطنت دہلی کا قطب مینار بنچی چھت کے دالانوں کے درمیان ایک نا عمارت تھی۔ سارے میدان میں مقبروں کے گنبد جن کے گرد ول پر نازک ستونوں کی برجیاں بنی ہوئی تھی، غوری اور (بہ تصحیح مترجم) بعد کے ترک سلاطین کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔ سلطان محمود اعظم کی طرح یہ بادشاہ بھی اعلیٰ درجے کے بنا گر رہے ہیں اگرچہ بابر کی رائے میں انھوں نے ہندو کاریگروں سے جلدی میں تعمیر کرائی اور کاریگروں نے عرق ریزی سے کام نہیں کیا۔ چنانچہ ترک روایت کی مستحکم دیواروں اور کاشی کی روکاروں کے اندر مقامی کاریگروں کا بھونڈا پن جھلکتا ہے۔ شان و شوکت دکھانے کا شوق بھی زوال کے عناصر سے خالی نہیں —— بڑی بڑی آبادیاں اکثر ایک برس میں، پانی کے لیے صرف ایک ندی کے سہارے بس گئیں اور کسی وبا یا خوف و خطر کے باعث لوگ انھیں تپتے میدان کی گرمی اور موسلا دھار بارشوں کے حوالے کر کے ویران چھوڑ گئے۔ کسی افسردگی کی ساعت میں بابر لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں لطف کی چیزیں کم ہیں۔ لوگوں کی صورتیں اچھی نہیں، نہ ملنسار ہیں نہ آپس میں میل جول کے طریقوں سے آگاہ ہیں۔ مزاج شناسی، ذہن و ذکا سے عاری، آداب مجلسی سے ناواقف ہیں۔ دستکاری میں جدت نہیں نہ سوچ بچار سے کام کرتے ہیں۔ عمارت میں نقشے اور ہیات کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ ملک میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھے کتے نہیں۔ انگور، خربوزے بلکہ اعلیٰ درجے کے پھلوں میں کوئی پھل بھی اچھا نہیں ہوتا۔ ٹھنڈا پانی برف اور بازاروں میں اچھی قسم کا گوشت یا روٹی نہیں ملتی۔ حمام، مدارس حتیٰ کہ شمع اور شمع دان نہیں ہوتے موم بتی کی بجائے میلا چیکٹ چراغ دان (ڈیوٹ) ہوتا ہے اس میں ایک ہاتھ سے بتی اُکساتے اور دوسرے سے تونبی میں سے تیل ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ کام جن لوگوں کے سپرد ہے، آپ روشنی منگائیں تو وہی دوڑے ہوئے آئیں گے اور ڈیوٹ جلا کر آس پاس کھڑے ہو جائیں گے۔ ملک میں دریا موجود ہیں مگر نہریں نہیں کاٹی گئیں۔ نہ باغوں یا گھروں میں پانی لایا گیا۔ ان کے گھر نہ خوش قطع ہیں، نہ ہوادار۔ کوئی دلکشی نہیں رکھتے۔

کسان اور ادنیٰ طبقے کے لوگ ناف سے نیچے دو بالشت کی لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں عورتیں ایک ساڑھی آدھی نصف کمر سے لپیٹتی ہیں آدھی سر پر ڈال لیتی ہیں۔" ان کے مقابلے میں ہندوستان کی خوبیوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔

"یہیں خوبیاں، تو یہ ایک وسیع ملک ہے، سونا، چاندی افراط سے ہوتے ہیں مینہ برستا ہے تو ہوا بہت اچھی چلنے لگتی ہے۔ مگر برسات کی سیل تیر کمان، کتاب، کپڑا بلکہ مکانوں تک کا ناس مارتی ہے ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر طرح کے کاریگر کثرت سے ہیں۔ ہر پیشے یا حرفت کی برادریاں متعین ہیں، ان میں باپ دادا کے وقت سے وہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔"

بادشاہ اپنی نئی قلمرو سے اتنا بد دل تھا، تو اس کی فوج اور بھی مایوس ہو گئی تھی فوج کی جان وہ لوگ تھے جو سرد کوہستانی ملک میں پلے اور اب اپنے وطن کی ٹھنڈی ہواؤں کی یاد انھیں ستا رہی تھی وطن سے نکلے ایک سال ہونے کو آیا اور زیادہ وقت جنگ و جدال ہی میں مصروف رہے۔ اب انعام بھی زرِ نقد اور اجناس کی صورت میں ملا تو مغل، ترک، افغان سبھی کی قدیم روایت، نیز فطری خواہش تھی کہ کوئی ناشدنی پیش آنے سے قبل اپنی ان غنیمتوں کو حفاظت سے گھر لے جائیں۔ سندھ پار ہندوستان پر پہلی تاختوں کا مقررہ ضابطہ یہی رہا تھا، فوج والوں کے نزدیک اس میں ردّ و بدل کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

بابر لکھتا ہے کہ "ہم آگرے آئے تو گرمی کا موسم تھا۔ دیہات کے لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔ ہمیں غلّہ اور گھوڑوں کو چارہ نہ ملتا تھا۔ دیہاتیوں نے رہزنی اور چوری کا طریقہ ہماری دشمنی سے اختیار کیا۔ آمد و رفت بند ہو گئی مجھے انعام و اکرام بانٹنے میں بہت دن فرصت نہیں ملی کہ اضلاع اور تھانوں کے لیے معقول جمعیت مقرر کرتا۔ دوسرے اس سال گرمی کی بڑی شدت ہوئی۔ ہمارے آدمی لو لگ کے بیمار ہونے اور مرنے لگے جیسے بادسموم سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ان وجوہ سے اکثر آزمودہ کار سردار اور بیگ ہندوستان میں رہنے سے بد دل بلکہ واپس جانے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔ پرانے اور سن رسیدہ بیگوں کی ایسی شکایت راستی سے کرنے میں مضائقہ نہ تھا۔ بندہ (بابر) ان کے دلی خیالات اور دوسروں کے نافرمانی کے طرزِ عمل میں فرق کر سکتا تھا۔ مگر اس بندے نے پورے مسئلے کو دیکھا، سمجھا اور پھر رائے قائم کی تھی۔ اہل لشکر اور ان میں بھی ادنیٰ ادنیٰ نفروں سے بے سوچے سمجھے رائے زنی کرنا کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ پھر طرفہ تر یہ کہ ان میں بعض وہ لوگ تھے جنھیں معمولی درجے سے ترقی

دے کر ہندوستان ہی میں امارت اور بیگی ملی ہے ۔ یہ اعزاز میں نے اس لیے تو انھیں نہیں دیا تھا کہ میرے ارادے کے خلاف تقریریں کریں۔"

جب لوگوں میں بد دلی کی خبر سنی تو میں نے سب سرداروں کو شوریٰ میں بلایا ۔ میں نے ان سے کہا کہ دنیا میں کوئی اقتدار و سیادت لغیر بیش وری وسائل کے قائم نہیں رہ سکتے نہ کسی بادشاہ کی حکومت، ملک رعایا کے بغیر ہوا کرتی ہے ۔ کئی سال کی محنت مشقت، طولانی سفر کی صعوبتیں، مرنے مارے جانے کے خطرات یہ سب برداشت کرکے ہم نے خدا کی رحمت سے دشمن کے انبوہ عظیم کو زیر کیا اور اس کی وسیع ولایات حاصل کیں ۔ اب وہ کونسی طاقت ہمیں مجبور کرتی ہے اور کونسی ضرورت پیدا ہوئی ہے کہ اتنے جوکھوں سے لیا ہوا ملک چھوڑدیں اور تنگ دستی کی بلا میں واپس کابل چلے جائیں ؟ کوئی شخص جو مجھے عزیز رکھتا ہے آیندہ اس کے منہ سے میں ایسی باتیں نہ سنوں ۔ لیکن جسے ٹھیرنے کی تاب نہیں وہ شوق سے واپس چلا جائے ۔

" ان کلمات سے میں نے ان کے پراگندہ خیالات دوبارہ درست کیے اور خوش ہوئے ہوں یا ناخوش دلوں سے اندیشے دور کیے۔"

بایں ہمہ نائب اوّل خواجہ کلاں اپنے خیال پر جما رہا ۔ وہ کہتا تھا کہ میری صحت گرتی جاتی ہے چنانچہ نہایت ناخواستہ دل سے بابر نے آخر اسے کابل واپس جانے کی اجازت دی مگر جب سنا کہ خواجہ (یہ تصحیح مترجم) دہلی سے چلتے وقت دیوار پر یہ شعر گھسیٹ گیا ہے کہ ؎

اگر بخیر و سلامت گزر سندھ شود
سیاہ روئے شوم گر ہوائے ہند شود

تو بہت جھلایا ۔ ساتھ چھوڑ کر جانے کی کدورت کم نہ تھی کہ یہ شعر اس پر مستزاد ہوا ۔ جواب میں ایک شعر مکمل خواجہ کو کابل بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ " بابر خدا کا شکر کر کہ ہند و سندھ کی بادشاہی اس نے عطا کی ۔ خواجہ، تیری ہمت گرمی کی تاب نہیں لاتی تو جا، غزنیں کے جاڑے کھا " مگر یہ کدورت جلد ہی رفع ہوگئی ۔ دو سال بعد خواجہ کو ہندوستان کے حالات کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ مجھ جیسا آدمی زمین کابل کے مزے کس طرح دل سے بھلا سکتا ہے ؟ وہاں کے لطیف انگور اور خربوزے کیونکر یاد نہ آئیں گے ۔ چند روز ہوئے میں لوگ خربوزے لائے ۔ اسے میں نے تراشا تو معاً وطن کی بیقراری اور غریب الوطنی کا تلخ تازہ ہوگیا

اور میں آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔"

اسی حب وطن کی بدولت "مرد کابل کا قلعہ، بعید برف پوش پہاڑوں کے زیر سایہ مرغزار کچنال کے سُرخ سُرخ پھولوں کا کھلنا خاص طور پر یاد آتا اور دل کو بے چین کر دیتا تھا۔ اکثر سرکاری خطوں میں قلعے اور شہر کی پیاری جامع مسجد کی مرمت کی ہدایتیں لکھی ہیں۔۔ کسی منیب دالاں کی نگہداشت کبھی باغوں کی درستی خوش بودار پھولوں کے درخت اور پودے لگانے کی تاکید کی ہے۔ ادھر ہندوستان میں بھی اپنے تیز گشت و سفر کے لیے میں جا بجا سایہ دار باغ نصب کرنے آب پاشی کے وسائل مہیا کرنے کے احکام دیتا رہتا تھا۔ بڑے دریاؤں کے پیٹے میں اس قدر کثیر پانی کی مقدار کا ضائع ہونا جو کبھی کبھی خشک میدانوں میں پھوٹ پڑتا یا سخت بارشوں کے بعد گندے پانی کی طغیانی بن جاتا، بابر کو ہمیشہ اس کا قلق رہا۔ لکھتا ہے کہ:

"میرا جہاں زرا زیادہ قیام ہوا ہیں نے رہٹ لگا کے نالیاں بنوانے کا انتظام کیا اور ان کے کنارے تفرح گاہیں تیار کرائیں۔ آگرے آنے کے تھوڑے دن بعد جمنا کے پار جا کے باغ کے لیے مناسب زمین دیکھی مگر ساری نواح بدنما تھی کہ بیزار ہو کر واپس آگیا اور دریا کے کناروں کی زشت ہیات کے باعث یہاں "چار باغ" بنانے کا خیال چھوڑ دیا۔ پھر بھی چونکہ آگرے کے پاس اور کوئی جگہ ایسی بھی موجود نہ تھی، ہار کر اسی مقام سے کام لینا پڑا۔ پہلے اس قطعے پر کام شروع ہوا جہاں ہشت پہلو حوض کے قریب املی کے درخت تھے۔ بڑا سا کنواں بنا کے زمین میں گلا یا گیا کہ اس سے حماموں میں پانی لے سکیں۔ پھر حوض کو گھیر کر قریب ہی بارہ دری بنوائی جس کے محاذ میں سُرخ و سفید پتھر کی حویلی کے اندرونی کمروں کے باہر گلاب اور نرگس کے پھولوں کی قطاریں لگا کر چمن بندی کی گئی۔ حمام کے حجروں میں سفید اور فرش میں سُرخ پتھر بیانہ کا لگایا گیا۔ اس طرح ہندوؤں کے دستور کے مطابق ہم نے بھی بغیر اہتمام کے باغ اور عمارتیں بنوائیں۔ لیکن ان میں ایک وضع داری پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کی تین چیزیں ہمیں بہت پریشان کرتی ہیں "گرمی، آندھی، گرد"۔ نئے حماموں نے تینوں آفتوں سے نجات دلا دی۔ خلیفہ وغیرہ کئی اور سرداروں نے بھی لب دریا قطعات ڈھونڈ کر باغ اور حوض بنوائے اور لاہور کی وضع کے رہٹ پانی کھینچنے کے لیے لگائے۔ ہندوستان کے لوگوں نے اس قطع کے باقاعدہ باغ ... نہ دیکھے تھے، انھوں نے جمنا کے اس کنارے کو جہاں یہ باغ وغیرہ بنے "کابل" کے نام سے موسوم کر دیا۔"

سردار اعلیٰ کے عزم مصمم میں ضرور ایسی تاثیر تھی کہ اس کے ساتھیوں نے نئی سرزمین میں جس سے

متنفر تھے، اپنے وطن کی معروف چیزوں کی نقل یہاں تیار کرائی۔ اس طرح بابر نے باوجودیکہ بار بار سکی بیماری اور مسکرات کے زہر سے کمزور ہوتا جاتا تھا اور سب سے بڑا وزیر و ندیم (خواجہ کلاں) اسے چھوڑ گیا تھا، نیز اہل عسکر نہایت بددل ہو رہے تھے، اپنے آپ کو اور تمام ساتھیوں کو ہندوستان کے میدانی ملک میں سنبھالے رکھا تا آنکہ مہینے، دوسرا سال بن گئے۔ اس کا اپنے سرداروں سے یہ کہنا کہ کوئی طاقت ہندوستان چھوڑنے پر ہمیں مجبور نہیں کرتی، دانستہ بے انصافی کی بات تھی۔ اپنے اہل و عیال اور مانوس طریق زندگی سے دُوری واضح طاقت تھی جو انھیں اپنے مغربی پہاڑوں کی طرف کھینچتی تھی۔ ان کی بدوی جبلت ابھی تک قوی تھی۔ صرف بابر کی مرضی کا خیال تھا جس نے انھیں روک رکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ ان میں ایسے لوگ کم تھے جو علانیہ بادشاہ سے بے وفائی کرتے۔ مگر اگلے سال خود شہزادہ ہمایوں آمادہ ہوا تھا کہ باپ کا ساتھ چھوڑ جائے۔

گوالیار کا ہتیا پول، ہاتھی دروازہ

جملہ مصروفیتوں کے باوجود بابر تاریخ کی ورق گردانی کرنے کا وقت نکال لیتا تھا۔ اس کتب بینی کا یہی عجیب فائدہ اس نے یہ اٹھایا کہ اپنے رفیقوں کو بڑے بڑے بادشاہوں کے جنھوں نے ممالک مغرب سے شمالی ہندوستان پر حملے کیے، قصے سنائے۔ اس نے بتایا کہ سلطان محمود غزنوی اور امیر تیمور خراسان، سمرقند کے علاوہ بڑی بڑی ولایات کے مالک تھے اور ہمارے پاس غزنیں کابل قندز کی پٹی کے سوا کچھ نہیں دھرا ہے۔ اور یہ علاقہ بھی اتنے محدود وسائل معاش رکھتا ہے کہ ہمیں اس کی پرورش کے لیے ہندوستان سے رسد بھیجنی پڑتی ہے۔ اب اگر ہندوستان سے ہم دست بردار ہو جائیں، تو خود ہمارے وطن پر کیا گزرے گی اور اگر وہ کام کریں جو محمود اور تیمور نے نہیں کیا، یعنی ہندوستان کو اپنا گھر بنالیں تو کیا کچھ کارنامے انجام نہ دے سکیں گے۔

اس نے دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا کہ اتنی کثیر تعداد کے مقابلے میں ہماری کمزور و قلیل جمعیت کو یہ کامیابیاں مشیت الٰہی کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ تقدیر کی ایسی کھلی نشانیاں اور خدا کا منشا دیکھ کر بھی آنکھیں بند کرنا اور واپس پلٹ جانا کس طرح جائز ہوگا؟ اور یہ خالی حجت نہ تھی۔ واقعی بابر اس کی صداقت پر یقین رکھتا تھا۔ سلاطین دہلی کے پُرشکوہ مقبروں کی سیر کرتے وقت یقیناً وہ مرعوب ہوا ہوگا اور اسے انھی کے باغ میں اپنے باپ عمر شیخ میرزا کی قبر کا پُرانا ڈھیر یاد آیا ہوگا۔

۱۵۲۶ء کے اواخر میں جھاوٹیں برسیں تو اس وقت بھی جنگی صورتِ حال کچھ قابلِ اطمینان نہ تھی۔ دریائے سندھ سے جنوب مشرق میں، پانچ سو میل فوج آگے بڑھ آئی تھی لیکن سچ پوچھیئے تو ملک مقبوضہ صرف اسی قدر تھا جہاں ان کی چھاؤنیاں بنی تھیں یعنی ایک تنگ سا راستہ، اگلباری جو درۂ خیبر سے بھیرا، لاہور، سرہند، پانی پت، دہلی، آگرہ، بارہ تک آتی تھی۔ فی الواقع بابر نے اپنی فتح "بھیرا سے بارہ تک" ہی بتائی ہے۔ اس موسم بہار کے آنے تک مغلوں کی پیش قدمی بالائی گنگا کے شہر قنوج تک ہی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے باغ، عمارات کا سلسلہ، نیز وصول مال گزاری کا حلقہ آگرے سے ایک منزل آگے نہیں گیا تھا۔ مفتوحہ پٹی میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے آگے ہندوستان کے وسیع خطوں سے غراہٹ کی آوازیں آرہی یا مہال کی بگڑی ہوئی مکھیوں کی بھن بھناہٹ، جن کے چھتّے کو توڑا گیا مگر انھیں قابو میں نہیں لایا گیا ہو۔

بابر ان خطرات سے بے خبر نہ تھا۔ لکھتا ہے کہ "ہمارے آگرے کے داخلے کے وقت یہاں کے لوگوں میں اور میرے آدمیوں میں باہم نہایت نفرت اور عداوت تھی۔ کسان اور سپاہی میرے آدمیوں کو دیکھ کر ہی دور بھاگتے تھے۔ دہلی اور آگرے کے سوا باقی قلعہ بند شہروں نے اپنے مورچے مضبوط کیے اور انھیں حوالہ نہیں کیا نہ اطاعت قبول کی۔ قاسم سنبھلی نے سنبھل اور نظام خاں نے بیانہ میں یہی طریق عمل اختیار کیا۔ میوات میں (بہ تصحیح مترجم) حسن خاں" ناپاک مردک فتنہ و فساد کا سرغنہ تھا" تاتار خاں گوالیار میں، حسین خاں راپری میں، قطب خاں اٹاوے میں، عالم خاں کالپی میں ڈٹے ہوئے تھے۔ قنوج اور گنگا کے دوسری طرف سارے علاقے پر افغان مخالفوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ نصیر خاں، معروف اور بہت سے دوسرے امیر وہ تھے جو سلطان ابراہیم کی زندگی ہی میں باغی ہو گئے تھے اور جس وقت میں نے اسے شکست دی تو یہ قنوج اور اس کے آگے کے علاقے پر قابض تھے۔"

مشرق میں کنارِ گنگا کے ان طاقتور باغیوں کے اور مغرب میں راج پوت راجاؤں کے خطرناک جتھے کے درمیان بابر قریب قریب بیچ میں تھا۔ جنوبی ہند کے وسط میں وجیانگر کی سلطنت کی اس نے صرف سُن گُن پائی تھی۔

مذکورہ بالا حالات قدرتی ہی تھے کیونکہ مسلمان سلاطین عظام نے اکثر "ابر آلود" پہاڑوں سے یورشیں کیں اور واپس چلے گئے۔ تیمور نے دہلی کو تاراج کرنے کے بعد سمرقند کی راہ لی۔ خود بابر چار دفعہ

۱؎ تزک فارسی میں تہار لکھا ہے اور "بارہ" کوئی معروف نام نہیں ہے۔ مترجم۔

دریائے سندھ کے پار آیا اور واپس ہو گیا۔ غرض ہندوستان کے دور دست جاگیرداری رئیس اس موقع پر بھی اپنے اپنے قلعوں میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے تھے کہ مغل لوٹ کا مال لے کر رخصت ہو جائے گا۔ ان میں کوئی تنظیم نہ تھی لیکن سرکشی میں سب متحد تھے۔ لیکن ایک سال گزر گیا اور بادشاہ یہیں رہا تو صاف معلوم ہو گیا کہ وہ مستقل سکونت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے ہر اقدام سے یہی بات زیادہ واضح ہوتی گئی۔ لہذا اب ان رؤسائے ہند نے زیادہ تجسس شروع کیا اور سوچ میں پڑ گئے کہ بابر سے کیا معاملہ کیا جائے۔ ابراہیم لودھی کے زمانے کی ناکامیوں سے پنجاب اور دوآب کے سبھی اقطاع عاجز آ گئے تھے۔ بابر اگرچہ ترک تھا لیکن معلوم ہوا کہ جس طرح اپنی قوت پر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح قانون کا بھی احترام کرتا ہے۔ اہل ہند یا نی پت کو ابھی نہیں بھولے تھے اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ کئی مغل آزمودہ کار سپہ سالاران علاقوں کو فتح کرنے کے لیے بھیجے گئے جو آئندہ ان کی جاگیر میں دیے جانے والے تھے۔ تاہم ان جنگ آزماؤں نے بھی زیادہ تر فن فریب سے کام نکالا (اور مغل ایسے داؤ کرنے میں مشہور ہیں) خونریزی کی نوبت نہ آنے دی۔ اس کی مثال گوالیار ہے جہاں کے حاکم تاتار خاں کو وہاں کے علماء اور طلبہ ناپسند کرتے تھے۔ پہاڑی بلندی پر یہ قلعہ تو قریب قریب ناقابل تسخیر تھا اور بابر نے اسے لینے کے لیے مختصر سی مخلوط فوج بھیجی تھی جس میں نئی بھرتی کے دیہاتی شامل تھے۔ تاہم دوسری طرف سے کافر راجپوتوں کی آمد آمد کا خطرہ ہو گیا تھا۔ بابر کے ایلچیوں نے سمجھایا کہ ایسے کافروں کی چڑھائی کے مقابلے میں ہر مسلمان با ایمان کو متحد ہو جانا چاہیئے۔ قلعے کے اندر والے علما نے خفیہ تجویز کی کہ بادشاہ کے آدمیوں کو اندر آ جانا چاہیئے اور چپکے سے ہاتھی دروازے سے کھسک آنے میں مدد دی۔ اندر آتے ہی انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ تاتار خاں کے بنائے کچھ نہ بنی اور آگرے جا کر بادشاہ کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ جمنا گنگا کے درمیان چند افغان لشکر قریب سے واقعات کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سب سے پہلی عسکری جماعتیں تھیں جنھوں نے بابر کی ملازمت اختیار کر لی اور ایک فوج کی فوج جسے ابراہیم لودھی نے جونپور اور اودھ کی بغاوت فرو کرنے بھیجا تھا، اس نے بھی انھی کی تقلید کی۔ بابر کی مرحبہ زبانت نے کرشمہ دکھایا کہ اس لشکر کے سرداروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گویا وہ اس کے قدیم الخدمت تھے اور جونپور و اودھ کی بڑی بڑی جاگیریں انھیں عطا کر دیں۔

بابر کی یہ سب تدبیریں وقت سے بازی لے جانے کے لیے تھیں اور گوالیار کے آگے راجپوتوں کے جم غفیر کے جمع ہو جانے سے اس بات کی بہت کم مہلت ملی کہ وادی گنگا کے دشمنوں کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ ادھر اس نے ہمایوں کی ماتحتی میں فوج کے دستے روانہ کیے تھے (کیونکہ) بقول اس کے ہمایوں نے

کہا تھا کہ بادشاہ کا آگرے میں قیام ناگزیر ہے۔ ہر چند دو آب کے معرکوں میں کامیابی کا سہرا دہ اپنے بیٹے کے سر باندھتا ہے لیکن بظاہر ماتحت سپہ سالاروں کو براہ راست ہدایات بھیج کر پوری مہم پر خود نگرانی کرتا رہا۔ اُدھر ان بحرانی ایّام میں اسے راجپوتوں سے بھگتنے کے لیے بہت کچھ آگرے میں تیاریاں کرنی تھیں۔ اس کے ترک (رومی) استادوں نے چند نئی اور کلاں تر توپیں ڈھالنے کی بھی کوشش کی۔ لکھتا ہے "میں نے استاد علی قلی سے ایک بڑی توپ ڈھالنے کی فرمائش کی تھی۔ جب اس نے بھٹیاں اور سامان تیار کر لیا تو آدمی بھیج کر مجھے اطلاع دی۔ پیر کے دن ہم اس کا ڈھلنا دیکھنے گئے قالب کے گرد آٹھ بھٹیاں لگائی تھیں۔ ہر ایک کی نالی کا منہ اس قالب کی طرف تھا جس میں توپ ڈھلنے والی تھی۔ میرے آنے پر نالیوں کے منہ کھولے گئے اور پگھلا ہوا تانبا سیال شے کی طرح ہر نالی سے بہ کر چلا لیکن تھوڑی دیر میں قالب کے بھرنے سے پہلے یکے بعد دیگرے سب نالیوں سے مصالحہ آنا رُک گیا۔ یا تو اس تانبے کی مقدار میں کمی تھی یا بھٹیاں ٹھیک نہیں بنی تھیں۔ استاد علی قلی کو اس درجہ غیرت آئی کہ چاہتا تھا اس پگھلے تانبے میں خود کو گرا دے۔ میں نے اس کی دل جوئی کی بلکہ خلعت دے کر شرمندگی مٹائی۔

دو دن بعد قالب ٹھنڈا ہو گیا اور اسے کھولا گیا تو استاد علی قلی بہت خوش ہوا اور فوراً مجھے اطلاع دی کہ توپ کی نال پوری بغیر خرابی کے تیار ہو گئی، البتہ بارود کا خانہ بنا کر اس میں جوڑنا پڑے گا اور میں یہ کر سکتا ہوں۔ پھر نال کو نکال کر تراش خراش کے لیے کاریگروں کو دیا اور خود خانہ بنانے میں مصروف ہوا۔

بابر کو یہ بات یاد تھی چنانچہ کچھ روز بعد جب اس کا عقبی خانہ تیار ہو گیا تو اس کے دغنے کی آزمائش دیکھنے گیا۔ یہ (آگے چل کر) "غازی" توپ کہلائی۔ جب چلائی گئی تو بغیر نال پھٹے، بھاری گولہ سولہ سو گز پھینکا، جو اس زمانے میں بہت لمبا پرتاپ تھا۔ اس مرتبہ استاد کو خلعت فاخرہ، عربی گھوڑا اور تلوار کی پیٹی (کمر) انعام ملی۔

ہمایوں کی سرکشی

ترک مہندس توپیں ڈھال رہے تھے، ہمایوں کی فوجیں شباشب مشرق میں بڑھ رہی تھیں، خود بادشاہ آگرے میں راجپوت جتھے کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھا کہ ایک خط اس نے حرم سرائے کابل کو بھیجا جس نے ... کی بیویوں میں بڑی تشویش اور پریشانی پیدا کر دی۔ یہ خط اپنی تزک میں بھی پورا نقل کر دیا ہے:

"گذشتہ جمعے عجیب واقعہ پیش آیا۔ تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم لودھی کی بدنصیب ماں نے سُنا کہ میں نے بعض ...

کھانے کھائے تھے۔ صورت یہ کہ تین چار مہینے قبل میں نے ابراہیم کے باورچیوں کو بلایا۔ پچاس ساٹھ میں سے چار چھانٹ کر ملازمت میں رکھے کہ ہندوستانی کھانے تیار کریں گے جو اس وقت تک میں نے نہیں کھائے تھے۔ ابراہیم کی ماں نے یہ سن کر اٹاوے سے احمدؐ چاشنی گیر کو بلایا (ہندوستانی (بہ تصحیح مترجم) بکاول کو بھی چاشنی گیر کہتے ہیں) اور اسے کوئی تولہ بھر زہر کی پڑیا ماما کے ہاتھ بھیجی۔ احمد یہ پڑیا میرے باورچی خانے کے ایک ہندوستانی باورچی کے پاس لایا اور اسے چار پرگنے جاگیر میں دلوانے کا وعدہ کیا اگر کسی طرح وہ زہر میرے کھانے میں ملا دے۔ ابراہیم کی ماں نے ایک اور ماما بھی بھیجی کہ دیکھ کر آئے، پہلی ماما نے زہر احمد کو دے دیا ہے یا نہیں۔

حسن اتفاق سے باورچی نے زہر پتیلی میں نہیں ڈالا بلکہ رکابی میں چھڑکا۔ کیونکہ میرا حکم تھا کہ چاشنی گیر سالن پتیلی سے نکال کر ہندوستانی باورچی کو چکھایا کریں۔ مگر نالائق چاشنی گیروں نے رکابی میں سالن کے بعد نگرانی نہیں کی چینی کی رکابی میں جو پھلکے لائے جاتے ہیں۔ باورچی نے کچھ زہر ان پر چھڑک دیا اور اوپر گھی میں بگھاری ہوئی بوٹیاں رکھ دیں۔ اگر بوٹیوں پر بھی چھڑک دیتا تو بہت خرابی ہوتی۔ مگر وہ گھبرا گیا اور آدھا زہر چولھے میں گیا۔ جمعے کی نماز سے فارغ ہو کر دسترخوان چنا گیا۔ میں نے خرگوش کے گوشت کی رکابی سے کچھ کھایا۔ گاجریں پکی تھیں، وہ کھائیں پھر چند لقمے زہر والی رکابی سے لے کر کھائے۔ پہلے تو کوئی چیز بے مزہ نہیں معلوم ہوئی، لیکن گوشت کی بوٹیاں کھائیں تو طبیعت بگڑ گئی۔ ایک دن پہلے خشک گوشت "رقاق" پکوا کر کھایا اور وہ بے مزہ معلوم ہوا تھا، میں سمجھا کہ اسی کے باعث متلی ہو رہی ہے۔ دو تین دفعہ ابکائی آئی۔ قریب تھا کہ دسترخوان پر ہی قے ہو جائے آخر اٹھ کر آبدار خانے میں گیا۔ جاتے جاتے ابکائیاں آئیں۔ پھر وہاں قے کی۔ کھانا کھا کے مجھے پہلے کبھی قے نہیں ہوئی تھی اور زیادہ شراب پی کر بھی ایسی نوبت نہ آئی تھی۔ لامحالہ شبہ پیدا ہوا اور حکم دیا باورچیوں کو حراست میں لے لیا جائے۔ ڈالی ہوئی غذا کتے کو کھلائی اور اسے نظر میں رکھا تو دوسری صبح اس کا پیٹ ابھر گیا اور ایسا علیل رہا کہ پتھر مارنے سے بھی جگہ سے نہ اٹھتا تھا۔ بارے دوپہر کو وہ اٹھ بیٹھا اور مرنے سے بچ گیا۔ میرے دو ایک سپاہیوں نے بھی زہر والی رکابی سے کھایا تھا۔ وہ بھی قے کرتے رہے۔ ایک کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ شکر ہے ہم سب بچ گئے۔

میں نے سلطان محمد بخشی کو تفتیش کا حکم دیا اور جب باورچی کو سخت مار لگانے چلے تو اس نے سارا حال ایک ایک کر کے بیان کر دیا۔ پیر کو دربار کا دن تھا، میں نے سب امیروں، وزیروں اور عمائد کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ سر دربار وہ دو مرد اور دونوں عورتیں لائی گئیں اور ان سے جرح کی گئی۔ انھوں نے پورا واقعہ

اور اس کی تفصیل سنا دی۔ چاشنی گیر (احمد) کے ٹکڑے کرا دیے۔ باورچی کی کھال کھنچوا دی گئی۔ ایک عورت کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا، دوسری کو بندوق سے اُڑا دیا۔ مادرِ ابراہیم کو حراست میں رکھوایا گیا (بعد میں یہ کابل بھیجی گئی اور اس نے دریائے سندھ میں اپنے آپ کو گرا دیا)

ہفتے کو ایک پیالہ دودھ کا میں نے پیا اور اتوار کو تریاقِ فاروق ملا کر پیا۔ پیر کو مسہل لیا۔ کالا کالا صفرا سا خارج ہوا۔ خدا کا شکر ہے ہم زندہ سلامت رہے۔ جو کچھ پیش آیا اس کی سب تفصیل میں نے یہ سمجھ کر کہ کابل میں تشویش نہ ہو، خود لکھ دی ہے۔ یہ بلا سانحہ خیر کے ٹل گئی۔ اب کسی کو خوف و پریشانی کی ضرورت نہیں (شعر ترکی)

"چوٹ کھائی، بیمار ہوا، زندہ ہوں
موت کا مزا چکھا تو زندگی کی قدر ہوئی"

یہ خط منگل کو لکھا۔ میں چار باغ (آگرہ) میں ہوں"۔ پھر بابر لکھتا ہے کہ "انھی دنوں میں بیانہ کے نوجدار مہدی خواجہ کے آدمی پے بہ پے آنے شروع ہوئے اور خبر لائے کہ رانا سانگا کا آنا یقینی طور پر معلوم ہوا۔ حسن خاں میواتی بھی اس سے جا ملنے کے لیے تیار بتایا جاتا ہے۔ اب اور سب باتوں سے پہلے اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ پوری فوج کے آنے سے پہلے ہی کچھ کمک بیانہ پہنچ جانی ضروری ہے"۔

بابر پہلے ہی ہمایوں کے سبک پا لشکروں کو مشرق سے واپس آنے کا حکم دے چکا تھا، جہاں نصیر خاں اور اس کے جونپور و اودھ کے حلیفوں کو مغلوں نے اپنے ہندوستانی پٹھان وفاداروں کی معیت میں بُری طرح کھدیڑا تھا۔ یہ آزادی کے دعوے دار بابر کے الفاظ میں "باغی" تھے۔ صبا رفتار مغل سواروں نے گنگا کو عبور کیا اور نصیر خاں کی فوجوں کو گھاگرا تک دباتے ہوئے چلے گئے۔ باپ کا حکم ملا تو ہمایوں نے چند دستے چھوڑ کر کہ غیر منظم افغانوں کی خبر رکھیں، واپس کوچ کیا اور کالپی کے راستے پھیر کھا کے آگرے آیا۔ کالپی کے رئیس کی طرف سے کچھ کھٹکا تھا، اسے ہمراہ لیتا آیا۔ یہ پوری مہم جس سے بابر کا مقصد مشرقی حریفوں کو آگرے سے دور دھکیل دینا تھا آندھی کی تیزی سے چلی اور بڑی آن بان سے تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، اُسے سمجھنا مشکل ہے۔

ہمایوں جنوری ۱۵۲۷ء میں آگرے کے زیر تکمیل چار باغ میں باپ کے حضور میں باریاب ہوا۔ حسب معمول اعزاز و اکرام تحسین و آفرین سے جس میں بابر بیٹے کے ساتھ کبھی بخل نہ کرتا تھا، نوازا گیا۔ مگر یہاں یا شاید چند روز بعد اس نے اپنی دور دراز ولایت بدخشاں کو جانے کی اجازت مانگی۔ بابر زہر خورانی کی پوری جزئیات لکھتا ہے:

بخلاف اس کے بیٹے کی اس متمردانہ درخواست کی نسبت تقریباً سکوت کر جاتا ہے۔ ایسی اجازت کہ جس وقت ساری فوج مار امار راجپوتوں سے لڑنے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی شہزادہ ہمایوں اپنی مضبوط بدخشانی جمعیت کے ساتھ چلا جائے، کسی طرح نہ دی جاسکتی تھی۔

ہمایوں نے ایسے نازک موقع پر باپ کو چھوڑ دینے کا خیال بھی کس طرح کیا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ممکن ہے من موجی شہزادے کی خواجہ کلاں سے کوئی قرارداد ہو گئی ہو۔ خواجہ چند مہینے پہلے تک اس کا اتالیق و مشیر تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اور کئی سردار بابر کو واپس کابل لے آنا چاہتے تھے۔ ہمایوں کی نسبت بزدلی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جنگ میں اپنی ماں سے کئی دن مشورے کرنے کے بعد وہ با دلِ ناخواستہ شریک ہونے آیا تھا۔ پھر جنگ میں ان سن رسیدہ آزمودہ کار سرداروں کے زیرِ نگرانی رہنا بھی اسے پسند نہ تھا، جو بابر کی ہر ہدایت کو قرآن و حدیث کے حکم کی طرح مانتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بدخشانی سپاہی تقریباً ۱۴ مہینے سے وطن چھوڑے ہندوستان میں مصروفِ جنگ رہے وہ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ اس نفرت انگیز ملک میں مزید مخدوش لڑائیاں لڑنے سے قبل جو کچھ مال متاع حاصل کیا تھا، اسے لے کر خیریت سے واپس چلے جائیں۔ مگر ممکن ہے ان میں سے کوئی سبب بھی نہ ہو بجز اس مراتی شہزادے کی ناتجربہ کاری اور پریشان خیالی کے ـــ بہرحال بابر نے وعدہ کیا کہ اس جنگ کے فوراً بعد ہمایوں کو بدخشاں جانے کی رخصت دے دی جائے گی۔ اسی زمانے میں عفو و کرم کی ترنگ میں آکر اس نے حسن خاں میواتی کے بیٹے کو جو یرغمال میں زیرِ نگرانی تھا، آزاد کر دیا بلکہ خلعت اور مراحم شاہانہ کے وعدوں سے مطمئن کر کے آگرے سے رخصت کیا۔ حسن خاں بیٹے کی طرف سے بہت پریشان تھا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مغلوں کا شریکِ حال رہے یا راجپوتوں کے جتھے میں جا ملے۔ بیٹے کے سلامت آتے ہی وہ راجپوتوں کی طرف چل پڑا۔

اسی کے ساتھ خبر آئی کہ وہ نیم مسلح جُوق جو بیانے کی مقامی فوج کی مدد کے لیے گیا تھا، دشمن کے اُمنڈتے سیلاب کے سامنے نہ ٹھیر سکا اور مقامی جمعیت سمیت سیدھا واپس چلا آ رہا ہے۔

"آٹھ ستاروں کا خلاف جمع ہونا"

اب تک جس قدر حریف مغلوں سے لڑے، راجپوتی جتھا اُن سب سے قوی تر قسم کا تھا اور بیانے سے بھاگنے والوں نے اقرار کیا کہ وہ راجپوتوں سے خوف زدہ ہیں۔

راجستھان کے رئیس اور راجہ آپس میں برابر لڑتے رہتے تھے لیکن ایک بیرونی دشمن کے مقابلے میں پوری طرح متحد ہونے کی قابلیت سے عاری نہ تھے۔ مسلم پادشاہ کے خلاف انھوں نے پورا سنگھٹن کر لیا تھا۔ ان میں سات بڑے راجا اور شاید سو کے قریب چھوٹے رئیس کل اسی ہزار سواروں کا لشکر اور کئی سو جنگی ہاتھی لے کر آگئے تھے۔ نام اور القاب کی فہرست پڑھیے تو پرانی رزمیہ مثنویاں یاد آجاتی ہیں کہ سلسلہ وار میواڑ کے جھنڈوں کے پیچھے چتوڑ، رنتھنبور، چندیری کے جنگ جو چلے آرہے ہیں۔ راجپوتی بہادری کا جوش دلوں میں بھرا ہے۔ دیس کے مالک ہونے کا زعم رکھتے ہیں اور اس وقت مسلمان حملہ آوروں سے اپنی جنم بھومی کو بچانے آئے ہیں۔ راجپوتوں کا حوصلہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ جنگ میں صرف اس وقت قدم ہٹاتے ہیں جب کہ دست بدست مقابلے میں ان کی صفیں پارہ پارہ ہو جائیں۔ انھیں حسن خاں میواتی وغیرہ اتحادیوں پر اسی قدر بھروسہ ہے کہ کامیابی میں ساتھ دیں گے اور مصیبت میں کام نہیں آئیں گے۔

راجپوتوں کا سرخیل، بابر کی طرح سپاہیوں کا محبوب ہے۔ رانا سانگا، سنگرام سنگھ جنوڑی لڑکپن سے معرکے رڑتا رہا اور ایک ہاتھ، ایک ٹانگ اور ایک آنکھ انھی آویزشوں کی نذر کر چکا ہے۔ اس کے مرنے وقت کہا جاتا ہے کہ جسم پر اسّی زخموں کے نشان گنے جا سکتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ رانا سانگا کو حکومت اپنی ہمت اور تلوار کے زور سے حاصل ہوئی تھی۔

کسی سپاہ کی ہمت قومی اسباب اور نسلی روایات پر مبنی ہُوا کرتی ہے۔ پھر اس موقع کے سپہ سالار کی قابلیت پر جیسے ہنی بال نے رومہ پر فوج کشی کی تو گو اس کا لشکر بہت مختلف عناصر کا مجموعہ تھا اور مقابلے میں رومی فوجیں زیادہ متحد اور قومی شعور سے متکیف تھی تاہم اس کی ذاتی فوقیت بازی لے گئی۔ مگر ان سب امور کے علاوہ کسی جنگ سے پہلے کے واقعات اور عجیب وغریب افواہوں کا بھی جو پڑاؤ میں الاؤ دوں کے گرد اڑتی پھرتی ہیں، اچھا خاصا اثر ہوا کرتا ہے۔ اب آگرے میں لشکر کے حوصلے نئے کہ پست ہوئے جاتے تھے۔ بابر کو بھی اس بات کی خبر تھی۔ زمانۂ حال کی فوج دشمن کی اتنی زیادہ تعداد کے مقابل ہوتی تو غالباً جمنا کے کنارے آگرے کے گرد خندقیں کھود کر مدافعانہ جنگ کرنے کو ترجیح دیتی، مگر بابر اس قسم کی ذرا سی کمزوری بھی دکھاتا تو دوآب کے میدان اور قلعے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ محض تاخیر کی بدولت بیانہ ابھی نکل چکا تھا۔ پس پیش قدمی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ لشکر لے کر راجپوت جتھے سے لڑنے چل پڑا۔ ہر اگلی منزل پر کنوئیں کھدواتا، احتیاط سے قدم بڑھاتا اور دشمن کی بدلتی منزلوں اور لشکر گاہوں کی پوری طرح خبریں منگواتا

تھا۔ پانی پت کی طرح اس کے متحرک مورچے ساتھ ساتھ تھے اگرچہ یہاں توپی تر سوار فوج کا سا منادر پیش تھا۔ بعض ہند و رئیس جنھوں نے حال میں اطاعت و ملازمت قبول کر لی تھی، بابر نے ان پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ انہیں عقب میں دُور کے قلعوں کی (جیسے سنبھل) حفاظت کے لیے بھیج دیا تھا۔

جنگ کا پہلا مقابلہ نقصان پر منتج ہُوا۔ قراول کی ایک جمعیت جو دیکھ بھال کے لیے گئی تھی، بے احتیاطی سے دور تک بڑھے چلی گئی۔ دشمن چوکس تھا۔" مگر یہ لوگ کنواہہ کے راستے پر آگے پیچھے دیکھے بغیر چلے" اور گھوڑے دوڑا کر ہندوؤں کے چند بڑے بڑے گروہوں پر جا پڑے۔ نتیجے میں ہر طرف سے گھیرے میں آ گئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے امدادی لشکر نے بڑھ کر انھیں وہاں سے نکالا اور بچا کر لے آیا۔ لیکن اسی اقدام نے راجپوتوں پر آہبندہ رسالے کی کسی دوش کو روک دیا، جن کے لشکر اب مغل لشکر سے کوئی چھ کوس کے فاصلے کی بستی کنواہہ کے گرد مجتمع ہو رہے تھے۔

بابر نے ایک تالاب کے کنارے توپوں کے سامنے خندق کھدوائی اور دستور سابق کے مطابق گاڑیاں (ارابے) رسیّوں سے بندھوا کر دفاعی خط تیار کیا کہ لوگوں کے حوصلے مضبوط ہوں۔ بڑی توپ "غازی"[1] ڈھالنے والے استاد علی رُومی کو اپنے نائب مصطفٰے رومی سے خلش تھی۔ لہذا بابر نے ان عثمانلی استادوں کو الگ الگ صف لشکر کے انتہائی سروں پر متعین کیا۔ کانٹے کے دونوں بازوؤں پر ہمایوں اور عالم خاں نام زد ہوئے لیکن اصل قیادت کابل کے آزمودہ کار سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ جین تیمور کو اپنے پاس قول یا قلب لشکر میں رکھا تھا۔

بادشاہ لوگوں کے دل بڑھانے کا موقع ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ سواروں کا قافلہ کابل سے آنے کی اطلاع ملی تو اس کی پیشوائی کے لیے کئی رسالے بھیجے کہ پرچم لہراتے ہوئے جائیں اور دھوم دھام سے ساتھ لائیں، تاکہ دشمنوں کو خیال ہو کہ کوئی بڑی کمک آئی ہے۔ اسی قافلے کے ساتھ اونٹوں کی قطار بھی غزنیں سے آئی اور وہاں کی شرابیں کے علاوہ ایک جہاں گرد نجومی کو بھی لائی۔ اس نے اہل لشکر کی بد دلی کو دیکھ کر ویسی ہی بُری بُری پیش گوئیاں کرنی شروع کیں۔

" ایسے زمانے میں جب کہ فوج میں فکر و تشویش پائی جاتی تھی اور بعض واقعات بھی نامساعد پیش آئے تھے۔ یہ کم بخت شریف نجومی آ گیا اور مجھ سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر اور جس کسی سے ملتا، یہی کہتا تھا کہ" آج کل آٹھ

---

[1] مصنف نے اسے "VICTORY" لکھا ہے، تزک میں غازی نام آتا ہے۔ مترجم۔

ستارے مغرب میں ہمارے مقابل آگئے ہیں۔ جو کوئی مشرق سے لڑنے جائے گا شکست کھائے گا۔"
ضعیف الاعتقاد لوگوں کی یہ باتیں سُن کر اور بھی ہمت پست ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اس کی ہفوات پر بالکل توجہ نہ کی اور اپنی جگہ تدابیر میں کوئی تبدیلی یا فرق نہ آنے دیا۔" بابر کو ابھی تک اپنے لڑکپن کی وہ شکست یاد تھی جو نجومی کی جھوٹی پیش گوئی کی بدولت اندجان کی ندی کے پل پر کھائی تھی۔ البتہ (یہ تصحیح مترجم) ہفوات پر تاخت کرنے کا منصوبہ نہ چل سکا تو اس نے اپنے نفس کے محاسبے پر توجہ کی۔ لکھتا ہے کہ "پیر کو میں سوار ہو کر نکلا تو اسی گشت میں خیال آیا کہ کتنے دن سے توبہ کا ارادہ کر رہا ہوں جو پورا نہیں ہوا اور گناہوں کی سیاہی دل پر چڑھتی رہی۔ میں نے کہا "آہ، اے نفس کب تک گناہوں میں تو سرشار رہے گا اور زندگی برباد کرتا رہے گا۔ بس۔ توبہ کر۔"

چنانچہ پڑاؤ پر واپس آتے ہی شیر نے اعلان کیا کہ آج سے میں نے قاتل حیات، شراب ترک کی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ سونے چاندی کے شاہی ساغر و سبو توڑ کر فقرا اور مساکین میں وہ سیم و زر تقسیم کر دیا جائے۔ اس توبہ کی یادگار میں ڈاڑھی بھی رکھ لی۔ سب سے پہلے بادشاہ کی تقلید شراب سے توبہ کرنے والا رات کا چوکیدار تھا جس کے بعد کئی سو امرا، سردار و سپاہیوں نے شراب خوری سے توبہ کی۔ شراب کے سبو زمین میں لنڈھا دیے اور غزنیں سے جو شراب آئی تھی، اس میں نمک ڈال کر سرکا بنایا گیا۔

اس توبہ کے بعد بابر اپنی قسم پر قائم رہا۔ ایک عام فرمان بھی جاری کیا گیا پوری عمل داری میں شراب کی فروخت ممنوع کر دی گئی۔ درباری شاعر شیخ محمد زین نے یاد دلایا کہ آپ نے منت مانی تھی کہ خدا، رانا سانگا پر فتح دے گا تو مسلمان رعایا کا محصول معاف کر دوں گا۔ بابر کو بھولا وعدہ یاد آیا اور معافی کے فرمان پر بھی دستخط کیے لیکن جنگ کے بعد یہ جزئیہ پھر بھلا دیا۔

توبہ و انابت کے باوجود، جس میں بابر مخلص و صادق تھا، ظاہری حالات میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ لکھتا ہے کہ "ان دنوں کوئی شخص ہمت و حوصلہ مندی کی بات نہیں کرتا۔ جن وزیروں مشیروں سے صلاح نیک کی توقع ہے، کوئی کلمۂ خیر زبان سے نہیں نکالتے۔ وہ امرا جو بڑی بڑی جاگیریں ہضم کر چکے ہیں کوئی مدد نہیں دیتے بجز ایک خلیفہ کے جو برابر حق رفاقت ادا کر رہا ہے اور کسی کام میں فروگذاشت ہونے نہیں دیتا ...... ادھر فتنے ہیں کہ ہر طرف سر ابھار رہے ہیں۔ دشمنوں میں سے حسین خاں نے رابری کو جا دبایا قطب خاں نے چندلور پر قبضہ جمایا (لب جمنا) خواجہ زاہد سنبھل چھوڑ کر چلا آیا۔ گوالیار کا قلعہ اس نواح

کے ہندوؤں نے آگھیرا اور عالم خاں جسے کمک دینے بھیجا تھا، ٹل کر اپنی جاگیر کو چل دیا۔ ایک مردک رستم خاں نے جمنا پار کے ترکش بندوں کو جمع کر کے کول کو لے لیا۔ بہت سے ہندوستانی عمائد بھاگ گئے۔ بارے کا حسن خاں ہندوؤں سے جا ملا۔ میں نے ان میں سے کسی شخص کی جانب اعتنا نہ کی بلکہ اپنے (جنگی) کام میں مصروف رہا۔"

ہر چند بابر واضح الفاظ میں نہیں لکھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متعدد قلعوں کا ہاتھ سے نکل جانا کچھ کم فکر کی بات نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی آگرہ کنواہہ کے راستے ہی میں ہے اور دشمن کے (بے ضابطہ) حلیف خود آگرے کے آس پاس آ گئے ہیں اور جیب کترنے میں مصروف ہیں۔ ان کی کامیابی مزید بے دفائی اور فراری کا باعث ہو رہی ہے۔ مجموعی طور پر بیرونی مسلم اور دیسی ہندو کے اس مقابلے میں قوت کا پلڑا آگرے کی بجائے کنواہہ کے پڑاؤ کی طرف جھکا چلا جاتا ہے۔ دیکھنے والے یہی رائے لگا رہے ہیں کہ بابر کو شکست کا سامنا ہے اور وہ کوئی تدارک نہیں کر رہا، بخلاف اس کے رانا سانگا نے فتح کے بہت کافی اسباب جمع کر لیے ہیں۔

بابر نے اپنے امرا اور سرداروں کو جمع کر کے دو ٹوک تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اہل لشکر کو ترغیب و تحریک دینے کا یہ واقعہ سب سے بہتر ایک عورت (گلبدن) کی قلم سے بیان ہوا ہے:-

"اب جو دشمن اتنے قریب آ گیا تو اس کے قلب ہمایوں کو یہ (اجتماع کی) تدبیر سوجھی۔ امرا اور خوانین سلاطین، چھوٹے بڑے، امیر غریب سبھی اس کی تقریر سننے کے لیے آ گئے۔ تب اس نے کہا "کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہمارے اور ہمارے دیس اور وطن کے درمیان کئی مہینے سفر کا فاصلہ حائل ہے۔ اگر ہمیں خدانا خواستہ خدانا خواستہ، یہاں شکست ہوئی تو ہمارا ٹھکانا کہاں رہے گا؟ ہمارا مادری وطن کہاں، ہمارا شہر کہاں ہے۔ ہم اس وقت اغیار و اجانب کے بیچ میں ہیں۔ ہر اعتبار سے ضروری اور بہتر ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ تمھارے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ اگر فتح ہوئی تو ہم خدا کی راہ میں غازی ہوں گے، اگر فتح نہ ہوئی تو جان دے کر شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں نجات و فلاح ہماری ہے۔ ہمارا قدم آگے ہی پڑے گا۔ ہمارا نام نیک ہمیشہ یادگار رہے گا۔"

یہ بابر کا پرانا نظریہ تھا: نیک نامی کی موت کہیں بہتر ہے بدنامی کی زندگی سے۔ اس میں کسی تناقض

کا دخل نہ تھا حقیقت میں وہ یہی سمجھتا تھا اور اسی اذعان کی تاثیر تھی جو سارے لشکر میں دوڑ گئی۔ انھوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر لطیب خاطر قسمیں کھائیں کہ مرجائیں گے، میدان سے منہ نہ پھیریں گے بہرحال اسی تول و قسم کا ہنگامہ سا برپا تھا۔ نجومی کے احکام اور بڑی بڑی فالیں، وقت کے وقت ہوا ہو گئی تھیں۔ پھر بابر نے اپنے آدمیوں سے وعدہ کیا کہ رانا سانگا سے جنگ کے بعد جو شخص بھی وطن کو واپس جانا چاہے گا اسے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

چند گھنٹوں تک پورے لشکرگاہ میں دینی جہاد کا جوش و خروش نظر آتا تھا۔ لیکن کنواہہ کی سڑک کے دوسری جانب ہندو پڑاؤ میں بھی ایسے ہی جذبات (بلا اعلان) طاری تھے۔

بابر نے بلا تامل فوج کو میدان کارزار میں نکلنے کا حکم دیا۔ یہ فارسی نو روز، ۱۳ مارچ ۱۵۲۷ء کا دن تھا۔ توپ اور ارابوں کی قطاریں جو رسّوں اور زنجیروں سے آپس میں جکڑ کر باندھی گئی تھیں، حرکت میں آئیں۔ نئی خندقیں کھودنے والے آگے آگے اور تفنگچی، مرتب صفوں میں شتابے جلائے ہوئے عقب میں بڑھ رہے تھے۔ قدم قدم چل کر راجپوتی پڑاؤں اور ان کے اگلے رسالوں تک پہنچ رہے تھے۔ اوپر آسمان سے کوئی دیکھنے والا شاید ایسا مشاہدہ کرتا کہ ایک سوسمار کسی چیتے پر حملہ کرنے کے لیے رینگتا ہوا چلا آتا ہے۔

"میدانِ کارزار کنواہہ"

پانی پت کی طرح اس جنگ کی نسبت بھی خود بابر نے کچھ زیادہ نہیں لکھا اور سرکاری شاعر شیخ زین کا "فتح نامہ" فصاحت و بلاغت کی لفاظی میں اصل واقعات کا انکشاف ہونے نہیں دیتا۔ تاہم ابہام کے پردوں سے بعض صحیح جزئیات نکل آتی ہیں۔ بابر کی متحرک قطار کے درمیان فاصلے چھوڑ کر ان میں بڑی بڑی چوبی تپائیاں پہیوں پر چلائی جا رہی تھیں۔ عین کارزار کے دن ان سب کو نیم کندہ خندقوں کے پیچھے جو وقت کے وقت کھودی گئیں، ایک زنجیرے میں متحد اور پیوستہ کر دیا گیا تھا۔ تیر کا حکم تھا کہ اس حد سے باہر کوئی سپاہی نہ بڑھے اور پوری صف کا خود اس نے سوار ہو کر معائنہ کیا کہ ہر سوار کو اپنے اپنے مقام پر مستعد رہنے کا جائزہ لے۔ راجپوت زرہ پوش جنگی ہاتھیوں کے پیچھے پیچھے بڑھے اس لیے ان کی رفتار شروع میں سست تھی۔

پانی پت کے مقابلے میں یہاں فوج ردلیف کو بہت گہری صفوں میں مجتمع کیا تھا لہذا پورا لشکر، طویل پتلی قطار کی بجائے دشمن کو چوکور اور چھدرا چھدرا نظر آتا ہوگا۔ سامنا ہوتے ہی سب سے پہلے توپوں نے

بڑھتے ہوئے ہاتھیوں پر گولہ باری کی اور معلوم ہوتا ہے بڑی توپوں کے درمیان زنبورکوں نے زاویوں میں ترچھی باڑیں چلائیں۔ ادھر راجپوتی رسالوں نے جو پُرجوش یورشیں کیں تو مغلوں کی تیر باری نے ان کا منہ پھیر پھیر دیا۔ بابر کے سپاہی اپنی قسم کے پابند رہے انھوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی جگہ سے قدم نہ ہٹائیں گے اور مریں گے یا مارے جائیں گے۔

دوپہر کی تیزی نے بھی گھمسان کی جنگ میں کوئی کمی نہ ڈالی۔ راجپوتی دلاوری یکے بعد دیگرے حملے پر حملے کر رہی تھی کیونکہ ایک لشکر ہٹتا تو دوسرے راجہ یا رانا کے رسالے اس کی جگہ لیتے اور حریف پر ٹوٹ کر جا پڑتے تھے۔ عصر کے وقت تک بابر اپنی ردلیف کے تمام دستے جنگ کے میدان میں جھونک چکا تھا اور ابھی تک اس کے جناحی لشکروں کو دونوں بازو برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ مہلت نہ ملی تھی کہ پھیر کھا کے دشمن کی پشت پر جا نکلیں۔ شاید از سرنو صفوں کی درستی، زخمیوں کو پیچھے لے جانے اور گھوڑوں کو سستانے میں تھوڑا سا وقفہ واقع ہوا تھا کہ اتنے میں بادشاہ نے غیر متوقع حکم یہ دیا کہ پورا لشکر بہ یک وقت واحد میں راجپوتوں پر حملہ کرے۔ ایک دم زنجیر بند ارابوں کے درمیان کے کھلے حصوں سے سوار نکل پڑے۔ توپوں کو آگے کھینچا گیا تفنگچیوں نے سرعت سے پیش قدمی کی۔ اس چال کا فوری اثر ظاہر ہوا۔ راجپوتوں کے ملے جلے لشکروں نے بظاہر اس براہ راست تھپیڑ کو روکنے کی تیاری کی اور وسط کی طرف سمٹے تھے کہ اسی لمحے مغلوں کے جناحی جھپٹے پوری قوت سے چلے اور ہندوؤں کو تین طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ وہ ابھی تک مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے لیکن صفیں متزلزل ہو گئیں اور خود ان کے حملے بالکل رک گئے۔ اب اس عظیم لشکر کے اجزا ادھر اُدھر گھیرے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رانا سانگا زخمی ہو کر میدان سے ہٹا لایا گیا تھا۔ سورج چھپتے چھپتے راجپوتوں نے میواڑ کے پہاڑوں کے رُخ بھاگنا شروع کیا۔ مگر کہتے ہیں رانا سانگا نے قسم کھائی تھی کہ فتح کیے بغیر شہر میں واپس نہ آئے گا، لہذا اس نے چتوڑ جانا قبول نہ کیا۔

غروب آفتاب کے قریب بابر دشمن کو بھگاتا ہوا اس کے لشکرگاہ میں پہنچ گیا جو مغلوں کی صبح کے وقت کی صف بندی سے کوئی کوس بھر کے فاصلے پر تھا۔ وہ ایک کوس اور آگے گیا اور پھر رات ہو جانے کی وجہ سے نماز عشا کے وقت تک اپنے اُردو میں واپس پہنچ گیا۔"

راجپوتوں کی روایات کی رو سے ان کے لشکر کا بڑا حصہ میدان میں کھیت رہا۔ مقتولوں میں ان کے بہترین بہادروں کے نام آتے ہیں: ڈونگرپور کا راول، برادری کے دو سو منچلوں کے ساتھ۔ سلمبرا کا راجہ

چندارت برادری کے تین سو عزیزوں کے ساتھ ۔ مارواڑ کا راج کمار اپنے سرداروں کے ساتھ ۔ سونی گڑھ کا راٹھ ۔ چوہان رئیس دراجہ ، روساے میواڑ اور بہت سے دوسرے نامی لوگ سب مارے گئے ۔ انہی مقتولوں میں حسن خاں میواتی بھی تھا ۔

مغل فتحمندوں نے مقتولوں کے بریدہ سروں کا میدان میں "کلہ منار" تیار کیا اور بابر کو "غازی" یعنی ایک دینی جنگ کے فاتح کے لقب سے ملقب کیا ۔ بے شبہ اس کی سپہ سالاری نے وہ معرکہ سر کیا جو نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کن ثابت ہوا ۔ رانا سانگا اپنے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور سال بھر کے اندر مر گیا ۔ اس کی اولاد میں بھی کسی کو پھر ہندوستان میں مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ پانی پت میں بابر نے شمالی ہند کے مسلمان بادشاہوں کی قوت توڑ دی تھی ۔ کنواہہ میں اس نے راجپوت جتھے کا دم خم نکال دیا ۔

"بجز تقدیر الٰہی کچھ نہیں ہوتا"

پانی پت کے بعد بابر نے سوار لشکر تیزی سے آگرے تک دوڑائے تھے ۔ کنواہہ کے بعد ایسا کوئی اقدام نہیں کیا ۔ ممکن ہے دن بھر کی شدید خونریزی میں فوج کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا ہو جتنا کہ اس کے بیان سے منکشف ہوتا ہے ۔ وہ اپنے سرداروں کی سستی کی شکایت کرتا ہے لیکن مغل فوج کا راجپوتان کی تپتی وادیوں میں گھسنے سے رکنے کا بڑا سبب گرمی کی آمد آمد ہوا ۔ آزمودہ کار سپہ سالاروں کو قلعوں کی بازگشت کے لیے جو افراتفری کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے ، بھیجنا ضروری تھا ۔ بابر نے اپنے پرانے داؤ سے کام لیا کہ مستحق سپاہیوں کو جاگیریں دے کر روانہ کیا کہ جائیں اور خود ہی ان کو مفتوح کریں ۔ پھر اپنے وعدے کا ، اگرچہ بادل ناخواستہ ، ایفا کیا کہ اکثر سرداروں کو جنھوں نے کابل کے سرد پہاڑوں کو واپس جانا چاہا ، اپنے غنائم اور جمعیت کے ساتھ واپسی کی اجازت دے دی ۔ خواہش کے اعتبار سے خود بادشاہ بھی وہاں کی یاد سے بے قرار تھا ۔

بہرحال یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک تہائی صدی تک خوفناک دشمنوں کے مقابلے میں ہٹنے کے بعد شیر کو یہ سکون میسر آیا کہ افق سے کسی نئے خطرے کے سر پر آ جانے کی تشویش نہیں رہی ۔ اب وہ رات کو زرہ پہنے بغیر سو سکتا تھا ۔ آس پاس مخالف اور بدسگال لوگوں کی کمی نہ تھی اور بہت سے مسائل حل طلب باقی تھے ، لیکن اسے ان کی چنداں فکر نہ تھی ۔ خدا کی رحمت اور فضل پر بھروسا بڑھ گیا تھا جس نے توبہ کا

والے مومنین کو دگنی تگنی تعداد کے کافروں پہ فتح کامل عطا کی اور وہ اعتقاد رکھتا تھا کہ دوسری پریشانیوں میں بھی وہی خدائے رحیم وقدیر اس کی مدد فرمائے گا۔ تزک میں اگلے چند ماہ کے حالات بہت تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں لیکن ان کی تہ میں ایک نیا اعتماد جھلکتا ہے اگرچہ پادشاہ کے دور اندیش دُنیا دار امرا اس شیریں خیالی میں اس کے ہم خیال نہ تھے۔

"فتح نامہ" نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "فتح کی سب سے پہلے مبارک باد دینے جو لوگ آئے انھی میں محمد شریف نجومی بھی آیا جس نے طرح طرح کی بد فالیاں نکال کر مجھے بہت آزار دیا تھا۔ مَیں نے بھی بُرا بھلا کہہ کر دل کا بخار نکال لیا۔ لیکن کافر نعمت، منحوس، خود پسند اور ناپسندیدہ مزاج ہونے کے باوجود، قدیم الخدمت تھا اس لیے میں نے ایک لاکھ (دام) انعام اور ملک سے چلے جانے کا حکم دے کر اُسے رخصت کیا۔"

"(بہ تصحیح مترجم) طاہر خاں پسر حسن خاں کی نسبت یہ سمجھ کر کہ اچھی کارگزاری کی ہے، میں نے الور کا پرگنہ اور پچاس لاکھ دام عطا کیے۔ لیکن اس نے بد دماغی سے انکار کیا اور معلوم ہوا کہ وہ کارگزاری بھی اصل میں چین تیمور سلطان کی تھی۔ پس میوات کا پرگنہ اور پچاس لاکھ اسے دیے گئے اور الور تردی بیگ کے نام کر دیا جس نے میمنے پر اوروں سے عمدہ کام انجام دیا تھا۔ الور کا خزانہ ہمایوں میرزا کو دے دیا۔ رانا سانگا سے جہاد کے وقت جب لوگوں سے حلف لیا گیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ جو کوئی ہندوستان سے جانا چاہے گا اسے رخصت دی جائے گی۔ ہمایوں کے سارے لشکری بدخشاں یا کوہستان پار کے تھے اور ایک دو ماہ سے زیادہ کبھی اپنی ولایت سے باہر نہیں رہے تھے۔ لڑائی سے قبل ان کی روش اچھی نہیں رہی تھی۔ دوسرے ولایت کابل میں سپاہ بہت کم رہ گئی تھی۔ ان سب وجوہ سے میں نے ہمایوں کو کابل جانے کی اجازت دے دی۔"

[آگے چل کر] اطلاع ملی کہ ہمایوں نے دہلی کے راستے جاتے ہوئے کئی کوٹھوں کا قفل تڑوایا اور بغیر میری اجازت روپیہ نکلوالیا۔ مجھے اس سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ نہایت رنج ہوا اور میں نے سخت سخت کلمات اُسے لکھے۔"

یہاں ہمایوں کے ناقابل فہم مزاج اور حرکات کا سوال پھر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ بابر نے بیٹے کے جانے کو عمداً اس طرح لکھا ہے کہ گویا وہ معمولی ضابطے کی بات تھی اور اس کا سبب بدخشانیوں کا

وطن کی یاد سے مضطرب ہوتا تھا۔ بلکہ بدخشاں کی بجائے زیادہ تر کابل بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ تاہم خلاف توقع ان خزانوں کے قفل تڑوانے سے جو شاہی ضرورتوں کے لیے اس نے مقفل کر دیے تھے، اسے بہت ناگوار ہوئی۔ یہ کام بدخشانی بطور خود نہ کر سکتے تھے اور نہ ہمایوں کے بغیر دہلی کے حکام اس کی اجازت دیتے۔ پھر اس شہزادے کو اپنی معرکہ آرائی کا صلہ بھی کچھ کم نہیں ملا تھا۔ حصار کے اقطاع کے علاوہ دہلی آگرہ کی بے حد دولت جس میں کوہ نور ہیرا شامل تھا، اُسے مرحمت کی گئی اور بوقت رخصت آلور کا خزانہ دیا گیا تھا۔ غرض ممکن ہے اس کا یہ فعل خواجہ کلاں کے شعر سے بڑھ کر (جو اس نے کابل جاتے وقت قیام ہندوستان کی مذمت میں دہلی کی فصیل پر لکھا تھا) ہندوستان میں رہنے کی مخالفت کا ثبوت ہوا اور امرا کی کوئی خاص ٹولی ہمایوں کو بھی اسی رائے سے پر لگاتی ہو کہ ہندوستان کو لوٹنے کے بعد چھوڑ دینا چاہیئے۔ مقفل خزانے کھول کر ہمایوں نے غالباً صرف تھوڑی سی منتخب چیزیں لے لی تھیں اور دو مہینے ہی گزرے تھے کہ بابر نے اُسے بدخشاں میں خلعت خاص اور گھوڑا بھیجا اور گویا قفل شکنی کے قضیہ نامرضیہ کو بھلا دیا۔

" ایک رات جوسہ کے قریب پہاڑ کے ٹیکرے پر ایک چشمے کے کنارے قیام ہوا۔ شامیانے نصب کر کے یہاں گناہ معجون کا شغل کیا [واضح رہے کہ ترک مے نوشی کے وقت دوسری مسکرات سے بابر نے توبہ نہیں کی تھی] اس چشمے سے تورج کے گزرتے وقت تردی بیگ نے اس کی بہت تعریف کی تھی [تردی بیگ کو جو پہلے فقیر ہو گیا اور اب بابر کا ہم پیالہ تھا، اس کے حسب خواہش پہاڑی قلعہ جاگیر میں دیا گیا تھا] یہ چشمہ حقیقت میں بہت خوب تھا۔ ہندوستان میں نہریں نہیں بنائی جاتیں۔ دیہاتی لوگ چشموں ہی پر پانی لینے جاتے ہیں یہاں کے چشمے بھی ہمارے ملک کے چشموں کی طرح جوش دار نہیں بہتے بلکہ ان میں سے پانی رستا رہتا ہے تاہم یہ چشمہ اچھا "نیم آسیا" پانی دے رہا تھا اور وہ بہ کر دامن کوہ کے مرغزار تک پہنچتا تھا۔ اس کی خوبصورتی میں بھی شبہ نہیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس کے گرد ہشت پہلو حوض بنا دیا جائے۔ جس وقت ہم چشمے پر بیٹھے معجون کے سرور کا مزا لے رہے تھے، تردی بیگ بار بار اس کی تعریف کرتا اور کہتا کہ میں نے اس کو یادگار بنا دیا ہے۔ اس کا کوئی مناسب نام بھی تجویز کرنا چاہیئے۔ عبداللہ نے تنگ آ کر کہا اچھا تو اس کا نام "شاہی چشمہ پسند بادشاہ تردی بیگ" رکھ لو اس پر خوب قہقہے اڑے ..... تردی بیگ فقیر ہو گیا تھا، میں نے طریق درویشی کی بجائے اسے سپہ گری کے راستے پر ڈالا۔ دو تہائی سال تک وہ میری خدمت میں رہا مگر اب پھر اس کے سر میں فقیری کی ہوا بھری اور مجھ سے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اجازت دے دی اور کامران

کے لیے تین لاکھ دے کر اسے (قندھار) روانہ کیا۔

اس عطیے کے ساتھ تردی بیگ کے ہاتھ بابر نے اپنے دورافتادہ رفیقوں کو ایک قطعہ بھی لکھ کر بھیجا۔ اسے خاص توجہ اور خوبی سے اس نے نظم کیا تھا۔ (ترجمہ):

" ان رفیقوں کو جنھوں نے ہوائے کابل کی یاد میں ہندوستان کی مشقت و صعوبت چھوڑ کر عاجلانہ وطن کی راہ لی، وہاں کی خوشیاں اور عزیزوں کی صحبت مبارک ہو۔۔۔

مگر ہم جو یہاں رہ گئے، تمام زحمتوں کے باوجود، شکر ہے کہ ہم بھی زندہ سلامت ہیں۔ ہمارے عیش و راحت کے دن گزر گئے، تمھارے ایام زحمت ؟"

اگلی برسات میں دوسرے سپہ سالار و حکام نے بھی اپنی جاگیروں پر جانے کی رخصت مانگی اور غالباً امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لیے صرف بادشاہ اور خلیفہ رہ گئے جو ایک حد تک خواجہ کلاں کا قائم مقام ہو گیا تھا۔ لیکن برسات ختم ہوتے ہی پھر لشکر کو جمع کیا گیا کہ مفتوحہ علاقوں کی حدود کو معین اور محفوظ کیا جائے۔ اس لشکر کو خود بابر ۲۷۔جنوری ۱۵۲۸ء (ربیع الثانی ۹۳۴ھ) کو لے کر پہلے جنوب میں چندیری کی طرف چلا جو سرحد راجستھان کے پہاڑوں کا مشہور قلعہ تھا۔ یہ ابراہیم لودھی کے قبضے میں رہا اور جنوبی سرحد کی کلید سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے راجپوت رئیسوں کو بابر سبق دینا چاہتا تھا، جو رانا سانگا کے مرنے پر حسبِ عادت باہم جنگ و جدال میں مصروف تھے۔ چندیری کو حوالے کر دینے کا مطالبہ وہاں والوں نے مسترد کر دیا۔

بابر لکھتا ہے کہ "چندیری اچھے شاداب علاقے میں واقع ہے اور اس کے قریب آبِ رواں ہے۔ پہاڑی کے اوپر اس قلعے کے اندر پہاڑ تراش کر ذخیرۂ آب تیار کیا گیا ہے۔ یہاں امیر غریب بھی کے مکان پتھر کے بنے ہیں۔ امرا کے مکانوں میں باریک نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ چھتوں پر بھی مٹی کی کھپریل کی بجائے پتھر کی پٹیاں لگائی جاتی ہیں۔ بالا حصار کے سامنے پانی کو تین حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے یہاں پانی بہت اچھا اور میٹھا مشہور ہے۔ ندی کے پیٹے میں بھی پتھر کی سلیں کی سلیں پٹی پڑی ہیں جس سے تعمیر کا بخوبی کام لے سکتے ہیں۔ آگرے سے چندیری کا فاصلہ بہ سڑک نوّے کوس جنوب میں ہے اور قطب تارے کی بلندی یہاں ۲۵ درجے ہے ...... چین تیمور کو چھ سات ہزار آدمی دے کے آگے

روانہ کر دیا تھا.... ہم نے کچوا میں پڑاؤ کیا اور ناظروں کو بیل داروں کے ہمراہ روانہ کیا کہ راستہ ہموار کریں اور جنگل جھاڑی صاف کر دیں۔ تاکہ چھکڑے اور بڑی توپیں آسانی سے گزر سکیں۔ کیونکہ کچوا سے چندیری تک جھاڑ یاں پھیلی ہوئی ہیں.....

پہاڑ کی چوٹی پر چندیری کا قلعہ اور نیچے شہر بستا ہے۔ شہر کے گرد بھی شاہراہ کے اوپر فصیل بنی ہوئی ہے۔ اسی سڑک پر میں نے خود جا کر جگہ جگہ اپنے سردار اور سپاہی متعین کیے۔ استاد رومی نے بیرونی فصیل کے باہر اپنی بڑی توپ "غازی" کی جگہ تجویز کی مگر یہ اونچی نہ تھی۔ بیل داروں نے اس کے لیے چبوتری بنا دی۔ پھر تمام سرداروں کو حکم دیا گیا کہ سیڑھیاں اور ڈھالیں لے کر قلعے پر حملہ کے لیے تیار ہو جائیں۔

اسی روز میدان ہی میں خلیفہ میرے پاس خط لے کر آیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری مشرقی فوجیں بغیر تیاری کے حریف سے جا بھڑیں۔ شکست کھائی اور لکھنؤ چھوڑ کر قنوج میں ہٹ آئیں۔ خلیفہ کو بہت پریشان دیکھ کر میں نے اس کی تشفی کی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے جب تک چندیری کا معرکہ درپیش ہے تم یہ خبر منہ سے نہ نکالنا۔ کل ہم حملہ کریں گے اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے ؟

چندیری والوں نے ساری طاقت بالا حصار میں جمع کر رکھی تھی اور شہر کی بیرونی فصیل پر صرف دو دو چار چار پہرہ دار مقرر کیے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ہمارے آدمی ہر طرف سے اس فصیل پر چڑھ گئے۔ محدودے چند پہرہ داروں نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ بھاگ کر بالا حصار میں چلے گئے۔

علی الصباح میں نے ہر شخص کو اپنی جگہ تیار رہنے اور جس وقت میں علم اور نقارے کے ساتھ برآمد ہوں حملہ کر دینے کا حکم دیا۔ لڑائی کا زور بندھنے سے پہلے میں علم اور نقارچیوں کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس گولہ باری کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ توپ کی بیٹھک نیچی اور فصیل پتھر کی نہایت مضبوط تھی۔ اس بالا حصار سے ایک دُہری دیوار نیچے کے حوضوں تک بنی ہوئی تھی اور حملے کے لیے یہی جگہ مناسب تھی۔ یہ کام قلب کی فوج رکاب کے تفویض ہوا تھا۔ ہماری یورش ہر سمت میں ہوئی لیکن سب سے بڑی جمعیت نے اسی مقام پر دھاوا کیا۔ ہندوؤں نے ہمارے بہادروں پر پتھر پھینکے۔ جلتی آگ پھینکی لیکن وہ نہ رُکے اور آخر جُوق کا سردار شاہم بیگ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دہری دیوار بالا حصار کی فصیل سے ملی ہوئی تھی۔ بہت سے اور سپاہی ہجوم کر کے یہیں آ گئے اور دہری دیوار جو راستے کے پشتے کا کام دیتی تھی، اسے چھین لیا۔

بالا حصار کے اندر ہندوؤں نے اتنی مزاحمت بھی نہ کی جتنی اس پشتے اور فصیل پر کی تھی بلکہ جلدی سے اندر بھاگ گئے اور ذرا دیر میں بالکل ننگے ہو کر نکلے اور پھر لڑنا شروع کیا۔ ہمارے کئی سپاہی مارے گئے اور بہت سے فصیل چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہندوؤں کے ایک دم اندر بھاگنے کا سبب یہ تھا کہ وہ سمجھے قلعہ نہیں بچ سکتا، لہٰذا پہلے انھوں نے اپنی بیویوں اور پاتروں کو جا کر مارا پھر ننگے ہو کے لڑنے مرنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے اپنے اپنے مقام سے دوبارہ حملہ کیا اور ہندوؤں کو فصیل پر سے مار ہٹایا۔ تب ان میں سے دو تین سو ہندو (راجہ) میدنی راؤ کے محل میں گھسے اور وہاں اس طور سے اپنے آپ کو ہلاک کیا کہ ایک شخص تلوار لے کر کھڑا ہوا اور دوسروں نے خوشی خوشی اپنی گردنیں اس کے آگے کاٹنے کو جھکا دیں۔ اس طرح ان کی بڑی تعداد واصل جہنم ہوئی۔

عنایتِ الٰہی سے یہ مشہور معروف قلعہ، دو تین گھڑی میں کسی سخت جنگ اور شاہی نوبت و علم آگے بڑھائے بغیر فتح ہو گیا۔ مقتول ہندوؤں کے سروں کا کلّہ منار چندیری کے شمال مغرب میں ایک ٹیکرے پر بنوانے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح کسی خاص تعجب کا اظہار کیے بغیر بابر نے راجپوتوں کی مجنونانہ بہادری کا ذکر ختم کیا ہے آیندہ اُن سے بھڑنے کی اور کوئی نوبت اُسے نہیں آئی۔

"گنگا پر ایک پُل"

جاں نثار خلیفہ کی پریشانی بے جا نہ تھی۔ ہر چند اس کا تقرر ابھی باضابطہ نہیں ہوا تھا، تاہم بننے والی سلطنت کا وہ گویا وزیر اعظم تھا — اگرچہ یہ سلطنت بھی ہنوز اس کے آقا کے خانۂ دماغ ہی میں تیار ہو رہی تھی — بہر حال اس کی چشم تصور کے سامنے ایک وسیع کشور کا عجیب منظر پھیلا ہوا تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ اور گروہ، کچھ مطیع و فرماں بردار، کچھ باغی اور لڑائی پر تیار، آزادی کے بھوکے یا بادلِ ناخواستہ محکوم، الگ الگ بولیاں بولنے والے بھرے تھے اور ان سب کو کسی طرح یکجا رکھنے کے لیے بادشاہ کی مضبوط قوت ارادی کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ ان میں سب سے سرکش مشرق کے افغان تھے جو شوریدہ مزاجوں کی فوج لے کر قنوج پر چڑھ آئے تھے۔ قنوج سے مردار نوج کے لیے آگرہ صرف دو دن کی مسافت پر تھا، حالانکہ بادشاہ وہاں سے سات دن کی منزل پر دور ایک مفتوحہ قلعے کے وسائل آب رسانی دیکھنے میں

منہمک تھا۔

تاہم شیر نے چند بری میں زیادہ تساہل نہیں کیا بلکہ آگرے کی بجائے سیدھا، جمنا پار اودھ اور لکھنؤ کی طرف جہاں بغاوت کا زور تھا، پلٹ پڑا۔ لشکر شاہی کی آمد آمد سُن کر باغی لشکر جلدی سے گنگا کے پار اُتر گئے اور اس عظیم دریا پر مقابلہ کرنے کی تیاریاں کیں جسے کشتیوں کے سوا عبور کرنا اُن کی دانست میں ممکن نہ تھا۔ انھیں اپنے ہاتھیوں پر اور اپنے سرغنہ بایزید اور معروف پر پورا بھروسہ تھا کہ شاہی فوج کھلی کشتیوں میں دریا سے اُتری تو گھاٹ پر مار مار کے اسے پسپا کر دیں گے۔ اُدھر بابر اور اس کے مہندس سمجھتے تھے کہ گنگا پر بھی کشتیوں کا پُل باندھا جا سکتا ہے۔ استاد علی رومی کو یقین تھا کہ اپنی منتخب توپوں سے میں اس کام میں مدد کر سکتا ہوں:۔

"جمعرات کو ہم قنوج کے پاس سے گزرے اور گنگا کے مغربی کنارے پر خیمہ زن ہوئے۔ طلایہ کے سواروں نے اوپر، نیچے گشت لگا کے کشتیاں پکڑیں اور چھوٹی بڑی تیس یا چالیس لے آئے۔ میر محمد جالہ جان (تختہ پُل تیار کرنے والا) کو مناسب جگہ جہاں پُل باندھا جائے اور ضروری مسالا جمع کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ پڑاؤ سے کوس بھر نیچے جگہ دیکھ کر آیا۔ چند مستعد ناظروں کو حکم ہوا کہ کام شروع کرائیں۔ استاد علی نے اسی جگہ کے قریب اپنی توپ نصب کی اور خوب پتھر کے گولے برسائے (اس کا حریف) مصطفیٰ ترک بھی آراؤں پر اپنی توپیں لایا اور ذرا آگے ایک ٹاپو پر انھیں جما کے گولہ باری کرتا رہا۔ پُل کے سرے سے اوپر کے رُخ ایک دمدمے سے تفنگچی برابر گولیاں چلاتے رہے۔

ملک قاسم مغل اور تھوڑے آدمی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار ہوئے اور کچھ دیر خوب لڑے.....

حتیٰ کہ قاسم کی جرأت بڑھی کہ وہ دشمن کے پڑاؤ کے نزدیک پہنچا اور تیر باری کی۔ اس پر پڑاؤ سے ایک جمعیت ہاتھی لے کر نکلی اور قاسم کو بھاگنا پڑا۔ وہ کشتی میں چڑھ گیا تھا لیکن ہاتھی نے آ کر کشتی کو ڈبو دیا۔ اس معرکے میں قاسم مارا گیا۔

"پُل بندھنے کے دنوں میں استاد علی پتھر کے گولے خوب چلاتا رہا۔ پہلے دن آٹھ، دوسرے دن سولہ چلائے اور پھر تین چار دن اسی رفتار سے چلاتا رہا۔ یہ گولے اس بڑی توپ سے داغے گئے جس سے رانا سانگا کی لڑائی میں کام لیا اور "غازی" نام رکھا گیا تھا۔ استاد نے ایک اور اس سے بھی بڑی توپ بنائی تھی۔ مگر وہ پہلا گولہ داغنے ہی میں پھٹ گئی۔ ہمارے تفنگچیوں نے مل کر جو باڑیں ماریں ان سے

دشمن کے بہت سے سپاہی بلکہ بھیر کے بھاگتے ہوئے مزدور اور سرپٹ دوڑتے گھوڑے مارے گئے۔

" افغان پُل بندھنے میں تاخیر پر تمسخر کرتے تھے۔ لیکن وہ چار شنبے کو تیار ہو گیا اور میں اس کا سرا دیکھنے گیا۔ جمعرات کو مکمل ہوتے ہی لاہوریوں اور پیادوں کی ایک جمعیت سبقت کر کے پُل سے دوسری طرف اُتر گئی ان کی تعداد کم تھی اور لڑائی بھی زیادہ نہیں ہوئی لیکن جمعے کو قلب اور میمنے میسرے کے بہت سے سپاہی پار ہو گئے اور ادھر سے افغان بھی ہتھیار باندھ کر ہاتھیوں سمیت مقابلے میں نکلے۔ عشا کے بعد تک فریقین میں لڑائی ہوتی رہی۔ مگر اس رات میں نے حکم دیا کہ جو لوگ پار اُترے تھے سب واپس اپنے پڑاؤ پر آ جائیں۔"

بابر اعتراف کرتا ہے کہ ہفتے کی سحر فوج کو واپس لانے کا عجیب سا خیال اس لیے آیا تھا کہ ٹھیک ایک سال قبل وہ نوروز سہ شنبہ کے دن سیکری سے فوج لے کر چلا اور چار دن بعد رانا سانگا سے لڑ کر غالب آیا تھا۔ اب گنگا پر بھی پُل اُترنے کے لیے چلا تو نوروز تھا اور اس کے دل میں آئی کہ اور چار دن ٹھہر کر ہفتے ہی کے دن افغانوں پر حملہ کرنا سازگار رہو گا۔

" اس دن ارابے پُل پر سے کھینچ کر صبح ہونے سے قبل دوسرے کنارے اتار دیے گئے اور دن نکلتے ہی ساری فوج نے پل عبور کرنا شروع کیا جس وقت طبلِ جنگ بجائے جا رہے تھے ہمارے جاسوس خبر لائے کہ دشمن فرار ہو گیا۔ چین تیمور کو حکم ہوا کہ تعاقب میں اپنا لشکر لے جائے...... اونٹوں کی چند قطاریں نیچے کے رُخ پایاب مقام سے پار ہوئیں۔ خود میں نے دریا عبور کیا اور اتوار کی شام ایک جھیل کے کنارے اُترا۔

" (اگلے) ہفتے لکھنؤ گیا۔ گومتی کے پار منزل ہوئی۔ اس ندی میں جا کر غسل کیا۔ معلوم نہیں پانی میرے کان میں چلا گیا یا سردی کا اثر تھا کہ سیدھا کان تنگ ہو گیا اور کئی دن تکلیف رہی۔ اودھ سے ایک دو کوچ باقی رہے تھے کہ چین تیمور کا ہرکارا پیام لایا کہ دشمن سرو ندی کے پار ڈٹا ہوا ہے۔ بادشاہ کمک بھجوائیں۔ میں نے قراچہ کے ماتحت کوئی ایک ہزار شمشیر زن روانہ کیے...... اس کے پہنچنے پر جب ان فوجوں نے ندی پار کی تو اُدھر عرف پچاس سوار اور تین چار ہاتھی تھے جو فوراً فرار ہوئے۔ چند کے سر کاٹ کر بھیجے گئے...... بایزید کا پیچھا کیا گیا مگر وہ ایک جنگل میں گھس کے بچ گیا۔ چین تیمور آدھی رات میں کوئی چالیس کوس تک پیچھا کرتا رہا اور اس کے اہل و عیال کے پڑاؤ تک گیا لیکن وہ بھاگ چکے تھے۔ تاہم اس نے ہر طرف سوار دوڑائے اور محمد باقی وغیرہ دشمنوں کو اس طرح کھدیڑتے پھرے جیسے بھیڑ بکری کو، تا آنکہ بایزید کے بال بچے مل گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔

میں انتظامات درست کرنے کی غرض سے اودھ کے قریب اسی مقام پر چند روز ٹھہرا۔ یہاں والوں نے

سات آٹھ کوس اوپر کے علاقے میں بتایا کہ شکار خوب ہوتا ہے۔ میر محمد جالہ بان کو بھیجا گیا کہ سرد اور گھاگرا ندیوں کے گھاٹ دیکھ کر آئے۔ جمعرات کو میں شکار کے ارادے سے سوار ہوا۔"

یہاں پھر بابر کے روزنامچے سے پانچ ماہ سے زیادہ کے حالات گم ہو گئے ہیں لیکن آیندہ اور آخری ہفتوں کی سرگزشت سے واضح ہوتا ہے کہ مشرقی ندیوں پر مقابلہ کرنے والے مغلوب کر لیے گئے۔ معلوم ہوتا ہے اسے امید تھی کہ یہ آخری معرکہ آرائی ہو گی۔ اس سال ۱۵۲۸ء کی گرمی (۹۳۴ھ) میں اس کی سلطنت بدخشاں کے پہاڑوں سے گنگا گھاگرا کے سنگم تک پھیل گئی تھی جو سڑک سڑک ایک ہزار میل (پانچ سو کوس) کی مسافت تھی۔ لہذا اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنی حکومت کے طور طریق کی نسبت وضاحت کر دے کہ وہ آیندہ کیا ہوگا؟

باب ہشتم

مُغلِ اعظم کی سلطنت
گلبدن بیگم کا سفر آگرہ

جنگی متعابلوں کے ختم اور برسات کے بعد "پادشاہ ہندوستان" نے اپنے اہل و عیال کو کابل سے بلوایا۔ دو سن رسیدہ خالائیں جو سمرقند کی خانماں خرابی میں ساتھ تھیں، پہلے ہی نو مفتوحہ ملک میں آ چکی تھیں۔ بابر نے چنگیزی خاندان کے جملہ افراد کو دوبارہ آگرہ میں آنے کی دعوت دی تھی، وہ اسی بلاوے پر آئی تھیں۔ لیکن کابل سے تمام اہل و عیال کو بلوانے کے معنی یہ تھے کہ بابر کابل سے تعلقات قطع کر رہا ہے۔ بڑے بیٹے تو خواجہ کلاں کے مشورے کے مطابق اپنی اپنی ولایتوں میں مقیم رہے۔ ورنہ محل سرا کے باقی سب افراد نے رخت سفر باندھا اور نوکروں اور پاسبانوں کی معیت میں خیبر کے راستے پر چل پڑے۔

ہر ایک کی آرزو تھی کہ پادشاہ کے لیے کوئی تحفہ لے کر حاضر ہو اور ہر ایک مشتاق تھا کہ باریابی کے وقت کیا پاتا ہے۔ گلبدن بیگم چھ برس کی تھی۔ یعنی قریب قریب اتنی بڑی جتنا کہ خود بابر پہلی دفعہ سمرقند جانے کے وقت تھا۔ وہ اپنی اصلی ماں کی بجائے بڑی بیگم ماہم کے ساتھ روانہ ہوئی اور خانزادہ بیگم، بی بی مبارکہ وغیرہ دوسری بیگمات کچھ روز بعد چلیں۔ ممکن ہے اس علیٰحدگی کا سبب اہل حرم کا اندر خانہ مناقشہ ہو۔ بہرحال ننھی گلبدن کے دل میں تو سب سے زیادہ لَو یہ لگی تھی کہ باپ سے آگرے میں کب ملنا ہوتا ہے۔ لکھتی ہے:

"یہ حقیر پُر تقصیر ماہم بیگم کے ہمراہ والد ماجد کے حضور میں ادائے آداب کے لیے گئی۔ جب ہم کول کے چڑیا باغ میں پہنچے تو دو پالکیاں اور تین سوار ملے جو والد نے ماہم کے لیے بھیجے تھے چنانچہ وہ فوراً کول سے آگرے روانہ ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت خود انھیں لینے باغ مذکور تک آنا چاہتے تھے۔ مغرب کے وقت کسی نے

آکر پادشاہ کو اطلاع دی کہ ملکہ راستے پر دو کوس دور رہ گئی ہیں۔ یہ سُن کر والد نے گھوڑا لانے کا بھی انتظار نہیں کیا بلکہ پیدل چل پڑے اور اس مکان کے قریب ماہم سے ملے جو لبعد میں میری ماں کو دیا گیا۔ بیگم پالکی سے اُترنا چاہتی تھیں مگر پادشاہ نے پالکی ٹھیرنے نہ دی اور اسی طرح خود بھی خدم کے ساتھ چلتے ہوئے انھیں اپنے محل تک لائے۔

ماہم نے پادشاہ سے ملاقات کے وقت حکم دیا کہ مجھے اگلے دن صبح کو آداب بجا لانے کی غرض سے حضور میں لایا جائے۔ اس روز ہمارے جلو میں پادشاہی نو سوار، نو کوتل گھوڑے پالکیوں کے گرد، اور بیگم کے تقریباً سو ملازمین اعلیٰ درجے کے گھوڑوں پر سوار لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے۔ قابل دید نظارہ تھا۔ والد کے وزیر خلیفہ اپنی بیوی سلطانم کے ساتھ نئے حمام تک پیشوائی کو آئے۔ میری بڑی دَدا نے باغ خورد پر مجھے پالکی سے اُتارا اور مسند بچھا کر اس پر مجھے بٹھا دیا تھا۔ انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ خلیفہ آئیں تو میں ان کی کھڑے ہو کر تعظیم دوں اور گلے ملوں۔ چنانچہ وہ آئے تو میں نے اُٹھ کر معانقہ کیا۔ پھر ان کی بیوی سلطانم آئیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ان سے کس طرح ملا جائے۔ میں دوبارہ اُٹھنا چاہتی تھی کہ خلیفہ نے منع کیا اور کہا یہ تمھاری خادمہ رہ چکی ہیں، ان کی تعظیم کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی آپ کے والد کا احسان ہے کہ اپنے قدیم خادم کی عزت بڑھائی اور آپ سے میری تعظیم کرادی اور مجھے ملنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کرنا ہمارا فرض ہے۔

"خلیفہ نے ۶ ہزار چاندی کے سکّے اور ۵ گھوڑے خود نذر کیے اور سلطانم نے تین ہزار نقد اور ۳ گھوڑے پیش کیے پھر اس نے کہا غریبانہ ماحضر تیار ہے اگر آپ نوش فرمائیں تو اپنے خادموں کی عزت بڑھائیں گی، میں نے قبول کیا۔ وہ مجھے بہت اچھے مکان میں لے گئے۔ جہاں شہ نشین پر گجراتی منقّش کا سرخ شامیانہ اور منقّش تکیوں کے سہارے قنات بندھی تھی۔ یہاں (خلیفہ کی حویلی میں) دسترخوان بچھایا گیا اور طرح طرح کے کباب تورمے، اور نان و شربت اور فواکہ چُنے گئے۔ چاشت کا یہ کھانا کھا کر میں پھر پالکی میں سوار ہوئی آداب بجالانے با دا حضور کے سامنے گئی۔ میں نے ان کے پاؤں چُومے۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر مجھے گود میں بٹھایا اور بہت سی باتیں پوچھتے رہے۔ اس حقیر کنیز کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی..... "

گلبدن اس روز بھاری بھرکم "ناشتے" کے بعد جس باپ سے ملاقی ہوئی وہ اس شخص سے مختلف تھا جو چار برس پہلے کابل سے ہندوستان روانہ ہوا تھا۔ ماہم نے اپنے سفر میں پانچ مہینے لگا دیے تھے جس کا

شاید یہ سبب ہو کہ وہ ہمایوں کے بغیر ہندوستان جانے سے رُک گئی تھی۔ بہر حال ملکہ اور اس کی سوتیلی بیٹی کے اُسی زمانۂ سفر (دسمبر ۱۵۲۸ء تا جون ۱۵۲۹ء) میں نئے مقبوضات کا بابر نے انتظام درست کیا اور ادھر اپنے گھر کا بندوبست کرنے میں برابر مصروف رہا۔ ان آخری دو سال میں اس نے کوئی نئی مہم اور فوج کشی نہیں کی اگرچہ ان حوصلہ مندیوں کا شوق ابھی تک معدوم نہ ہوا تھا۔ مگر اتنے بڑے ملک اور کثیر رعایا کے زیرِ نگیں آنے کے بعد لا محالہ اُسے زیادہ وقت ان کے معاملات کے انصرام میں دینا پڑتا تھا اور ادھر یہ مسئلہ حل کرنا تھا کہ نئی سلطنت میں اس کی اولاد کا قیام کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ضروری تھا کہ بیٹوں سے جو اب بڑے ہوتے جاتے تھے، زیادہ قریبی رابطہ قائم کیا جائے۔ وقت کی اس ضرورت کی بنا پر اس کا پہلا اقدام یہ تھا کہ ہمایوں کو ایک نصیحت آمیز خط بدخشاں بھیجا۔ تقریب یہ ہوئی کہ ہمایوں کے ہاں لڑکا، جس کا نام الامان رکھا گیا تھا، پیدا ہوا تھا۔ مضمون یہ ہے:-

"ہمایوں کے نام، جسے دیکھنے کا آرزومند ہوں۔ سلّمہ اللہ تعالیٰ

دو شنبہ کو بیان شیخ یہاں پہنچا اور خطوط لائے جن سے تمھارے حالات معلوم ہوئے، خدا کا شکر ہے اس نے تم کو بیٹا عنایت کیا۔ خدائے بزرگ و برتر ہمیشہ تمھیں ایسی ہی خوشیاں دکھائے۔ تم نے اس کا نام "الامان" رکھا ہے۔ خدا مبارک و مسعود فرمائے۔ لیکن تم جو مسند آرائے حکومت ہو، تم کو جاننا چاہیئے کہ عوام اسے "اَلمَن" (بہ معنی حملہ کر) یا "ایلمان" (بناوٹ) تلفظ کرتے ہیں۔ خدائے قدیر زمانہ دراز تک اسے اپنی امان میں رکھے اور اقبال مند کرے۔

تمھارے لیے بڑے کام کرنے کا وقت آتا ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ کامران کے ساتھ مہر و مروّت سے کام کرنا نہ بھولنا۔ تم کو معلوم ہے کہ ہر چیز میں اس کے پانچ حصّے کے مقابلے میں تم کو چھ حصّے دیے گئے ہیں۔ آئندہ ضبطِ نفس کو ہاتھ سے نہ دینا اور اس سے خوش دلی کی مفاہمت ہمیشہ قائم رکھنا۔ ذمہ داری کا بوجھ بڑے بیٹے پر ہی ہوا کرتا ہے۔

مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔ گزشتہ چند سال میں تمھارے بہت کم خط آئے اور آدمی ایک بھی نہ آیا۔ میں نے جسے تمھارے پاس بھیجا تھا، اُسے پلٹ کر آنے میں ایک سال لگ گیا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے؟ تم خطوں میں اپنے عزیز دل سے جدائی کا شکوہ لکھتے ہو۔ یہ

شکوہ بے جا ہے۔ حضرت سعدی قدس سترہ فرماتے ہیں کہ" بند و سلاسل میں بھی اپنے حال پر قانع رہ۔ جریدہ سفر میں بھی اپنی منزل خود تلاش کر۔"

بادشاہوں کو پابند رہ کر، تنہا کام کرنا ہوتا ہے۔ اُنھیں تنہائی کی شکایت نہ کرنی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ تم نے میرے حکم کی تعمیل میں خط لکھ دیا۔ مگر اسے دوبارہ پڑھا بھی تھا؟ اگر پڑھتے تو مطلب نہ سمجھ سکتے۔ مجھے اس کا مطلب نکالنے میں کافی دردسری ہوئی۔ کیا تم نے نثر میں کوئی معمّا تیار کیا ہے یقیناً ایسا نہ ہوگا۔ پھر ہجے، اگرچہ مائیقری تو ہیں مگر اچھے نہیں ہیں۔ غرض ابہام کی وجہ سے خط کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور اس کا سبب مسجّع لفاظی ہے۔ آیندہ الفاظ میں تکلّف و تصنّع سے پرہیز کرو۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف لکھنا چاہیے تمھیں لکھنے میں بھی زحمت نہ ہوگی اور پڑھنے والے کو بھی پریشانی نہ ہوگی۔

اب تم ایک کار اہم شروع کر رہے ہو۔ تجربہ کار سرداروں سے مشورہ کرو اور ان کی صلاح مانو۔ دن میں دو مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی اور امیروں کو مشاورت کے لیے بلایا کرو۔ ان کا آنا اتفاق پر منحصر نہ رکھو۔ جو مسئلہ زیرِ غور ہے اس کی ہر بات اور کارروائی کا تصفیہ کرنے میں پہلے ان لوگوں سے مشورہ لے لینا چاہیئے۔ مکرّر یہ کہ خواجہ کلاں مدّت سے میرے خاندان کا ہمراز و رفیق ہے۔ تمھارے معاملے میں بھی اسے ہمراز رہنا چاہیے۔ خدا کے فضل سے تمھارے معاملات میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی اور کچھ دن بعد تمھیں کامران کی غالباً ضرورت نہ رہے گی۔ اس صورت میں اسے میرے پاس آنے دینا۔

ایک اور بات یہ کہ تسخیرِ کابل کے بعد سے ہمیں فتوحات پر فتوحات نصیب ہوئیں۔ اس لیے قبضہ کابل کو میں بہت مسعود خیال کرتا ہوں اسے اپنے خالصہ (ملکِ شاہی) میں داخل کر لیا ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی طمع نہ کرے۔

جب تک سپاہ پوری طرح تیار اور مجتمع نہ ہو جائے، کوئی فوج کشی نہ کرنا۔ بیان شیخ کو زبانی بھی سمجھا دیا ہے وہ سب باتیں تم سے کہے گا۔۔۔ اس سب کے بعد مکرّر دعائے خیر اور اشتیاقِ دید تحریر کرتا ہوں۔

نوشتہ روز پنجشنبہ۔ اسی مضمون کے خط کامران اور خواجہ کلاں کو لکھے اور روانہ کیے گئے ہیں۔"

بظاہر اس خط کا ہمایوں نے جواب نہیں بھیجا - وہ دل کی بات کم کسی کو بتاتا تھا اور اپنے مستقبل کی سنجو
نجوم کی علامتوں میں کرتا تھا - حیدر میرزا جو اب بڑا ہو گیا تھا ، انہی دنوں کاشغر سے آیا - لکھتا ہے کہ ہمایوں پر ایک
"مولانا" کے بڑے اثرات بہت بڑھ گئے تھے اور وہ افیون کھانے لگا تھا - تاہم "کار اہم" کی ذمہ داری لینے پر
اس نے باپ کے حکم کی تعمیل کی - یعنی بدخشاں اور کابل کی فوجیں جمع کر کے ازبکوں کے خلاف بڑھا جو اس کی
سرحدوں پر برابر فتنہ و فساد اٹھاتے رہتے تھے - اصل میں تقدیر کا چکر ان شمال مغربی اقطاع میں دوبارہ
پھرتا نظر آتا تھا - خراسان میں شیبانی کے جانشین ازبک سردار عُبید خاں کو ایرانی شاہ طہماسپ نے پسپا اور
قتل کر دیا تھا اور بابر، جس کا بیان ہے کہ عبید خاں کو جادوگروں نے گمراہ کیا ، اسے ایک خدا ساز موقع سمجھا
کہ بیٹا سمرقند لینے کی ایک اور کوشش کرے کیونکہ خود وہ ہندوستان چھوڑ کر یہ مہم نہ لے جا سکتا تھا -

لیکن ہمایوں اور اس کا بھائی قوت و فراست کسی میں بھی باقی ماندہ سلاطین اُزبک کے ہم پلّہ نہ نکلے -
ہمایوں نے سرحدی قلعہ حصار کو پھر جھپٹ لینے میں خاصی استادی دکھائی لیکن سمرقند کے قریب تر مقامات
میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ احساس ناکامی لیے ہوئے واپس چلا آیا - یہ بھی یقینی ہے کہ ماں کے خط نے جو تاکیداً
آگرے بلا رہی تھی ، اسے سوچ میں ڈال دیا ہو - پھر حسب عادت مہینوں گومگو میں رہ کر وہ بغیر اطلاع بدخشاں
سے چل پڑا اور اپنے کم عمر بھائی ہندال کو بلا کر اپنا قائم مقام بنا دیا - بابر کو خبر بھی نہ کی تھی لیکن جب اس کو معلوم
ہوا تو اس نے ہمایوں کے فیصلے کو بے تامل منسوخ کر دیا - خود ہمایوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ نئی عہد سلطنت
بدخشاں سے اسپ سوار ایک دن میں کابل پہنچ گیا جو فی الواقع بڑا کارنامہ تھا - کابل سے
اس نے آگرے کی راہ لی -

یہ سال، ۱۵۲۹ء، بیرونی دنیا میں جس کی مغل درباروں کو ابھی خبر تک نہ تھی، کئی قابل ذکر واقعات
کا حامل گزرا ہے - عثمانی سلطان سلیمان اعظم نے بار برداری کی گاڑیاں جلا دیں اور توپیں لے کر ویانا کی شہر پناہ
سے ہٹ گیا کہ اپنی توجہ مشرقی سمندروں کی طرف معطوف کرے کیونکہ اب وہاں پرتگیزی بیڑے دُور دُور
تک گشت لگا رہے تھے اور البوکرک کی درخشاں بحر نوردی سے گوآ میں ان کا مضبوط گڑھ اور گنگا کے
دہانے نیز چاٹ گام اور سیامی ساحل پر جگہ جگہ بحری چوکیاں بن گئی تھیں - لیکن گوآ کے فرنگی تاجروں
کا ابھی تک صرف جنوبی ہند کی سلطنت وجیا نگر یا شاہان بنگالہ سے سابقہ پڑا تھا - البتہ ان کے سفیر و سوداگر
(اکثر یہ دونوں کام ایک ہی جماعت انجام دیتی تھی) شاہ طہماسپ کے نشائستہ دربار تک ، کبھی مسجد کبود والے

تبریز میں اور کبھی اصفہان میں رسائی حاصل کر رہے تھے۔ تبریز میں سن رسیدہ بہزاد ابھی تک نوجوان انجلیکو کی سی چابک دستی سے قلمی تصویریں بنا رہا تھا اور وہاں کے بڑے کتب خانے کا منتظم تھا۔ سفیر سوداگروں کو ایران کی روز افزوں خوش حالی اور بیداری میں چڑھتے سورج کی حرارت محسوس ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے شیبانی کی ساختہ سلطنت جو از منہ وسطیٰ کی بدوی حکمرانی کی آخری یادگار رکھتی، مغربی یورپ سے دُور پڑی تھی اور اس کا رابطہ تھا بھی تو یا اندرونی غیر متمدن اقوام سے اور یا موسکو کے اپنے تاجروں سے جو دُور دُور گشت لگاتے ہوئے ادھر جا نکلتے تھے۔ عجیب واقعہ ہے کہ پہلا فرنگی جو ہندوستان کے مغل دربار میں وارد ہوا ایک ترک امیر البحر تھا کہ پرتگیزوں کو گوآ سے نکال باہر کرنے کے ارادے سے بیڑا لے کر چلا مگر طوفان نے اس کے جہازوں کو برباد کر دیا اور خود اسے ساحلِ ہند پر لا پھینکا۔ لیکن یہ واقعہ بھی بابر کے بعد اگلی نسل یعنی ہمایوں کے آخری عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

جملہ سلاطین، خوانین، عمائد و امرا نذر لاتے ہیں

اس اثنا میں بابر نے بہ حیثیت پادشاہ اپنا پہلا دربار منعقد کیا۔ ان شتاب رو ایام میں اس کا روزنامچہ کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا ہو گیا ہے۔ اس جشن عام یا تماشا کرانے کی وجوہات کی وہ کوئی صراحت نہیں کرتا نہ یہ لکھتا ہے کہ مہمانوں کو کس طرح دعوت دی گئی تھی۔ جشن ترک مغل نمونے کے مطابق اور بظاہر فتوحات کے اعلان کے نتیجے میں منعقد ہوا تھا جسے ہر طرف نشر کیا گیا تھا۔ اسی قسم کا سابقہ اعلان وہ صلائے عام تھی جو بابر نے آلِ چنگیز و تیمور کو آگرے آنے کی دی تھی۔ اپنے تیسرے فرزند عسکری کو بھی اس نے انہی دنوں بلوایا اور شمشیر و کمر شاہانہ خلعت، توغ و علم وغیرہ سپہ سالاری کے جملہ لوازم دے کر نوازا تھا۔ جشن منانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو گئی کہ پادشاہ کے پہلے پوتے کی ولادت کا باضابطہ اعلان کیا جائے۔

غرض جو سبب بھی ہو، یہ نمائش پادشاہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ کرائی گئی تھی اور اس سے قبل جہاں تک معلوم ہے۔ بابر نے ایسا دربار عام نہیں کیا تھا۔ ہندوستان میں آیندہ مغل سلاطین کے دربار جس شان سے منعقد ہوئے اس کے مقابلے میں آگرے کا بابری جشن بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بابر اس سے نہایت لطف اندوز ہوا اور اسے بڑا عمدہ ہنگامہ بتاتا ہے:-

"ہفتے کے روز باغ میں جشن ہوا۔ خس پوش بنگلے میں میری نشست تھی۔ دائیں جانب محترم علمائے اور سمرقند سے آئے ہوئے دُوسرے مُلّا اور حُفّاظ بیٹھے۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر شامیانہ تان کر قزل باش سفیر دل

کو جگہ دی گئی تھی۔ میرے قریب ہی عسکری، خواجہ کلاں، خلیفہ اور خواجہ عبید اللہ احراری کے ایک پوتے تھے۔ بائیں جانب ازبک سفیر اور راجستھان و بنگالہ کے ہندو وکلا تھے۔ دسترخوان بچھائے جانے سے پہلے تمام سلاطین، عمائد و امرا نے زر سرخ و سفید و سیاہ اور دیگر اجناس (پارچہ) نذر گزرانیں۔ میں نے زیر انداز بچھوا کر حکم دیا کہ یہ نذور ان پر انبار کر دی جائیں جس وقت نذریں گزرانی جا رہی تھیں، سامنے دریا کنارے مست اونٹوں ہاتھیوں اور مینڈھوں کو لڑایا گیا اور پہلوانوں کی کشتیاں کرائی گئیں۔

(بہ تصحیح مترجم) کھانے سے فراغت کے بعد خواجہ کلاں کو تن زیب کا جامہ جس پر کارچوبی پھول تھے عنایت کیا گیا۔ ازبک وارغون سفیروں کو زر لبفت کے نیم آستین دیے۔ بڑے سفیروں کو ایک ایک مثقال سونا چاندی۔ علیٰ ہذا و بڑے خواجہ (مشائخ) کو زر و نقرہ تول کر عطا کیا گیا۔۔۔۔ معصومہ (بیٹی) اور ہندال آگرے میں نہ تھے، ان کے نوکروں کو خلعت اور سینہ بند مرحمت ہوئے۔ میر محمد جالہ بان نے گنگا کا پل باندھنے میں قابل تعریف کام کیا تھا، اسے اور دو بہادر تفنگچیوں کو ایک ایک خنجر دیا۔ استاد علی رومی کے فرزند اور چینیہ سد ھانے والے ولی کو بھی خنجر عنایت ہوئے۔

اندجان سے میرے ساتھ گھر بار تج کر دشت و صحرا چھاننے والے رفیقوں کو (جو فرغانہ چھوڑنے کے بعد کوہ سیاہ کی گھاٹیوں میں میرے ہمراہ پھرے) نقرئی کام کے لباس اور دوسرے عطیات دیے گئے۔

آش نوشی کے وقت ہی ہندوستانی بازی گروں اور نٹوں کو حکم ہوا کہ اپنے کرتب دکھائیں۔ یہاں کے نٹ ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ پہاڑوں کے پار ہماری ولایات میں انھیں کوئی نہیں جانتا۔ ان میں سے ایک تماشا یہ ہے کہ ایک حلقہ پیشانی پر، دو دو اپنے گھٹنوں، انگلیوں اور پاؤں کے انگوٹھوں پر لگا کر وقت واحد میں انھیں گھماتے ہیں۔ ایک کرتب یہ ہے کہ (بہ تصحیح مترجم) مور چال چلتے وقت ایک ہاتھ بھی زمین سے اٹھا لیتے ہیں اور اس میں اور ادھر پاؤں میں حلقے ڈال کر پھراتے ہیں۔ ہمارے ہاں دو نٹ ایک دوسرے کو پکڑ کر قلا کھاتے ہیں مگر یہاں والے تین تین مل کر کئی قلابازیاں لگاتے ہیں۔ ایک کرتب یہ ہے کہ ایک نٹ ۶، ۷ گز کا بانس پیٹ پر رکھ کر سیدھا بلند کرتا، دوسرا اس پر چڑھ کر اوپر کھیل تماشے دکھاتا ہے۔ ایک کرتب یہ ہے کہ ایک لڑکا نٹ کے سر پر چڑھتا ہے، نیچے والا اسے لیے لیے کرتب دکھاتا ہے اور یہ لڑکا سر کے اوپر اچھل کود دکھاتا اور برابر اپنا توازن قائم رکھتا ہے۔ ذرا نہیں لڑکھڑاتا۔ کئی رنڈیاں بھی اس موقع پر آئیں اور اپنا ناچ دکھایا۔

مغرب کے قریب سونے چاندی اور مسی سکے کی بکھیر کرائی گئی۔ اس کے لوٹنے میں بڑا شور اور چھینا

چھوٹی ہوتی، لطف آگیا۔ مغرب اور عشا کے درمیان پانچ چھ معزز مہمانوں کو رات کی نوبت بجنے تک میں نے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر کشتی میں دریا کی سیر کی۔ دوسری صبح باغ "ہشت بہشت" میں آگیا۔

دوشنبہ، جب عسکری مسلح لشکر کے ساتھ سفر پر جانے کے لیے تیار ہوا تو رخصت ہونے حمام میں میرے پاس آیا اور مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔"

بادشاہ کے اس پہلے دربار میں بعض باتیں ضرور خلاف معمول نظر آئیں گی۔ بیرونی ممالک جن سے ابھی تک سفارتی تعلقات پوری طرح متعین نہیں ہوئے، ان کے سفیروں کی رسمی خاطر تواضع واجبی سی کی گئی۔ اسی طرح ہندوستان کے کسی رئیس، راجہ کو عطائے خلعت و اعزاز کا ذکر نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں پرانے رفیقوں کو بہت کچھ انعام اکرام دیے جاتے ہیں۔ وہ ان قبائلی سرداروں تک کو اس موقع پر نہیں بھولتا جنھوں نے پہلی مرتبہ کابل آتے وقت پہاڑوں سے گزرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ علیٰ ہذا، رئیس و راجہ کی بجائے جان باز چیتے کے شکاری، توپچی، تفنگچی مراحم خسروانہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ یہ بات کہ اس کی زندگی اور بڑے بڑے کارنامے چند مردوں اور خواتین کی وفاداری سے ظہور میں آئے، بابر کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی اور نہ اپنی ابتدائی زندگی کے سوانح جو فرغانہ کے دیہات اور کھیڑوں میں، پہاڑی چراگاہوں کے قبائلی لوگوں میں گزرے تھے اسے کبھی فراموش ہوئے کیونکہ اس وقت جاہ طلب طبقۂ امرا کے افراد عموماً اس کے چھپے ہوئے دشمن تھے۔ اس کی تزک میں بار بار یہ جملہ آتا ہے اور اسی سے گلبدن بیگم نے نقل کرنا سیکھا ہے کہ میرے آدمیوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ، امرا اور عوام (دونوں) تھے۔ اوائل سولھویں صدی کی دوسری خود نوشت سوانح میں تلاش کیجیے تو شاذ و نادر ہی یہ جملہ آپ کی نظر سے گزرے گا۔

آگرہ کے جشن عام میں "خواجگان" یعنی بزرگان مشائخ کی جماعت محض تبرک نظر آتی ہے۔ سمرقند کے دنوں میں بار بار بابر کو ان کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ خواجہ کلاں جو دونوں بڑے بیٹوں کے مشیر کی خدمت انجام دیتا تھا، کابل سے بلایا گیا تھا۔ ایسے ارباب تدبر کے مقابلے میں دیکھنا تھا کہ آئندہ اس کے فرزندوں اور دربار آگرہ میں مذہبی ذہنیت والوں کا کتنا دخل رہ سکے گا۔

ہندوستان کی معاشرت میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی گہری خلیج موجود تھی۔ دہلی کے لودھی سلاطین میں، ہندو راجاؤں کا استبدادی مذاق آ گیا تھا۔ اسلامی نہ سہی، ترکی نقطۂ نظر سے ہندوؤں کی ذات پات کی تفریق انوکھی چیز تھی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اسے اہل حرفہ میں تقسیم کار کا ایک عجیب طریقہ سمجھ کر روا رکھا تھا۔

مجموعی طور پر ابراہیم لودھی کی جابرانہ حرص و آز، سکندر لودھی کے مذہبی تعصب اور رانا سانگا کی نخوت کے مقابل بابر کی رواداری اور مروّت نہایت نمایاں تھیں۔ بایں ہمہ پہاڑ پار کا قلندر بادشاہ ابھی تک ایسے وسائل نہ رکھتا تھا کہ اپنی تخت گاہ کے زیر اندازے سے آگے تک اپنے اثرات کو وسیع و استوار کرلے۔ ادھر وقت کا دھارا تیزی سے بہا جا رہا تھا۔

حکومت چلانے کے اقدامات

آگرے کے "تماشے" میں ایک گروہ کی غیر حاضری نمایاں تھی یعنی تیمور کو کلتاش، جنگ جنگ وغیرہ آزمودہ کار سپہ سالار جنھوں نے ہندوستان کی لڑائیاں جیتیں، انعام لینے کو حاضر نہ تھے۔ انھیں سندھ کے مبہم خطّے کی تسخیر اور تنظیم کے لیے جنوب مغرب میں بھیجا گیا تھا جہاں دریائے سندھ کے کنارے ریگستان بن گئے ہیں اور بلے سرے دیہاتیوں کو آئے دن بلوچیوں سے گتھم گتھا رہنا پڑتا تھا جو لڑائی کی سُن گُن پاتے ہی غول کے غول چھاپے مارنے آجاتے تھے۔ مذکورہ بالا سردار وہ لوگ تھے کہ پانچ سال بیشتر بابر کی طرف سے لاہور میں متعین رہے اور ملتان و سندھ کے اضلاع سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔

ابھی تک مصروف پادشاہ کے پاس حکومت کرنے کا آلہ صرف یہ تھا کہ فوجی سرداروں کو جاگیردار بنا کر اضلاع میں بھیجا جاتا اور وہ اپنے لشکر سے سرکشوں کو قابو میں لا کر ایک قسم کا امن و انتظام قائم کرتے اور مالگزاری وغیرہ وصول کر لیا کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بادشاہی سپاہ ابھی تک میدان میں تھی اور غیر عسکری عمّال کا بھی کوئی نہ کوئی فوجی عہدہ ہوتا تھا۔ خواجگی مدی ایک لشکر کا سالار رہی تھا اور بوڑھا کتاب دار عبداللہ کتوا بھی جنگ میں لڑنے آیا تھا۔

اطمینان سے سوچنے کی فرصت ملتے ہی بابر نے حکم دیا کہ آگرے سے براہ لاہور کابل تک سڑک ناپی جائے۔ ہندوستان کا یہ راستہ جس سے وہ آیا ابھی تک یہاں کے قیام کے لیے نا گزیر [illegible] اس کی سلامتی پر نتائج کی سلامتی کا انحصار تھا۔ سڑک کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ سب سے مقدم یہ تھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برج بنا کے ڈاک کے چند گھوڑوں کی چوکیاں حفاظت کے لیے تیار کی جائیں۔ یہ چوکیاں جہاں بادشاہی خالصہ علاقے میں نہ تھیں وہاں متعلقہ جاگیرداروں کی تعمیر اور نگہداشت کے خرچ کے ذمے دار قرار دیے گئے۔ ہر نئے کام کے سلسلے میں لازماً دوسری ضرورتیں

پیدا ہوئیں۔ سڑک کے فاصلے اور برجوں یا میناروں کی بلندی ناپنے کی غرض سے مغل عمّال کو مقررہ پیمانے مہیا کیے گئے جو ہندوستان میں کابل کے پیمانوں سے مختلف تھے۔ اس" یوں ناپو" کے نقشے میں فاصلے کی پیمائش کا حساب قدموں سے، قدموں کا بالشتوں سے، ان کا چار انگشتوں سے اور آخر میں ہر انگشت کو چھ دالوں سے مقرر کیا گیا۔ ہندوؤں کے اعداد جو لاکھوں کروڑوں سے چل کر مہا سنکھ تک جاتے تھے۔ آن اول مغلوں کی خاصی پریشانی کا باعث ہوئے جنھیں اپنے وطن میں سیدھے سادھے سینکڑے اور ہزار ہی تک کا حساب کرنا ہوتا تھا۔ ان کے زیورات عموماً چاندی پر فیروزہ، پکھراج اور قلیل تر یاقوت کے نگ جڑ کر بنائے جاتے تھے۔ ہندوستان اور راجستھان میں الماس، زمرد اور بڑے بڑے موتیوں کی آب و تاب دیکھ کر وہ کسی قدر متعجب ہوئے لیکن ابھی اس دولت کی زیادہ حرص ان میں نہ ہوئی تھی۔ ہندوستان کے قیمتی کپڑے تن زیب، زربفت وغیرہ بھی انھیں کارآمد کی بجائے نمائشی زیادہ معلوم ہوئے البتہ اُن کی خواتین ان کی فریفتہ ہوگئیں۔

سب سے بڑی ضرورت مواصلات کا سلسلہ قائم کرنے کی تھی اور اس باب میں مغلوں نے مقامی انتظام کو ترقی دی۔ تیز رفتار سوار ڈاک، چوکی کے گھوڑوں سے کام لینے اور بابر کے متحرک دربار کو اس کے عمال سے باخبر رکھتے تھے۔ ڈاک کا اس نے خاص عامل مقرر کیا جسے بیسا دل کہتے تھے اور وہ اس کے تحریری احکام بہ عجلت ہر جگہ پہنچانے کا ذمہ وار تھا۔ ملک کے دوسرے آئین اور محکمے ابھی تک بدنظمی کی حالت میں تھے۔ وصولِ محاصل اور سکّے کی بھی یہی حالت تھی، اور زبان کا مسئلہ بھی کچھ کم ٹیڑھا نہ تھا۔ کیونکہ مغلوں میں مذہبی روایات کی عربی کے ساتھ ادبی اور مجلسی زبان فارسی اور زیادہ مانوس چغتائی ترکی تھی اگرچہ اس کا اب رواج کم ہوتا جاتا تھا۔ ان معیاری السنہ کو ہندوستان میں پشتو، ہندوستانی اور راجپوت اور بنگالیوں کی زبانوں سے سابقہ تھا اور بہاری اور بہت سی علاقوں کی بہت سی بولیاں ملیں چونکہ فوجی چھاؤنیاں ابھی تک نظم و نسق کا بھی مرکز تھیں لہٰذا ان کے آس پاس وہ مخلوط مشترک بولی تیار ہونے لگی جس میں اہلِ عسکر فارسی اور ہندوستانی جملے ملے جلے بولتے تھے۔ اردو یا لشکر کی یہی نئی زبان شمال مغربی ہندوستان کی اردو بننے والی تھی[1]۔ بابر کو جو کابل تک سب سے خود ہی باتیں کیا کرتا تھا، ہندوستان آکر ترجمان ساتھ رکھنے پڑے۔ اسی طرح نئی نئی ہنگامی ضرورتوں کے واسطے اس نے مستعد اور کاردان اشخاص کا انتخاب کیا۔ چونکہ حکومت کا باقاعدہ نظام

---

[1] مصنف نے اُردو کے متعلق یہی عام اور فرسودہ نظریہ دہرایا ہے مگر یہ پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ مترجم۔

نہ تھا، اس نے ذمہ داری کا ایک وقتی سلسلہ بنالیا جیسے توپوں کے متعلق جملہ کام استاد علی قلی کی نگرانی میں تھے، اسی طرح آگرے کی عمارات میں حزدوسعں پیداج کاریگر مقرر کیے اگرچہ سرکاری تعمیر کا کام ابھی بڑے پیمانے پر مشکل سے شروع ہوا تھا۔

محاصل کی وصولی میں اس کے جاگیردار سرداروں نے وہی قدیم طریقہ جو کاشتکار و زمیں دار کے درمیان چلا آتا تھا، بجنسہ قبول کرلیا۔ کم سے کم اصول یہی تھا اور اس پر عمل ہر علاقے میں کمی بیشی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اٹاوہ کے مہدی خواجہ جیسے بڑے جاگیرداروں کو واقعتہً کیا مالیہ ادا کیا جاتا تھا، اس کا انحصار بارش، فصل، رعایا کی خوش حالی بدحالی اور پھر محصل کی مستعدی پر تھا۔ دور کے (دیسی) زمیندار جو اپنے دیہات کے مالک تھے، بادشاہی خزانے کو عموماً پیداوار کا عُشر ادا کرتے تھے مگر یہ بھی آگرے سے ان کے قریب یا بعید ہونے پر منحصر تھا۔ سرحدی رئیس، امیر، سالانہ خراج بھیجتے تھے۔ یہ اکثر قلیل زر نقد رسم پوری کرنے کے لیے ہوتا تھا، جیسا کہ یوسف زئی اور افریدی قبیلوں کے سردار جو خود چھاپے مارنے میں ماہر تھے۔ لہذا بابر کی تاختوں کو نہیں بھولے تھے۔ پنجاب کو خانہ جنگی کی وبا سے نجات نہیں ملی تھی اور ملک سندھ یا مشرق میں گنگا کے دوآبوں سے ابھی کوئی مالیہ وصول نہ ہوتا تھا۔

ڈرے ہوئے لوگوں میں امن و اطمینان قائم کرنے اور بہتری کی امیدیں دلانے کی غرض سے یا جیسا کہ خود لکھتا ہے ان کی ڈھارس بندھانے کے لیے بابر کو پہاڑی قلعوں سے دریا کے بیلوں تک مسلسل سفر کرنا پڑتا تھا اور لامحالہ فرماں روائی گھوڑے کے زین پر بیٹھ کر ہو رہی تھی۔ مقامی مالی نظامات کو بدستور رہنے دینے کی وجہ بھی غالباً یہ تھی کہ کسی تبدیلی سے نئی مشکلات پیدا ہو جاتیں لہذا نسبتہً کم تر خرابی کو برداشت کرلیا۔ پھر جنوبی سرحد کی حفاظت کا مسئلہ بھی طے کرنا تھا جس کی صحیح حدبندی نہیں ہوئی تھی۔ بابر نے پہلے ادھر توجہ کی۔ راناسانگا کے بیٹے بکرماجیت سے رنتھنبور کا بڑا قلعہ لے لیا اور عوض میں اسے زیادہ دور کا علاقہ باج گزاری کے وعدے پر عنایت کیا۔ اسی زمانے میں گوالیار کی دوبارہ سیر کی۔ یہ شہر اور قلعہ سرسبز دامن کوہ میں بلندی پر واقع اور اس کا بت خانہ مشہور تھا۔ جس میں چٹان تراش کر ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں بنائی تھیں۔

لکھتا ہے کہ "پھلواری کے باغ سے سوار ہو کر ہم گوالیار کے مندر دیکھنے چلے۔ بالائی منزل میں پتھر کی کرسی ہی سے بتوں کو اوپر تک تراشا گیا ہے اور نیچے کے تہ خانوں میں چٹانیں تراش کر مورتیاں بنائی

ہیں۔ یہاں کی سیر کر کے میں شمالی جانب بڑے باغ میں گیا جسے رحیم داد نے ہتیا پول (ہاتھی دروازے) کے باہر بنایا ہے۔ وہاں اس نے کھانا تیار کرایا تھا۔ اس دعوت میں عمدہ عمدہ کھانے چنے گئے تھے اسی کے ساتھ چار لاکھ کی مختلف اشیا اور زر نقد (رحیم داد نے) نذر گزرانا۔

چار شنبے کو ہم آبشار دیکھنے گئے۔ اسے گوالیار سے چھ کوس پر بتاتے ہیں لیکن مجھے سواری میں مشکل سے اتنا معلوم ہوا۔ ظہر کے بعد ہم آبشار پر پہنچ گئے۔ یہاں پہاڑ کی چٹانوں سے پانی بہ کر ایک حوض میں آتا ہے۔ اتنے فاصلے پر جتنی گھوڑے کی چرائی کی رسی لمبی ہو۔ مقدار میں ایک پن چکی چلانے کے لائق۔ ہم نے آبشار کے اوپر بیٹھ کر معجون کھائی پھر ایک اونچے ٹیکرے پر جا کر گویّوں کا گانا سنا۔ ہمراہیوں کو جنھوں نے پہلے نہ دیکھے تھے میں نے آبنوس کے درخت دکھائے۔۔۔۔۔۔۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم سوار ہو کر راستے میں ایک مقام پر دو گھڑی سوئے اور پھر دن کی پہلی نوبت کے وقت گوالیار کے بڑے باغ میں پہنچ گئے۔"

شیر ابھی تک وقت سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی رات چھت کے نیچے بسر کرتا تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ گیارہ برس کی عمر سے میری دو عیدیں کبھی ایک مقام پر نہیں آئیں!

اس نے ہندو مندروں کو توڑنے یا بتوں کی صورتیں بگاڑنے کا اقدام نہیں کیا جیسا کہ محمود یا سکندر (لودھی) پہلے بادشاہوں نے کیا تھا۔ کنواہہ میں فتح پانے کے بعد ہندوؤں کو بھی اپنی رعایا کا ایک عنصر سمجھ کر اپنے دامن حکومت میں لینا قبول کیا (جیسا آیندہ اس کے پوتے اکبر نے) گوالیار کے مندروں کی نسبت لکھتا ہے کہ بتوں سے قطع نظر، ان کے مکانات مسلمانوں کے مدرسوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مجالس شوریٰ میں بھی اپنے اُمرا کے ساتھ اب ہم "امرائے ہند" کو شریک ہوتا سنتے ہیں۔ رنتھنبور کی تحویل کے سلسلے میں اس نے خاص طور پر وہاں کے ایک پرانے ہندو ملازم کے بیٹے دِیوا کو بلایا اور بکرما جیت کے سفیروں سے گفت و شنید کر کے "انھی کے طور طریق کے مطابق" قلعہ حوالے کرنے کی شرائط طے کرنے کا کام سپرد کیا۔ انھی ایام میں ہرات کے دور دراز رشتہ داروں کو ایک خط میں تحریر کرتا ہوں کہ" باغیوں کی جانب سے ہندوستان میں اطمینان ہو گیا اور مشرق یا مغرب میں ہندوؤں کی طرف سے بھی فکر نہیں رہی۔ تا بہ اللہ تعالیٰ شامل حال رہی تو جو کچھ پیش نظر ہے اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن تدبیر کروں گا۔"

"ہندوستان میں ایسے خربوزے"

مذکورہ بالا کلمات شیر کے دلی یقین کا پتا دیتے ہیں۔ تمام ناجنس مقبوضات کو ایک منظم سلطنت کی شکل میں لانے کا عظیم کام انجام دینے میں جو لوگ اس کے شریک تھے، ان سب میں معلوم ہوتا ہے، بابر سب سے کم فکر مند تھا۔ تاہم ایک خط میں خواجہ کلاں کو اپنی دلی آرزو صیغہ راز میں منکشف کرتا ہے کہ کسی طرح کابل آنے کی فرصت مل جائے: "اپنی مغربی ولایت میں آنے کا اتنا اشتیاق رکھتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ ہندوستان کے معاملات اب خاصی طرح درست ہو گئے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب خدا چاہے تو ملک میں کامل امن اور انتظام قائم ہو جائے گا۔ جیسے ہی یہ ہو گیا، میں کابل کی جانب چل پڑوں گا۔ وہاں کی راحت و مسرت کس طرح فراموش کر سکتا ہوں"۔ پھر لکھتا ہے کہ کوہستان (بدخشاں) کا خربوزہ تراشا تو وطن کی یاد اس قدر غالب آئی کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بعض دفعہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر واقعی بابر اس خیال میں تھا کہ جتنا جلد ہو سکے خواجہ کلاں اور ہمایوں سے جا ملے اور تمام مغربی لشکروں کو جمع کر کے ایک مرتبہ اور سمرقند دوبارہ واپس لینے کی آخری کوشش کرے۔ یہ خیال ان لفظوں سے ناشی ہوتا ہے کہ "جو کچھ پیش نظر ہے، اسے حاصل کروں گا"۔ لیکن ایسا قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ دو مہینے قبل سمرقند کی مہم اس نے (خواجہ کلاں کے حسب مشورہ) اپنے دو بیٹوں کے تفویض کی تھی اور غالباً اسے امید تھی کہ پوری طرح کامیاب نہ ہونے پر بھی وہ کچھ فوائد اور شہرت و ناموری حاصل کر سکیں گے۔ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ جب ضرورت نہ رہے تو کامران کو باپ کے پاس آگرے بھیج دیا جائے۔ اس خط کی تحریر کے وقت ہمایوں واقعتہً کوچ کر کے لب آمو پہنچ گیا تھا اور بابر نے انہی دنوں آگرے میں پہلا جشن یا تماشا کرایا تھا۔

مختصر یہ کہ بابر کے خطوں کا مطلب اسی قدر تھا جو اس نے تحریر کیا۔ وہ کچھ بیمار ہوا اور درحقیقت بہت تھک گیا تھا۔ کابل کے مانوس پہاڑوں میں آنے کا اشتیاق [illegible]۔ جو یہاں سے بار بار [illegible] انتظام لینے کی خاطر تھا [illegible] ہمایوں اور کامران دونوں کو اس نے صراحتاً لکھ دیا تھا کہ کابل بادشاہ کا حصہ خاص [illegible] ہے۔ اسے لینے کی طمع نہ کریں۔ اس کے ساتھ اپنے پسندیدہ خربوزوں سے محروم ہونے کی تلافی اس نے وہ کی جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا، یعنی بلخ سے بیج منگا کر آگرے کے ہشت بہشت باغ میں کاشت کرائے اور جب وہ تیار

ہوئے تو انہیں کھا کر بہت خوش ہوا۔ لکھتا ہے" ایسے انگور اور خربوزے ہندوستان میں پا کر میرے دل کو نہایت تسکین اور مسرت ہوئی"

خواجہ کلاں کے اسی خط، مورخہ فروری ۱۵۲۹ء وطن کے خربوزوں کی یاد پر اشک بہانے کے بعد، یکایک وہ مزاج شناس وزیر کو کابل کی حکومت، اس کے برج دوبارہ کی مرمت، باغوں کی نئی قلم بندی اور اپنے اہل حرم سرا کو ہندوستان منتقل کرنے کی ہدایتیں دیتا ہے۔ انہی ہدایات کے درمیان ماضی کی اور یادیں، شوریدہ سر شاعر بنائی (رہرانی)، کا ایک لطیفہ اور رمے کشی کے سرور رفتہ کا قلق بھی معرض تحریر میں آجاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "تم نے کابل کے حل طلب مسائل کی بابت تحریر کیا ہے۔ میں نے پوری توجہ سے غور کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ایک اقلیم میں کئی کئی حاکم ہوں تو اس کا نظام استوار نہیں رہ سکتا۔ اسی بنا پر میں نے اپنی بڑی بہن اور بیگمات کو ہندوستان بلوایا ہے [بہن سے خانزادہ بیگم مراد ہے اور اس جملے سے حرم سرا کے اندر کشاکش کا پتا چلتا ہے] کابل اور اطراف کابل کو میں نے خالصہ قرار دیا اور اس کی ہمایوں اور کامران کو اطلاع دے دی ہے۔ میرے یہ خط دونوں شہزادوں کو وہ لوگ پہنچا ئیں جو صاحب فہم و فراست ہوں ...... لیکن علاقے کی حفاظت اور رسد رسانی میں کسی بدنظمی کا عذر میں آئندہ سننا نہیں چاہتا۔ اگر اب میں نے سنا کہ بالا حصار کی فصیلیں مضبوط نہیں ہیں، لوگ خوش حال نہیں ہیں، سامان رسد سے گودام اور نقود سے خزانہ معمور نہیں ہے تو اس کوتاہی کا الزام آں رکن سلطنت (خواجہ کلاں) کی گردن پر ہوگا۔

خاص طور پر جو کام کرنے ہیں، ان کی فہرست ذیل میں لکھتا ہوں۔ ان میں بعض امور خصوصاً خزانہ معمور رکھنے کے بارے میں پہلے بھی تم کو لکھا جا چکا ہے:۔

اوّل: قلعہ کی مرمّت۔

دوم: غلّے کی بہم رسانی۔

سوم: سفیروں کے جو آتے جاتے ہیں قیام اور سربراہی کا مناسب انتظام۔

مسجد جامع کی تکمیل، کارواں سرائے حمّام کے حجروں کی مرمّت نیز بالا حصار کے پیش دالان کی تکمیل کے لیے جسے استاد علی حسن بھٹی کی پکّی اینٹوں سے بنا رہا تھا ...... اور جو دیوان عام کے ہم سطح نیز اسی نقشے کے مناسب ہونا چاہیئے۔ ان سب کاموں کے لیے محاصل کا جتنا روپیہ مطلوب ہے، ملے لیا جائے۔

مزید برآں کابل خورد کا بند، بُت خاک ندی کا تنگ گزرگاہ پر پانی روک کر مکمل کیا جائے اور غزنیں کے بند کی مرمّت کرائی جائیں۔

مزید براں، خیاباں کے باغ کے لیے پانی کافی نہیں ہے۔ ایک پن چکّی (آسیا) بھر، نہر ضرور اس میں کاٹ کرائی جائے۔

خواجہ بستہ کے جنوب مغرب میں مَیں نے نہر نکالی اور ذخیرۂ آب بنا کے ہر طرف نئے پودے لگائے تھے یہاں سے ندی کے پار تک میدان نظر آتا ہے اس لیے اسے "منظر" کہتے ہیں۔ وہاں اچھے سے اچھے درخت لگانے اور ایسی چمن بندی کرنے کی ضرورت ہے کہ حواشی پر خوش رنگ و خوش بو پھولوں کی جھاڑیاں ہوں اور عمدہ نقشے کے مطابق انھیں نصب کیا جائے۔

سیّد قاسم کو تمھیں مدد دینے کے لیے مقرّر کیا ہے۔ تفنگچیوں کو مشق کراتے رہنے میں کوتاہی نہ کرنا اور استاد محمد امین کی اسلحہ سازی کے کام میں کمی نہ آنے دینا۔

اس خط کے ملتے ہی بڑی بہن اور بیگمات کو کابل سے روانہ کردو۔ دریائے سندھ تک انھیں پہنچا جاؤ۔ خط پہنچنے کے بعد ایک ہفتے سے زیادہ ان کی روانگی میں دیر نہ ہونی چاہیئے۔ پوچھو کیوں؟ تو سبب یہ ہے کہ ان کو لانے کے لیے جو لشکر جائے گا، اس کا قیام بھو کے علاقے میں ہوگا اور دیر تک انتظار میں ٹھیرا تو علاقے کی خرابی کا باعث ہوگا۔

اپنے رات کے چوکیدار عبداللہ کو میں نے لکھا ہے کہ توبہ کے شاداب باغ میں آکر بھی میرا دل تشنگی کے صحرا کی یاد میں بےقرار رہتا ہے۔ قطعہ:

"ترکِ شراب سے سوگوار ہوں
کام کرنے کی ہمت نہیں پاتا
لوگوں کو پشیمانی ہے اور توبہ کر رہے ہیں
میں نے توبہ کی اور پشیمان ہوں"

"بنائی کی حاضر جوابی اس وقت یاد آئی۔ ایک دن اس نے ایسا لطیفہ سنایا کہ میر علی شیر پھڑک گیا۔ جیبہ جو پہنے تھا اس میں بہت عمدہ گھنڈیاں تھیں۔ کہنے لگا، تو نے ایسا مزے کا لطیفہ سنایا کہ یہ جیبہ اُتار کے تجھے دے دیتا مگر گھنڈیوں نے روک دیا۔ بنائی نے کہا، گھنڈیوں سے کیا رکاوٹ ہے،

رکاوٹ تو ان کے کاجوں نے ڈالی ہے"۔ راست دو دروغ برگردن راوی — خدارا دل لگی سے بُرا نہ مان جانا۔ وہ قطعہ بھی ہُوا اوپر نقل کیا، سال بھر پہلے میں نے لکھا تھا۔ توبہ کرنے کے بعد دو سال تک تم شراب کے لیے میرا دل لوٹتا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس برس یہ خیالِ بد دل سے دفع ہوا۔ شاید یہ حضرت خواجہ احرارؒ کی کتاب نظم کرنے کی برکت ہے۔ تم بھی کیوں نہیں شراب چھوڑ دیتے؟ یارانِ عزیز کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا ایسا ہی پر لطف ہے جیسی ان کی صحبت۔ لیکن تمھارے ساتھ بیٹھ کر پینے والا کون رہ گیا ہے؟ اگر شیر حیدر۔ اور علی قلی جیسے ہم نشین ہیں، تو شراب کشی پر لعنت بھیجنا کچھ دشوار نہ ہونا چاہیئے!
باقی بہت بہت سلام اور شوق ملاقات۔

[آخر میں] یہ خط پنج شنبہ کو لکھا گیا۔ کیا کیا خیال آتے رہے کہ ضروری ہدایتوں کے درمیان اتنی بہت سی اور باتیں شامل کر دیں۔ زبانی پیاموں کے ساتھ، خط شمس الدین محمد کو دیا اور رخصت کیا۔
وقتِ شب، پنجشنبہ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خط، شیر کی اپنے پرانے وطن کو خیر باد کہنا تھی۔ اگرچہ خیر باد کہتے وقت دل کڑھ رہا تھا لیکن بظاہر اُسے اب یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان سے کبھی واپس نہ جا سکے گا اور زندگی کا خاتمہ بھی قریب نظر آتا تھا۔ تاہم اور اپنی بہن، بیٹیوں کو اس نے بلا تاخیر آگرے آنے کا حکم دیا گو کہ یہ سفر پورا کرنے میں انھوں نے بہت دیر لگائی۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہندال جسے بابر نے دیکھا نہ تھا، وہ بھی بھائیوں کے پاس بدخشاں میں رہا۔

اس خط کے لکھتے وقت بھی بابر اپنے معمول کے مطابق عاجلانہ کوچ کر رہا تھا کہ مشرق میں نئے دشمنوں کے مقابل عسکری کی امداد کریں۔

گنگا میں کشتی رانی

ابھی بارشیں ہو رہی تھیں۔ بعض دفعہ اندھیری چھا جاتی اور ہواجھیوں اور جنگل کے درختوں پر ایسے تھپیڑے مارتی جیسے کسی جادوگر نے اسے انتقاماً لہکا دیا ہو۔ بابر کبھی کبھی افیون، نیز معجون کے نشے سے دل بہلاتا ہوا برابر کوچ کرتا رہا کہ گنگا کے پار منتظر عسکری سے جا ملے اگرچہ ایک دن اسے گھوڑے کی بجائے پالکی میں سفر کرنا پڑا۔ آگے چل کر وہ اکثر چپٹی کشتیوں میں راستہ طے کرتا جو فوج

کے ہمراہ چڑھے ہوئے دریاؤں میں لائی جا رہی تھیں۔ چند بڑی توپیں اور اڑابہ دار زنبوریں بھی انہی باربرداری کی کشتیوں میں چڑھائی گئی تھیں۔

"سہ شنبہ کو ہم نے کوچ کیا۔ لشکر گاہ کے سامنے ایک ٹاپو سے دریا میں سبزہ زار نظر آیا۔ میں کشتی میں سیر کو گیا اور پہر گئے واپس آیا۔ یہاں دریا کا کنارہ اونچا تھا۔ میں سوار ہو کر بے خبر جا رہا تھا کہ گھوڑا اچھٹی ہوئی زمین سے گزرا یکایک زمین دھنسی، میں اچھل کر کنارے کے رُخ کودا۔ گھوڑا ابھی نہیں دھنسا لیکن اگر میں زین پر بیٹھا رہتا تو شاید وہ اس کراڑے کے اندر دھنس جاتا۔ آج ہی میں نے تیر کر گنگا پار کی۔ ہاتھ گنا گیا۔ تینتیس[۳۳] ہاتھ میں پار ہوا اور دم لیے بغیر واپس تیر آیا اور سب دریا پہلے تیر کر میں نے پار کیے تھے، سوائے گنگا کے۔

ایک رات پہلا پہر گزرا اور (بہ تصحیح مترجم) تراویح کی نماز ہو چکی تھی کہ ایکا ایکی دل بادل اُٹھے اور البا طوفان آیا کہ خدا کی پناہ۔ میں اُس وقت دربار کے خیمے میں لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کاغذ اور کتاب کے اجزا سمیٹ سکوں، خیمہ پیش چوب سمیت مجھ پر آ پڑا۔ خدا نے مجھے بچایا اور کوئی چوٹ نہیں آئی۔ کتاب کے اجزا سب بھیگ گئے۔ انھیں جمع کرنے میں بڑی دقت اٹھائی پھر انھیں چوکے کے نمدے پر بچھایا اور اوپر کمبل ڈال دیے۔ کوئی نیم ساعت میں طوفان فرو ہوا تو میرے سونے کا خیمہ پھر نصب کیا گیا اور شمع روشن کی۔ بڑی مشکل سے آگ جلائی گئی۔ میں رات بھر نہ سویا۔ صبح کی نوبت بجنے تک کتابوں کے اجزا اور اوراق سُکھانے میں مصروف رہا۔"

اس پریشان کن طوفان کے آنے سے چند روز ہی قبل حُسنِ اتفاق سے خواجہ کلاں نے عرضی بھیج کر یہ خلافِ معمول سی درخواست کی تھی کہ "وقائع" بابری کی پوری نقل اسے کابل ارسال کی جائے۔ یہ بادشاہ کے اور کوئی احوال و وقائع نہیں ہو سکتے، غالباً تزک ہی مراد ہوگی۔ بابر نے لکھا ہے کہ اس نے خود "ایک نقل کی تھی" وہ خواجہ کلاں کے پاس ارسال کی۔

چڑھی ندیوں کے پار کوچ جاری تھا مگر اس میں بھی سرکاری ہرکارے بلخ تک کی دور دراز سرحدوں کی خبریں لاتے رہتے تھے۔ تبریز سے سفیر آنے کی نیز ماہم کے منزل بہ منزل بڑھنے کی اطلاعیں اسی کوچ میں ملتی رہیں۔ البتہ تاکید کے باوجود ہمایوں نے کوئی خط باپ کو نہیں لکھا۔

شیر کا بری اور دریائی لشکر نئے، دشوار گزار علاقے سے بنارس پر بڑھ رہا تھا۔ ضمناً اس نے ایک افغان سردار شیر خاں کا ذکر کیا ہے کہ اس کی ملازمت میں آیا پھر دغا دے کے نئے باغیوں سے جا ملا۔

رہ شیر خاں وہی تھا جو آیندہ سنین میں شیر شاہ کے نام سے مشہور اور مغلوں کا نامی گرامی حریف بلکہ ہمایوں کے حق میں اسی قدر خوفناک ثابت ہوا جیسا شیبانی، بابر کے واسطے بلائے جان ہو گیا تھا) ایسی ناگوار خبروں سے اسے کچھ پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ سرسری احکام نافذ کیے کہ دو ترکش بند دستے ترک اور ہندی سرداروں کے ماتحت جنگ جنگ کے بیٹے کے ہمراہ یورپ کے لوگوں کی ہمت بندھانے شاہی فرامین لے کر جائیں۔ بڑے بڑے مغل سپہ سالار مع چین تیمور مغرب میں چھوڑ دیے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آخر بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں توت آ جانے پر اعتماد ہو گیا اور اب وہ دشمن کی کثرتِ تعداد کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کوچ کے بعض واقعات کا مزہ لے لے کر ذکر کرتا ہے۔ جیسے ایک شیخی خور پہلوان کا ہر ایک سے کشتی لڑنے کا دعویٰ کرنا اور پہلی ہی پکڑ میں پچھڑ جانا۔ تاہم بابر نے دل دہی کے لیے اسے بھی انعام دیا۔ ہاتھیوں کا حلقہ بنا کے شیر دگر گدن کے شکار کو جانا اور سارا جنگل چھاننے کے باوجود کوئی شکار نہ ملنا۔ ایک عثمان لی ترک پھنسیوں کا نیا علاج تجویز کرتا ہے کہ مرچوں کو جوش دے کر بھپارا لیا جائے۔ بابر نے یہ عمل کیا تو بڑی چرمراہٹ محسوس کی (اگرچہ فائدہ ہوا) کشتی میں ایک مگرمچھ آ پڑتا ہے اور دیکھنے دکھانے کے لیے گرفتار کیا جاتا ہے۔ گلِ نیلوفر کا کھلنا سُن کر اس کے تالاب پر بادشاہ گیا کہ بیج لائے۔ ندیوں کے سنگم پر دشمن کے علاقے میں اس طرح داخل ہوا جیسے نئی جگہ کی سیر کو جاتے ہیں۔

"ہمارا لشکر کرم ناس ندی کے کنارے اُترا۔ کہتے ہیں ہندو اس کے پانی کو چھونے سے وہم کرتے ہیں، اُسے پار کرنے کی بجائے گنگا کے کنارے کنارے سامنے سے نکل جاتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس ندی کا پانی جس کسی کو لگ جائے اس کا "کرم" یعنی نیک عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ نام رکھا ہے۔ میں کشتی میں بیٹھ کر اس ندی کے اندر دُور تک گیا پھر واپس آ کر گنگا کے شمالی کنارے پر کشتیاں ٹھیرا دیں۔ لشکر میں پہلوانوں کی خوب کشتیاں ہوئیں۔ میرے ساقی محسن نے دعویٰ کیا کہ ایک ایک کر کے چار پانچ سے لڑونگا۔ پہلے کو تو اس نے دبا لیا مگر دوسرے سے پٹخنی کھائی۔ بہت شرمندہ ہوا۔"

بار بار علیل ہونے اور سخت درد کی تکلیف اٹھانے، آندھی طوفان آنے کے باوجود جس میں اسے روزنامچہ تک لکھنا دشوار ہو جاتا تھا حیرت ہوتی ہے کہ بابر کس اطمینان کے ساتھ جملہ امور پر قابو رکھتا ہے۔ سیاسی داؤ پیچ کرنے میں پہلے اناڑی تھا، اب خوب ماہر ہو گیا ہے۔ مقابلے میں مشرقی افغان حریفوں کے لشکر بڑے بڑے سرداروں کے زیر قیادت تھے جیسے سلطان بایزید، محمود خاں برادر ابراہیم لودھی اور تازہ وارد شیر خاں

رسوری)۔لیکن بابران سب کو گھیرتا، کھدیڑتا چلا جاتا تھا۔ اس کے اعلانات مقامی لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ پادشاہی لشکر میں بھرتی ہوں اور باغی جتھوں سے افغانی سردار برابر ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے اُردو میں چلے آرہے تھے۔ چنار، بنارس غازی پور جہاں سرکشوں کا جماؤ ہُوا تھا، اب سب زیرنگیں آچکے تھے۔

پھر بھی اصلی خطرہ آگے آرہا تھا۔ نصرت شاہ والیٔ بنگال و بہار نے آگرے کے جشن میں تحائف بھیج کر اظہار دوست داری کیا تھا لیکن اب بنگالی اور بہاری فوجیں گنگا اور گھاگرا کے مقام اتّصال کے اوپر جمع ہو رہی تھیں کہ پہلے پسپا ہونے والے لودھی افغانوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے روکیں لیکن جب نصرت شاہ نے رجسے بابر "بنگالی" لکھتا ہے) بایزید، محمود خاں اور شیر خاں کو اپنے لشکر گاہ میں باریاب کیا تو بابر سمجھ گیا کہ اب بنگالی سپاہ باغیوں کے تعاقب میں میرے آگے بڑھنے میں مزاحم ہو گی۔ بایں ہمہ اسے ان سب متحدہ حریفوں کا سامنا کرنے سے بھی منہ پھیرنا منظور نہ تھا۔ یوں وہ خود جنگ کرنی نہ چاہتا تھا۔ اس نے نصرت شاہ کو لکھا کہ "میرا خاص مقصد امن و صلح ہے۔"

مگر سچ یہ ہے کہ اس کا دلی مقصد کچھ اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ اپنے تیسرے سیزدہ سالہ فرزند عسکری کو رجسے پچھلے دونوں سپہ سالاری کا توغ و عَلَم دے کے آگرے سے بھیجا تھا) اسی قسم کی ناموری سے ہم کنار کرائے جیسی ہمایوں کو پانی پت کی جنگ میں میسّر آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عسکری کے واسطے کوئی معرکہ جیتنا ضروری تھا اگرچہ وہ پانی پت جیسی خونریز جنگ لڑنی نہ چاہتا تھا اور اپنی مخلوط فوج پر جو نوجوان سپہ سالاروں کے ماتحت تھی، غالباً زیادہ اعتماد بھی نہ رکھتا تھا۔

بہرحال دریاؤں کے سنگم پر اس نے وہ مقصد پوری طرح حاصل کر لیا جس کا خواہاں تھا اور کامیابی بھی اس کمال اور آسانی سے پائی گویا مغل فوج تھی کہ خود اس کے بنائے ہوئے ناٹک کے مطابق اداکاری کر رہی تھی۔

عسکری کے واسطے نیک شگون

جاسوس، بنگالی سپاہ کی تعداد و اسلحہ کی خبریں لائے کہ مغلوں سے زیادہ بھی ہے اور مستعد پیادہ فوج کے ساتھ آتشیں اسلحہ سے بھی مسلّح ہے جو غالباً تجارتی بندرگاہوں پر پرتگیزوں سے خریدے گئے تھے۔ طلایہ کے سواروں نے اطلاع دی کہ اتحادی حریفوں نے دو دریاؤں کے سنگم کے پیچھے مضبوط

مورچے بنائے ہیں اور کناروں کی زمین دلدلی، میدانوں کھیتوں میں کیچڑ اور جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے گھوڑوں کے لیے اچھی نہیں حالانکہ مغلوں کا بھروسہ سوار فوج پر ہی زیادہ تھا مگر لڑ کر دریا پار کرنے میں وہ خوب منجھے ہوئے تھے۔ یہ بات نصرت شاہ کو معلوم نہ ہو گی مگر اس کے لودھی حلیفوں نے تو شاید خبردار کر دیا ہوگا۔

تیز رو گھاگرا کے گنگا میں گرنے کے مقام پر پہنچنے سے پہلے بابر نے کئی دن یوں گزارے کہ پھیرکھا کے ایک مقامی بزرگ (منیری رح) کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا اور مضمحل گھوڑوں کو چھانٹ کر پیچھے بھیجا کہ ستا کے، کھلا پلا کے تازہ دم کیے جائیں۔ خود بھی تندرست نہ تھا، لہٰذا ایک کشتی میں مقیم رہا جس پر دیدبانی عرشہ بنایا گیا اور "آسائش" موسوم کیا تھا۔

عسکری کا لشکر گنگا کے دوسرے یعنی شمالی کنارے کوچ کر رہا تھا اور بابر دائیں کنارے پر تھا۔ لہٰذا مقام جنگ پر ملنے کی غرض سے فوجوں کو کشتیوں میں اتار کر اس مثلث میں جمع کیا گیا جو گھاگرا اور گنگا کے اتصال پر بنا ہوا تھا۔ چونکہ دشمن سامنے مثلث کی راس پر خیمہ زن تھا اس لیے مغلوں کے حق میں یہ موقع سازگار نہ تھا۔ بنگالیوں کی عظیم لشکرگاہ ایک مورچہ بند ٹاپو کے پیچھے تھی اور دریا کے کنارے ان کی کشتیوں کا بیڑا پھیلا پڑا تھا۔ سنگم کے آس پاس سے، جالہ بانوں نے بابر کو بتایا کہ گھاگرا یا گنگا کو پایاب عبور کرنا ممکن نہیں۔ پادشاہ نے عسکری کی سپاہ کو دریا سے دور رکوا دیا اور اپنے لشکروں کو لیے ہوئے کنارے تک بڑھ آیا۔ چند روز تیاریوں میں گزرے۔ فوج والوں نے استاد علی رومی کی بڑی توپ "غازی" اور دوسری چھوٹی توپوں نیز تفنگچیوں کے واسطے دمدمے ندیوں کے سنگم پر بنائے۔ استاد مصطفیٰ کو گنگا کے جنوبی کنارے پر دوسرے دمدمے بنانے کا کام سپرد ہوا جہاں سے زنبورکیں اور توڑے دار بندوقیں دشمن کے بیڑے اور ٹاپو پر آتش باری کر سکتی تھیں۔ جب ادھر ادھر باڑیں چلنی شروع ہوئیں تو بابر نے عسکری اور تمام سرداران سپاہ کو بلا کر شوریٰ کیا۔ اس نے کہا "یہاں دریا اترنے کی جگہ اچھی نہیں ہے پس ہماری قلیل فوج یہاں انتظار کرے گی اور بڑے لشکر کو اوپر جا کر ہلدی گھاٹ سے گھاگرا کو عبور کرنا اور پھر بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنا چاہیے۔" اس نے بتایا کہ میں خود دو لشکروں کو لے کر مثلث کے زاویے میں ٹھیروں گا۔ ایک کے مورچے دوسرے کے عقب میں رہیں گے اور عسکری کو چار لشکر دے کر (یعنی دو تہائی سپاہ سے) دو تین میل اوپر کے رخ بھیجا جائے گا کہ گھاٹ سے پار اتر جائے، جہاں پایاب جگہ تھی یا گھاگرا کا پاٹ کم اور کشتیوں کو پار کرنا آسان تھا۔ گھاٹ پر کشتیاں پہلے سے جمع کی جا رہی تھیں۔

مگر دشمن ابھی تک ہلدی گھاٹ کے سامنے نظر نہیں آیا تھا۔

"جب تک عسکری دشمن سے ملاقی ہو، استاد علی قلی اور استاد مصطفیٰ اپنی بڑی توپ، زنبورکوں اور"فرنگیوں" (چھوٹی توپ کا نام) سے اور بندوقوں سے برابر غنیم کو اپنی طرف متوجہ رکھیں گے۔ توپیں گنگا کے پار گولے چلاتی رہیں گی اور ہم تیار اور منتظر رہیں گے کہ عسکری کی سپاہ نزدیک پہنچ جائے تو خود بھی دریا اُتر کر دشمن پر جا پڑیں۔

پہلے دن صبح کے وقت دریاؤں کے آر پار گولہ باری شروع ہوئی تو بابر سے اپنی بڑی توپوں کی کارگزاری دیکھے بغیر نہ رہا گیا لکھتا ہے کہ "میں سوار ہو کر کوئی کوس بھر عین سنگم کے زاویے پر گھوڑے سے اُترا اور استاد علی کی چھوٹی توپوں کی باڑیں چلتی دیکھ کر خوش ہوا۔ اس نے پتھر کے گولوں سے دو کشتیوں کو نشانہ بنایا جو ٹوٹ کر ڈوب گئیں۔ مصطفیٰ نے بھی اپنے مورچے سے ایسا ہی کیا۔ میں نے حکم دیا کہ بڑی توپ بھی صف جنگ میں لائی جائے اور کئی بیاول مدد دینے کے لیے مقرر کیے۔ پھر پڑاؤ کے قریب ایک ٹاپو پر جا کر معجون کھائی...... دوسری صبح "بہادر" نام کی کشتی میں بیٹھ کر گولہ اندازی کے موقع تک گیا اور ہر ایک کو اپنے کام پر لگا یا۔ نماز ظہر کے قریب ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ بڑی توپ میں گولہ بھر لیا گیا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟ میں نے حکم دیا اسے تو داغ دو اور دوسرا گولہ بھر کر میرے آنے تک ٹھیرو۔ پھر نماز عصر کے قریب ایک بنگالی ڈونگے میں بیٹھ کر دمدمے تک گیا اور استاد کے ایک بڑا گولہ اور دوسرے چھوٹے گولے چلانے کا معائنہ کیا۔ بنگالی بھی توپ چلانے میں شہرت رکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں اس کا امتحان لیا لیکن دیکھا کہ وہ کسی خاص نشانے پر گولہ نہیں مارتے، جہاں تہاں چلاتے رہتے ہیں۔"

اس عرصے میں عسکری کی سپاہ گھاگرا کو شمال میں پار کر آئی تھی اور دریا میں جا بجا کشتیوں کی آمد و شد ہو رہی تھیں۔ بنگالیوں نے یہ کوششیں بھی کیں کہ لڑ کر دریا کے پار بابر کی فوج سے آ بھڑیں ادھر بابر نے انھیں پیچھے دھکیلنے کے لیے دستے پر دستہ دوڑایا اور حکم دیا کہ بڑھتے ہوئے دوسری طرف عسکری سے جا ملیں۔ اس عمل سے مغل سپاہ کا زور ہلدی گھاٹ یعنی شمال کی جانب ہوتا چلا گیا۔ تیسری صبح سویرے سویرے یہ خبر جس کا بابر کو اشتیاق تھا، آ گئی کہ مغلوں کی گولہ باری اور دوسری طرف کشتیوں کو جنگی تدبیر سے لڑانے کی بدولت دشمن کا سارا بیڑا بہاؤ کے رُخ نیچے بھاگ رہا ہے۔ "ہماری (یعنی عسکری کی) تمام سپاہ دریا کے پار اُتر گئی، کوئی باقی نہیں رہا اور اب سب بنگالی سوار اس کے مقابلے کو نکل آئے ہیں۔"

اسی لمحے بابر کشتی چھوڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور جملہ سرداران سپاہ کو حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے سب کے سب بلا تاخیر دریا کے پار ہو جائیں۔ وہ بھی عجیب نظارہ ہو گا کہ صبح کی مدھم روشنی میں سپاہیوں کے جوق در جوق چھپٹی کشتیوں میں لد لد کر اور سوار ڈونگوں میں سوار گھوڑوں کو پانی میں تیراتے ہوئے دریا اُتر رہے تھے۔ لاہوری اور ہندوستانی پیادے تیر تیر کر یا نرسلوں کے مٹھوں کی مدد سے پانی میں چل کر پار ہوئے۔ بابر کے الفاظ میں "کوئی ناشدنی واقعہ نہ ہوا" ایک سپاہی کو اس نے دیکھا کہ تیرنا نہیں جانتا، گھوڑے کی ایال کے سہارے پار ہُوا۔

تاہم دوسرے کنارے پر اُترنا آسان کام نہ تھا۔ بنگالی اژدہام کر کے آ گئے تھے کہ آنے والی کشتیوں اور طرح طرح سے دریا پار کرنے والوں کو کنارے پر روکیں اور چڑھنے نہ دیں۔ بابر اپنے ایک سردار کی تعریف کرتا ہے کہ کس طرح چند سواروں کو لے کر اُترا اور گھوڑے پر چڑھ کر پیادہ بنگالیوں کے ہجوم پر تنہا جا پڑا کہ اتنے میں اس کے ساتھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ بارے دریا اُترنے کی یہ برجستہ چال چل گئی مغلوں نے دوسرے کنارے پر قدم ٹکا لیے۔ بابر نے لیسا ول دوڑا کر حکم بھیجا کہ "سب ٹکڑیاں یک جا ہو کر غنیم کے بازو پر حملہ کریں۔ اس کی صفوں میں در آئیں۔"

یہ واقعہ بجائے خود قریب قریب خرق عادت تھا کہ سوار سپاہی دریا کے پار جا اُترے جہاں اُن سے بڑی تعداد میں پیادے آتشیں اسلحہ لیے موجود تھے پھر اُترنے اور صفیں باندھ کر نصرت شاہ کے بازو اور عقب میں حملہ کرنے سے انھیں کون روک سکتا تھا جس کی اصل سپاہ عسکری کے لشکروں کا مقابلہ کرنے چلی جا رہی تھی۔

بابر جانتا تھا کھیل کا خاتمہ کس طرح ہو گا۔ بنگالے کی فوج پر جو تین طرف سے ضرب لگی تو بے تحاشا چوتھے کھلے رُخ سے بھاگی۔ لودھی خاندان کے سلاطین بنگالے کے پرچم چھوڑ کر جان سلامت لیے فرار ہوئے۔ بابر اپنی کشتی میں پلٹا کہ اب اس پر سوار ہو کر مفرور دشمن کے خیمہ و خرگاہ کا معائنہ کرے۔ پھر دریا کے پار آئے۔ لکھتا ہے "میں نماز ظہر کے لیے وضو کر رہا تھا کہ میرے سردار واپس آئے۔ میں نے ان کی تعریف کی اور انعام و عنایات کا امیدوار بنایا۔ عسکری بھی آ یا۔ یہ اس نے پہلا معرکہ دیکھا تھا۔ شگون اچھا ہوا۔" زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بعض افغان رئیس اظہار اطاعت کے لیے حاضر ہوئے۔ نصرت شاہ کے اطمینان خاطر کی غرض سے اسے لکھ بھیجا کہ میرا مقصد خاص بھی امن و صلح ہے اور اب حالات سازگار ہیں، شرائط صلح طے ہو سکتی ہیں۔ چند روز میں شاہ بنگال کے دو موقع شناس ایلچی آئے اور پادشاہ کی

خدمت میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ نصرت شاہ آپ کی شرائط ماننے کے لیے تیار ہے۔ قریب قریب انہی دنوں میں چین تیمور سلطان کا قاصد پیام لایا کہ بلوچیوں کو دریائے سندھ کے مغرب میں دُور تک دھکیل دیا گیا اور اب وہ دریا سے کوئی چھ سو کوس دور ہٹ گئے ہیں۔ اس طرح مشرق اور مغرب دونوں سروں کی جنگ انجام کو پہنچی۔ اب ہندوستان کا بادشاہ بلاحجت تمام شمالی ہند کا مالک تھا اور اس کا حریف کوئی نہ رہا تھا۔ بابر اقرار کرتا ہے کہ چین تیمور کی اطلاع سُن کر "بڑی خاطر جمع ہوئی۔"

"شاباش واپسی"

اب اس نے بلا تاخیر آگرے کی جانب باگ موڑی۔ بارش ختم ہوگئی تھی لیکن طوفان پر طوفان آتے رہے گنگا کے کنارے ادھر اُدھر بچے کھچے سرکشوں کا قلع قمع کرنا اور بایزید اور لودھی سلطان کے تعاقب کا کام باقی تھا۔ مگر بابر کو آگرے کی لَو لگی تھی جہاں بیٹیاں اور ماہم اب پہنچنے والی تھیں۔ گریزپا باغیوں کا پیچھا کرنے کا فرض اس نے عسکری اور مشرقی سپاہ کے دوسرے سپہ سالاروں کے تفویض کیا۔ ایک موقع پر یہ سن کر کہ ان میں سے کوئی دریا کی طغیانی دیکھ کر پار جانے سے ٹھٹکتا ہے، بابر نے فوراً عتاب آمیز تاکیدی حکم بھیجا "جس طرح بن پڑے، دریا کو اُتر جاؤ۔ مقابلہ بڑی تعداد سے ہو تو دوسروں کو اپنے ساتھ لو مگر کام کرنے میں ہرگز سستی اور بے دلی نہ دکھاؤ۔" اسی قسم کا حکم اس نے گنگا اور گھاگرا اُترنے کے وقت نافذ کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں خود اس کا طرزِ عمل تیس برس سے ایسا ہی رہا تھا۔

راستے میں پھر ندیاں، دریا طے کرنے تھے جو ان دنوں طغیانی پر تھے۔ اس سفر میں روزنامچہ بھی کسی کسی دن اختصار سے ہی لکھا جا سکا۔ پھر بھی کہیں کہیں ذاتی کوائف آ جاتے ہیں۔ جیسے اقامتی کشتی "آسائش" میں کچھ وقت گزارنا۔ ختم ماہِ رمضان پر گھٹا کی وجہ سے نیا چاند دکھائی نہ دینا۔ ایک "ٹاپو پر رات" کو ٹھہرنا جہاں سیلاب آگیا اور دوسرے ٹاپو پر جانا پڑا۔ ایک جگہ دیہاتیوں کا مشغلہ یعنی ہملا کے مچھلیاں خالی ہاتھوں سے پکڑنے کا تماشا جس میں بابر شریک ہوا اور خود بھی ایک مچھلی ہاتھ سے پکڑی۔ لکھتا ہے:

"اس علاقے کی طرف سے ہماری خاطر جمع تھی لہٰذا ہم سہ شنبہ کو راتوں رات آگرے چلے اور ایسی تیزی سے چلے جیسے چھاپہ مارنے جاتے ہوں۔ صبح تک سولہ کوس طے کر کے دوپہر کا پیش کے پر گنے میں آرام لیا۔ گھوڑوں کو دانہ چارہ کھلایا۔ شام ہوتے چل پڑے اور تیرہ کوس طے کر کے تیسری گھڑی رات بہادر خاں

کے مقبرے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر سویا، صبح کی نماز سویرے سے پڑھ کر پھر عاجلانہ چل پڑے۔ دن ڈھلے تک سولہ کوس چل کر اوٹا وہ جا لیا۔ یہاں مہدی خواجہ نے پیشوائی کی۔ پہر بھر رات گزری تھی کہ پھر چل پڑے راستے میں تھوڑی دیر سونے کو ٹھیرے اور پھر دوپہر تک چل کر آ پری میں دوپہر کو آرام لیا۔ ظہر کے بعد (پنجشنبہ کو) سترہ کوس طے کر لیے اور رات کی دوسری نوبت بجتے بجتے آگرے کے ہشت بہشت باغ میں گھوڑے سے اُترے۔

جمعے کی صبح بخشی سلطان محمد اور دیگر عمائد حاضر ہوئے۔ نماز جمعہ پڑھ کر میں نے جمنا کو عبور کیا اور قلعے میں داخل ہوا اور پھوپیوں سے جا کر ملا۔

بلخ کا ایک کاربزی خربوزے کاشت کرنے پر مقرر کیا تھا۔ آج وہ چند خربوزے لایا۔ چھوٹے ہیں مگر بہت اچھے نکلے۔ ایک دو تاکستانوں میں جو میں نے ہشت بہشت میں لگائے تھے، انگور بھی بہت عمدہ ہوئے۔ شیخ گھورن نے انگور کا ٹوکرا مجھے بھجوایا۔ یہ انگور بھی بُرے نہیں ہیں۔ ہندستان میں ایسے خربوزے اور انگور پیدا ہونا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ہفتے کو آدھی رات کے وقت اطلاع آئی کہ ماہم آ رہی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ کابل سے وہ (اور بیٹیاں) اسی روز چلی تھیں جس روز میں پورب کو فوج لے کر روانہ ہوا۔" اس طرح دو منزلہ سہ منزلہ کر کے بابر نے پچھلے ۴۸ گھنٹے میں ۱۵۶ میل طے کیے اور اہل و عیال کا خیر مقدم کرنے آگرے پہنچ گیا، جنھوں نے کابل سے آنے میں پانچ مہینے لگائے۔

یہاں پھر تزک منتشر یادداشتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اور تاریخیں بھی صرف کہیں کہیں دی گئی ہیں۔ ان میں جین تیمور کے عین اس وقت کہ کشتیاں ہو رہی تھیں آنا مذکور ہے اور یہ کہ گوالیار کے حاکم رحیم داد پر بے وفائی کا شبہ ہونے سے قریب تھا کہ بابر خود ادھر چل پڑے مگر خلیفہ نے اسے باز رکھا۔ ماہم کے ہمایوں کی طرف سے ہدیہ لانے کا ذکر آتا ہے لیکن اس کے سوا ہمایوں یا ہندال کی نسبت کچھ تحریر نہیں جسے بڑے بھائی نے (باپ کی بغیر اطلاع) بدخشاں بلوا لیا تھا۔

تزک میں آخری اندراج ۷ ستمبر ۱۵۲۹ (۳ محرم ۹۳۶ھ) کا یہ ہے: "رحیم داد کی بداعمالی کو معاف کر دیا گیا۔ اس کی جگہ شیخ گھورن (جو نیلوفر کا بیج اور تازہ انگور لایا تھا) اور نور بیگ گوالیار بھیجے گئے کہ وہ وہاں کا انتظام ان کے سپرد کر دے۔ آیندہ جو کچھ پیش آیا وہ گلبدن یا خواند میر وغیرہ

مورخوں کے ہاں ملتا ہے۔ خود آئندہ ہندوستان کی عظیم تر سلطنت کے بادشاہ کی سرپرستی میں آرہا تھا۔ گلبدن اُن دنوں باپ کے پاس تھی اور خاندان کے واقعات کو آخری مہینوں میں اہل حرم نے جس طرح مشاہدہ کیا، وہ کیفیت اسی خاتون کے ہمایوں نامہ سے نقل کی گئی ہے۔

"خاندان میں موت آتی ہے"

گلبدن کو اس نئی دنیا اور نئے دربار میں آکر باپ کے ملنے سے جو بے پایاں خوشی ہوئی تھی، اس کا نقش برابر دل پر قائم رہا۔ آگرے کے طول طویل سفر میں جب کہ فوجی بدرقہ ساتھ تھا، ننھی گلبدن کو بادشاہ کے سامنے جانے سے بہت خوف رہا لیکن جب سے اس نے اُٹھا کر اپنی گود میں لیا اس وقت سے، ایک ہفت سالہ بچے کے جملہ معصوم جذبات کے ساتھ وہ باپ سے وابستہ ہو گئی۔ اسے پدرانہ شفقت کی نئے وطن میں مانوس و مستقل ہونے تک ضرورت بھی تھی۔ وہ اپنی ماں دلدار بیگم اور بھائی ہندال سے جدا کرلی گئی اور ماہم کے زیر تربیت تھی۔ یہ بیگم جب کبھی اپنے خلجان میں مبتلا ہوتی تو اس زمانے میں گلبدن جو چیز مانگتی، وہ عیب نکالتی تھی۔ اب آگرے میں ماہم سب سے بڑھ کر دونئی آنے والیوں کے پیچھے پڑی رہتی تھی جو گورے رنگ کی چرکس کنیزیں تھیں اور محل میں کھُلے بال اُچھالتی پھرتی تھیں۔ وہ ماہم کی زیادہ پروا نہ کرتی تھیں کیونکہ بادشاہ کی منظور نظر تھیں اور کسی معمولی آدمی نے نہیں، ایران کے شاہ طہماسپ نے انھیں بابر کے پاس بھیجا تھا۔ گلنار اور نارگُل اُن کے نام بھی طرفگی سے خالی نہ تھے۔ رات کو ان میں سے ایک یا دوسری، بادشاہ کی طلبی پر اس کے حجرے میں چپکے سے آجاتی تھی۔

مگر ان کنیزوں پر پیچ و تاب کھانے سے بھی ماہم کی توجہ دوسری پریشانیوں سے نہیں ہٹ سکی، جن کا گلبدن پورا اندازہ نہ کرسکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے فرزند ہمایوں کے آگرے میں موجود نہ ہونے کی فکر کھائے جاتی تھی۔ کئی سال میں شوہر کو دیکھا تو مسلسل جنگ و سفر کے باعث اسے بہت مضمحل پایا۔ اس کے بار بار بخار آجانے کا، پھر مرچوں کے بھپارے سے سوزش ہونے کا سُن کر نہایت متوحش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس حال میں وہ بزرگوں کے اقوال نظم کرتا تھا۔ ایک اور تشویش یہ کہ دوسری بیوی کے فرزند عسکری پر خاص نظر عنایت ہوگئی تھی ـــــ غرض شوہر کے بارے میں یہ سب توہمات ماہم کو اندیشہ مند کرتے تھے۔ قیام کابل کی ساری مدت میں وہ حرم سرا کی تنہا مالکہ رہی تھی، اب اس کی خاطر پراگندہ اور

وہم پرست ہونے کی وجہ سے چار سال پہلے بچے کے مرنے کا غم بھی نہیں بھولی تھی، پس وجدانی طور پر اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ نئی شان وعظمت خاندان پر کسی آنے والی مصیبت کی نشانی ہے۔ خود بابر ایسا کوئی خطرہ محسوس نہ کرتا تھا۔ ادھر گلبدن ان باتوں کو مشکل سے سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے جلیل الشان باپ کو دیکھ کر ہی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی مگر ماہم کے عتاب کے خوف سے اسے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ کم سے کم ایک مرتبہ اس نے ماہم کو اپنے بادشاہ باپ پر بھی اعتراض کرتے سُنا اگرچہ وہ بے نتیجہ رہا۔ لکھتی ہے کہ "قیام آگرہ کے سارے زمانے میں میرے والد کا معمول تھا کہ ہر جمعے کو اپنی پھوپیوں سے ملنے جاتے تھے [جو بیوی بچوں کے آنے سے پیشتر آگرے آگئی تھیں] ایک دن سخت گرمی تھی۔ حضرت بیگم نے بیقرار ہو کر کہا "آج ایسی لُو چل رہی ہے۔ کیا حرج ہے اگر اس جمعے آپ اُن کے پاس جانا ناغہ کر دیں؛ وہ بیگمیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھیں گی۔" والد حضرت نے کہا "ماہم، تعجب ہے تم ایسی بات کہتی ہو۔ میری پھوپیوں کے باپ رہا نہ کوئی بھائی۔ میں بھی ان کی خاطر داری نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟"

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ کابل سے دوسری شاہی خواتین، مع خانزادہ بیگم اور بی بی مبارکہ نئے دارالسلطنت میں پہنچ گئیں۔ بابر نے پہلے سے اطلاع دی اور انتظام کر دیا تھا مگر ان کی آمد بھی ماہم کی تسکین نہ کر سکی۔ گلبدن لکھتی ہے "کابل سے شہزادیوں کے آنے کی خبر آئی تو والدہ حضرت میری بڑی پھوپی اور اپنی بڑی بہن اور عزیز ترین خاتون (خانزادہ بیگم) کے شایانِ شان استقبال کے لیے نئے حمام تک خود پیشوائی کرنے گئیں۔ انہی کے خیمے میں دوسری آنے والی بیگمات پادشاہ کا آداب بجالانے حاضر ہوئیں۔ سب نہایت مسرور و شاد تھیں۔ شکر کے سجدے ادا کیے اور پھر سب مل کر آگرے روانہ ہوئے۔ پادشاہ نے ہر ایک کو حویلیاں عنایت کیں" مگر خانزادہ آگرے کے نئے تُزک و احتشام میں زیادہ دن نہیں رہی بلکہ اپنے مجروح المزاج شوہر مہدی خواجہ، حاکم اٹاوہ کے پاس چلی گئی۔ تاہم بابر نے اسے بھی دوسری بیگمات سمیت خود ساتھ جا کر اپنی نئی زیر تعمیر عمارتیں اور آگرے کا وہ حصّہ دکھایا جسے "کابل" کا نام دیا گیا تھا۔ گلبدن کے ذہن میں تو یہ آیا کہ اس کا باپ جسے پہلی دفعہ ہوش میں دیکھا، عجیب سے عجیب کام کر سکتا ہے:۔

"آگرے میں دریا کے دوسری جانب اس نے حکم دیا کہ محل سرا اور باغ کے درمیان ایک سنگین محل خود اس کے لیے تعمیر کیا جائے...... ایک دن وہ ماہم بیگم اور اس حقیر کنیز کو دھول پور لے گئے جہاں پہاڑ کی چٹانوں میں انھوں نے کوئی سات قدم عرض کا حوض ترشوایا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا تھا کہ بن جائے

تو اسے شراب سے بھرواؤں گا۔ لیکن چونکہ رانا سانگا کی جنگ سے پہلے شراب پینی ترک کی، لہذا عرقِ لیمو سے اُسے بھروایا تھا۔

سیکری میں (آخری میدان جنگ کے قریب) اعلیٰ حضرت نے ایک بڑا تالاب بنوایا، اس کے بیچ میں چبوترہ تھا۔ یہ تیار ہوگئے تو وہ جاکر چبوترے پر بیٹھتے یا اس کے گرد کشتی رانی کا لطف اُٹھاتے تھے......

سیکری کے باغ میں ایک شاندار (دومنزلہ) بارہ دری بنوائی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی کتاب لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نیچے کی منزل میں اپنی افغانی دایہ کے ساتھ میں بیٹھی تھی کہ میری والدہ ماہم بیگم، نماز کے لیے گزریں میں نے دایہ سے کہا مجھے اُٹھا، اس نے جو ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو جوڑ جگہ سے اُتر گیا۔ مجھ میں طاقت نہ رہی اور بے اختیار رونے لگی۔ فوراً اُستخواں بند بلایا گیا اور جب تک اس نے جوڑ نہیں بٹھا دیا بادشاہ وہاں سے نہیں گئے۔

باپ کی اس رحم دلی کی کہ جب تک اس کی پٹی نہیں بندھی، وہ وہاں سے نہیں گیا، یاد کے ساتھ گلبدن اس کی ماندگی کو یاد کرتی ہے :۔

"چند روز بعد وہ (شاہی معافی کے) باغ زرافشاں کی سیر کرنے گئے۔ اس میں وضو کرنے کا حوض بنا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے "میرا دل حکومت اور فرماں روائی سے بھر گیا ہے۔ میں تو گوشہ نشین ہوکر اس باغ میں آرہوں گا۔ رہے نوکر تو ایک طاہر طشت بردار میرے لیے بالکل کافی ہوگا۔"

" یہ سن کر ماہم اور ہم سب بچوں کا بہت دل دکھا اور سب نے آب دیدہ ہوکر کہا خدا آپ کو زمانۂ دراز تک صحیح سلامت رکھے۔ اور بیگم نے کہا خدا آپ کے بچوں کو آپ کے بعد عمرِ دراز عطا کرے۔"

اس واقعے سے کچھ پہلے ہمایوں یکایک والدین کے پاس آگیا تھا۔ کس طرح اور کس تاریخ آیا، یہ بات پادشاہ کی تزک یا اس کی بیٹی کی کتاب میں مرقوم نہیں ہے۔ عجب نہیں بابر نے بیٹے کی وارفتہ مزاجی سے حسب معمول اغماض برتا ہو۔ دور کاشغر میں میرزا حیدر نے سنا (ممکن ہے خود ہمایوں سے) کہ ہمایوں کو باپ نے آگرے آنے کا حکم دیا تھا۔ ایک اور مصنف بابر کی طرف سے اس ملاقات کا واقعی یا خیالی حال اس طرح لکھ گیا ہے :۔

" میں اس کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ وہ آگیا۔ اس کو دیکھ کر ہمارے دل بھر آئے، آنکھیں چمکنے لگیں۔ میرا دستور تھا کہ روزانہ دسترخوان پر لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتا۔ لیکن اس روز ہمایوں کے آنے

کی خوشی میں اور اس کی عزت افزائی کی غرض سے مَیں نے بڑی ضیافت کی۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے رہے۔ اس سے باتیں کرنا اور اس کو جوانِ رعنا دیکھنا، حقیقت میں عجیب مسرت کا باعث ہے۔"

یہ بابر کے الفاظ نہ ہوں تو بھی ابتدا میں حیران رہ جانے کے بعد اس نے ہمایوں سے کمال عنایت کا برتاؤ کیا۔ وہ اپنی ولایت چھوڑ کر بلا اجازت آگرے چلا آیا تھا۔ یہاں بابر نے دوآبے کا نہایت زرخیز پرگنہ سنبھل اسے دیا جہاں سے ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں نظر آتی تھیں اور ادھر آگرے سے گھوڑے پر دریا دریا دو دن کی مسافت پر تھا اسی کے ساتھ ہمایوں کے حسب مذاق الگ تھلگ بھی تھا جہاں اس نے اپنے مصاحبوں کا علیحدہ حلقہ بنا لیا۔

لیکن میرزا حیدر لکھتا ہے کہ دہ سالہ ہندال کو بابر نے بدخشاں سے واپس بلا لیا اور یہ ولایت سمرقند نژاد کے امیر لاغری کے فرزند سلیمان کے تفویض کر دی۔ ایک زمانہ پہلے جسے لوگ بھول چکے تھے۔ اس نے میرزا حیدر سے کہا تھا کہ "سلیمان کو میں اپنے بیٹے کی مثل خیال کرتا ہوں" حیدر نے جو اس موقع پر یہ دیرینہ قول نقل کیا تو شبہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اصل بیٹے کی نافرمانی کا خیال تھا۔ بہرحال ماہم کی خاطر یقیناً جمع ہو گئی کہ ہمایوں ہندوستان میں اس کے اتنے قریب آ گیا تھا جہاں سے ہر طرح کی خیر خبر ملنی آسان تھی۔

بایں ہمہ خاندان پر جس مصیبت کا ماہم کو خطرہ تھا وہ نہیں ٹلا۔ سرد کوہستانی علاقے سے ہندوستان کے گرم و مرطوب میدانوں میں آنے والوں میں بیماری پھیلنی ناگزیر تھی۔ بابر کو بار بار بخار اور پیچش ہوتی تھی گلبدن کی ماں دلدار بیگم کا بچہ جسے ماہم نے لے لیا تھا، موت کا پہلا شکار رہا۔ یہ زرافشاں باغ میں بابر کی مایوسانہ گفتگو پر اہلِ محل کے رنج و غم کرنے کے چند روز بعد کا واقعہ ہے۔ گلبدن بیگم بیان کرتی ہے: "تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ شہزادہ انور بیمار پڑا۔ اس کے امعاء میں خرابی آ گئی تھی اور حکیموں کی سعی و تدبیر کے باوجود بیماری بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ وہ دنیا سے عالمِ بقا کو سدھارا۔ والدہ حضرت (ماہم) کو نہایت رنج ہوا۔ اور دلدار بیگم جس کا وہ اکلوتا فرزند تھا، غم و ماتم سے بے خود ہو گئی۔ اس کی نالہ و زاری کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے والدہ اور دوسری بیگمات سے کہا کہ "چلو ہم لوگ دھول پور کی سیر کر آئیں۔ وہ تفریحاً کشتی سے روانہ ہوئے۔ بیگمات نے بھی درخواست کی کہ اُنھیں بھی کشتیوں میں لے جایا جائے۔"

دِلدار کے کئی بچے تقدیر نے چھنوا دیے تھے۔ یہ اکیلا جو رہ گیا، اُسے اجل نے چھین لیا۔ ادھر اسی

زمانے میں خبر آئی کہ ماہم کا بھی اکیلا سلامت ماندہ فرزند ہمایوں شدّتِ گرما سے بیمار پڑ گیا۔

بابر کی دُعا

ملک میں گرمی بلائے بد کی طرح چڑھتی چلی آتی تھی۔ محلات میں بیگمات دریا کنارے سایہ دار احاطہ بند باغوں میں سر چھپائے پڑی رہتی تھیں۔ لیکن بابر بادشاہ حسب معمول گشت میں مصروف تھا۔ کبھی وہ سلیمان کو ولایت بدخشاں جانے کی ضروری ہدایتیں دیتا اور کبھی سرحد چین کے مغل نژاد خوانین کے پاس ضروری مراسلات بھیجتا اور انھیں گردوپیش کے خطرات سے خبردار کرتا تھا تاکہ وہ سلیمان میرزا کی مدد کریں۔ اور کبھی لاہور کے تپتے میدانوں میں مڑ جاتا یا کسی فساد کے فرو کرنے پر متوجہ ہو جاتا تھا۔ کامران کے قندھاری یساولوں کو باریاب کرتا اور پھر سرہند کے پار، جہاں گذشتہ سلاطین کا بڑا قلعہ تھا، کسی قدر ٹھنڈی بلندیوں پر جا کر شکار کھیلتا تھا۔ یہیں سے کشمیر کی مہم تیار کرتا اور پھر آگرے پلٹ کر اپنی کتاب کی نظر ثانی یا سیکری کے باغ کے تالاب میں کشتی رانی سے دل بہلاتا تھا۔

گوشہ گزیں اونگھتی بیگمات کو دہلی کے ایک خط نے چونکا دیا۔ گلبدن لکھتی ہے کہ "اسی وقت مولانا کا خط آیا جس میں تحریر تھا کہ شہزادہ ہمایوں سخت ہو گئے ہیں۔ بیگم حضرت فوراً دہلی تشریف لے آئیں۔ شہزادے کو بڑی نقاہت ہو گئی ہے۔"

رقعہ لانے والے نے بتایا کہ مشیر و ندیم مولانا علیل شہزادے کو دریا کے راستے دہلی لا رہے ہیں والدہ حضرت کو یہ خبر سن کر نہایت تشویش ہوئی اور بے قرار ہو کر فوراً دہلی روانہ ہوئیں۔ جیسے پیاسا کنوئیں کی تلاش میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ لیکن راستے ہی میں تھیں کہ متھرا پر شہزادے سے ملاقی ہوئیں۔ ان کی تجربہ کار نگاہ میں وہ اس سے زیادہ بیمار و کمزور تھا، جتنا بتایا گیا تھا۔ متھرا سے ماں بیٹے بی بی مریم و مسیح کی طرح آگرے روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچنے پر یہ حقیر کنیز اپنی بہنوں سمیت حاضر ہوئی اور اس سراپا نکوئی شہزادے کے بستر علالت کے سامنے لائی گئی۔ وہ روز بروز زیادہ زیادہ کمزور ہو رہے تھے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنی زبان محبت آگیں سے فرمایا "بہنو، جیتی رہو۔ آؤ مجھ سے گلے ملو۔ مدت سے ہم تم سے نہیں ملا۔" دو تین دفعہ انھوں نے سر اٹھا کر یہی الفاظ کہے۔

جب اعلیٰ حضرت تشریف لائے اور بیماری دیکھی تو ان کا شگفتہ چہرہ افسردہ ہو گیا اور معلوم

ہوتا تھا ان پر خوف طاری ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر والدہ حضرت کہنے لگیں "آپ میرے بیٹے کی فکر نہ کریں۔ آپ بادشاہ ہیں، بادشاہوں کو غم نہیں ہوتا۔ خدا نے آپ کو اور بیٹے دیے ہیں۔ ہاں میں غمگین ہوں کہ میرا یہی ایک بیٹا ہے۔"

اعلیٰحضرت نے جواب دیا، "ہاں ماہم میرے اور بیٹے ہیں مگر وہ ہمایوں نہیں ہیں۔ جو میرا ابھی ایسا ہی فرزند ہے جیسا تمہارا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اور خدا اس کی خوشیاں بڑھائے اور زمانہ دراز تک اُسے سلامت رکھے۔ کیا میں نے سلطنت دوسروں کو چھوڑ کر اسی کے نام نہیں کر دی۔ دوسرے اس کی برابری نہیں کر سکتے۔"

اطبّا اپنی سی کوششیں کرتے رہے لیکن ہمایوں کو افاقہ نہیں ہوا۔ تاہم اور دیکھ بھال کرنے والی خواتین کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ مرض دوا دارو سے نہیں جائے گا۔ اب اس کی مرگ و زیست کا سوال تھا اور اس کا فیصلہ صرف خدائے عزّ و جل ہی کر سکتا تھا۔ بیمار کے نیم تاریک کمرے میں یہ خواتین چپ چاپ بیٹھ کر دعائیں کرتی تھیں کہ شہزادے کو تکلیف نہ ہو۔

ایک دن، سہ شنبہ تھا جب کہ بابر نے طبیبوں کو رخصت کیا اور اس علاج کی تیاری کی جس کا دوا کی بجائے صرف خدائے قادر سے واسطہ تھا۔ اس کی قوم میں ایک عقیدہ چلا آتا تھا اور اتنا قدیم تھا، بلکہ اس سے بھی قدیم ترجب کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی جناب میں بیٹا قربان کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ یہ خدا سے رحم کی التجا میں شفاعت پیش کرنے کا طریقہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی سب سے عزیز چیز، حتیٰ کہ فرزند اکبر کی قربانی دے تو رحمت الٰہی کا امید وار ہو سکتا تھا۔

بیرونی دیوان خانے میں اہل عقل و فراست بادشاہ سے حجّت کرتے تھے کہ یہ بہت پرانا عقیدہ ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی نذر یا قربانی کا فائدہ کیا ہوگا؟ اس کی بجائے ان بزرگان مشائخ نے خاص طور پر وکالت کی کہ اللہ تعالیٰ کے نود و نہ (۹۹) اسمائے حُسنیٰ کا ورد کیا جائے تو ضرور مؤثر ہوگا۔ بعض مشیروں نے عرض کیا کہ بادشاہ اگر ایسا عمل کرنا ہی چاہتے ہیں تو جواہرات میں سب سے بیش بہا ہیرا "کوہِ نور" صدقہ کر دیں۔ بابر نے کہا "میں خدا کی جناب میں پتھر نذر نہیں کروں گا۔"

گلبدن بیگم تصدیق کرتی ہے کہ "اس سہ شنبہ کو اور آئندہ دنوں میں بادشاہ نے ہمایوں کے گرد طواف کیا اور دعا مانگتا رہا۔ بار بار سر اُٹھاتا اور (بہ تصحیح مترجم) خدا کی رحمت و کرم کے واسطے

دیتا تھا۔ کمال خضوع اور خشوع قلب سے دعائیں کرتا تھا۔ موسم شدید گرم اور پادشاہ کے قلب وجگر میں حدت تھی۔ چھپر کھٹ کے گرد طواف کرتے ہیں وہ اس قسم کے الفاظ کہتا جاتا تھا: "بارالٰہا! اگر جان کے بدلے جان قبول ہو، تو مَیں ظہیرالدین بابر اپنی جان اور زندگی اپنے فرزند ہمایوں کی جان کے عوض پیش کرتا ہوں"۔

کمرے میں دوسرے لوگوں نے بابر کو یہ کلمہ بآواز بلند کہتے سنا کہ "مَیں نے (بیماری) لے لی، لے لی، لے لی"۔ گلبدن کا بیان ہے کہ اسی شام سے پادشاہ کم زور اور بیمار ہو گیا اور اس کے برعکس ہمایوں کے سر پہ پانی رکھا تو وہ اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ گرمی کی عفونت اور بیمار کے کمرے کی تاریکی میں عورتیں خاموش بیٹھی دعا کر رہی تھیں اور کچھ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بابر کی قربانی پیش کرنے کا کیا انجام اور کونسا زیادہ المناک انجام برداشت کرنا ہوگا؟

ہمایوں شفایاب ہو گیا اور چند روز بعد باپ کے حکم سے اپنی جاگیر پہ سنبھل واپس گیا۔ لیکن بابر کو پھر آگرے سے باہر جانا نصیب نہ ہوا۔ جن درباریوں کی آنکھیں ادھر لگی ہوئی تھیں، انھوں نے مشاہدہ کیا کہ اس کا بخار عَود کر آیا اور اس نے علاج معالجے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔

تاہم لوگوں کو یاد تھا کہ بارہا پادشاہ بخار کے حملے، امعا کی خرابیاں جھیل چکا ہے۔ کتنی ہی دفعہ بستر علالت سے اُٹھ کر سوار ہوا۔ گنگا کو تیر کر پار کیا، یا کسی نئے باغ کو دیکھنے نکل گیا ہے۔

ادھر کبوتروں کی طرح جنھیں وجدانی حس اپنی کابکوں کی طرف کھینچ لاتی ہے، سلطنت کے بڑے بڑے امرا، سپہ سالار و سردار اطراف واکناف سے کوئی نہ کوئی عذر نکال کر اپنا مقام چھوڑ کر آگرے چلے آ رہے تھے۔ چین تیمور، بوڑھا تردی بیگ، ہندو بیگ اور کئی دوسرے، دیوان عام کے ایک جلسے میں جمع ہوئے، جہاں بابر شریک نہ تھا۔ ہمایوں کے غیر مستقل حکمران ہونے کی باتیں ہوئیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ باپ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن بابر کی اس دعا کے بعد کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ہمایوں کو ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ پھر وہ پرانا قضیہ زیر بحث آیا کہ خواجہ کلاں کی طرح ایک جماعت کی رائے میں مرکز حکومت کابل رہنا چاہیئے تھا اور دوسرا گروہ بادشاہ کے اس فیصلے کا پابند تھا کہ دارالسلطنت آگرہ ہی بنایا جائے گا۔ سخت پریشانی میں خلیفہ نے بعض امرا کو جتایا کہ ہمایوں ناعاقبت اندیش، قوت ارادی کا ضعیف اور صرف بابر کے بل بوتے پر چلتا رہا ہے۔ کیا اس کے احکام کی دوسرے

تعمیل کریں گے ؟ پھر خود ہی تجویز کیا کہ اس شہزادے کو قدیم ولایات میں بھیج دینا اور کسی صاحب عزم و ہمت کو ہندوستان کا فرماں روا بنانا مناسب ہوگا اور ایسا کوئی شخص ہے تو وہ شہزادی خانزادہ بیگم کا شوہر مہدی خواجہ ہے۔ لیکن جب مہدی کو بزم شوریٰ میں بلایا گیا تو اس نادان جنگ جو نے ثابت کیا کہ وہ شیر کی کھال میں گدھا تھا۔ بہ طریق راز امیروں سے کہنے لگا کہ میں بادشاہ ہوا تو پہلا کام یہ کروں گا کہ اس بڈھے سڑیلے خلیفہ کو جو سلطنت کا ستون بنا بیٹھا ہے، نکال باہر کیا جائے گا۔" اس پر خلیفہ کو اس کی حمایت سے کانوں پر ہاتھ دھرنے پڑے۔

امرا انتظار میں تھے کہ شاید بابر کے افاقے کی خبر سنیں۔ لیکن (گلبدن لکھتی ہے) جب اس کی حالت ردّی ہوتی گئی تو ہمایوں کو بلانے کے لیے قاصد بھیجا گیا۔ یہ شہزادہ کالنجر چلا گیا تھا۔ پیام ملتے ہی بہ سرعت آگرے آیا اور بادشاہ کی خدمت میں آداب بجالایا۔ اسے بھی نظر آگیا کہ باپ کس قدر کمزور و ناطاقت ہو گیا ہے۔ تیمارداری کرنے والوں سے بار بار پوچھتا تھا کہ اعلیٰحضرت کی اتنی جلدی یہ کیا حالت ہو گئی، اتنے کمزور کس طرح ہو گئے ؟ طبیبوں کو بلا کر بھی اس نے یہی سوال کیا کہ " میں بادشاہ کو اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا ؟

" ادھر میرے والد حضرت برابر دریافت کر رہے تھے کہ ہندال کہاں ہے ؟ چند روز میں کسی نے آکر عرض کیا کہ شہزادے کا اتالیق بردی بیگ حاضر ہے۔ میرے باپ نے مضطربانہ اسے بلوایا اور پوچھا" ہندال کہاں ہے، وہ کب آئے گا ؟" بردی بیگ نے عرض کیا حضور کے فرزند دل بند دہلی پہنچ گئے ہیں، آج ہی یا کل باریابی کا شرف حاصل کریں گے۔ بادشاہ نے خفگی سے فرمایا " ارے نامراد، مجھے معلوم ہے تو نے لاہور میں اپنی شادی رچائی اور اسی کے راگ رنگ میں میرے بیٹے کے آنے میں اتنی دیر ہوئی اور میں برابر اتنے دن انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا۔ اچھا یہ تو بتا ہندال کا قد اب کتنا نکل آیا ہے، وہ کیسا معلوم ہونے لگا ہے ؟"

اتفاق سے بردی بیگ شہزادے کا دیا ہوا جامہ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دکھا کر اعلیٰحضرت سے عرض کیا کہ یہ جامہ شہزادہ سلامت نے اپنے خادم کو عطا کیا ہے۔ تب بادشاہ نے اسے اور نزدیک بلایا اور برابر کہتے رہے" دیکھوں تو سہی وہ کتنا بڑا اور کتنے قد قامت کا ہو گیا ہے ؟" اور یہ بھی کہے جاتے تھے کہ وہ کب آئے گا ؟"

غیر حاضر شہزادے کی فکر کرتے بابر کا دھیان گلبدن اور اس کی بڑی بہنوں کی طرف گیا۔ اس نے دو سپہ سالاران سے شادی کے لیے نامزد کیے اور خانزادہ بیگم کو بلوایا کہ وہ بھی ان رشتوں کی تائید کرے۔

آخر ایک دن اس نے اپنے تمام بڑے امرا کو طلب کیا اور ان سے اس قسم کے کلمات کہے :۔
" میرے دل میں تھا کہ سلطنت ہمایوں میرزا کے حوالے کر کے خود باغ زر افشاں میں گوشہ نشین رہوں خدائے کریم کے فضل سے میرے دل کی بہت مرادیں پوری ہوئیں، سوائے اس خواہش کے۔ لیکن اب مجھے مرض نے دبا لیا ہے۔ میں تم سب کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد ہمایوں کو بادشاہ تسلیم کرو، اس کے وفادار، آپس میں متحد رہو۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ ہمایوں بھی حسب دلخواہ کام کرے گا۔"
پھر اس نے علیحدہ ہمایوں سے یہ بات کہی " تمھارے بھائیوں کو میں تمھاری حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ ان سے اخلاص و محبت اور ساری رعایا کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا۔"
ہم خاندان والوں اور حرم سرا میں جب یہ خبر آئی، تو سب کے حواس جاتے رہے۔ رونا پیٹنا مچ گیا۔

" اس کے تیسرے دن اُس نے ملک بقا کی راہ لی۔ انتقال اتوار (۲۵ دسمبر ۱۵۳۰ء مطابق ۴ جمادی الاوّل ۹۳۷ھ) کو ہوا۔ مردوں نے خانزادہ بیگم اور میری ماؤں کو یہ کہہ کر کہ اطبّا آئیں گے باہر بلوایا اور پھر ہم سب کو بڑے محل میں واپس پہنچا دیا۔ اس یاس و غم کے دن ہر ایک کونے میں منہ چھپائے پڑا رہا۔"

وقائع مابعد

جیسا کہ گلبدن بیگم نے آخری دن کی کیفیت میں اشارہ کیا ہے، کچھ دیر کے لیے بابر کی وفات کو مخفی رکھا گیا۔ خاندان کے لوگ اور بڑے امرا کو اندیشہ تھا کہ اس خبر کو سن کر عوام فساد برپا نہ کردیں۔ پھر گلبدن لکھتی ہے "آرائش خاں نے جو ہندوستان کا امیر تھا، سب سے کہا کہ انتقال کو چھپانا مناسب نہیں ہے۔ ورنہ یہاں کے بازاری شبہ کریں گے کہ بادشاہ پر کوئی آفت آگئی اور جیسی یہاں والوں کی عادت ہے چوری، لوٹ مار شروع کردیں گے۔ خدانخواستہ بے خبر مغلوں کے مکان انھوں نے لوٹے تو بہت بُرا ہوگا۔ بہتر ہے کہ ہم کسی کو سرخ لباس پہنا کر ہاتھی پر سے اعلان کرائیں کہ بادشاہ نے ترک دنیا کر کے خلوت اختیار کی اور بادشاہی ہمایوں بادشاہ کے حوالے کردی۔

اس رائے پر عمل کیا گیا۔ لبظاہر باپ کی وفات کے وقت ہمایوں آگرے میں نہ تھا لیکن تیسرے دن زرافشاں باغ میں اس نے دربار عام کیا اور بے شمار سکّے لوگوں میں نچھاور کیے۔ ان حالات میں وراثت کا کوئی قضیہ پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ بڑے امرا شاہی وراثت کی روایت پر قائم رہے، جیسے خود بابر کے معاملے میں اندجان میں عمل کیا گیا تھا اور مغلوں کی پسند کو اہل ہند نے بھی تسلیم کر لیا۔ ہندال جس کا بابر کو اتنا سخت انتظار اور فکر تھی، آخر آگرے پہنچ گیا۔ قندھار کو کامران اور کابل کو خواجہ کلاں نے پوری طرح قابو میں رکھا۔ خواجہ نے اپنے آقا کی وفات پر ایک غم ناک قطعہ بھی لکھا تھا۔ خانزادہ بیگم کے زیر اثر اہل حرم بھی شروع میں نہایت متحد رہے اور ہمایوں نے باپ کی خواہش پر کہ بھائیوں پر اعتماد اور ان کی شایانِ شان کفالت کی جائے، حرف بہ حرف عمل کیا۔ وزیر سلطنت خلیفہ کی وفاداری آخری مہینے میں مشکوک ہوگئی تھی۔ اس کا ہم آیندہ نام نہیں سنتے اگرچہ اس کے بیٹے سرکاری عہدوں پر مامور رہے۔

غرض سارے خاندان اور طاقتور امرا میں جس قسم کی ہم آہنگی اور یک جہتی اس موقع پر دیکھی گئی ایسی سولھویں صدی کے اوائل میں ایشیا اور ایشیا ہی کیا یورپ کے وقائع میں بھی شاذ و نادر مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ یہ چند سال بعد کا واقعہ ہے جب کامران کا ہمایوں سے تنازع ہوا اور لائق اور خطرناک شیر شاہ نے

ہندوستان میں بغاوت کرکے ہمایوں کو نکال باہر کیا اور اسے پہلے کابل پھر ایران جا کے شاہ طہماسپ صفوی کی پناہ لینی پڑی۔ گلبدن جو اپنی اصلیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مارے مارے پھرنے میں ہمایوں کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی دوبارہ ہندوستان آئی جہاں واپس آکر ہمایوں کا انتقال ہوا اور گلبدن بیگم نے اس کا اور اپنے باپ کا تذکرہ "ہمایوں نامہ" تحریر کیا۔ لیکن ہمایوں کے سوانح کتاب کے موضوع سے خارج اور ہندوستان کے مغل سلاطین کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔

شیر کی قبر کچھ عجیب طرح محفوظ رہی۔ پہلے وہ آگرے کے ایک باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ شہرۂ آفاق روضہ ممتاز محل کے عین مقابل میں تھا۔ نو سال تک قبر وہیں رہی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے بابر نے خواجہ کلاں یا دوسروں کو اس بارے میں ضروری ہدایتیں کر دی تھیں اور جب ہمایوں اور مغل دربار ہندوستان سے دھکیل دیے گئے تھے، بی بی مبارکہ آگرے آئی اور اپنے شوہر کی باقیات کو بہ حفاظت دروں کے راستے کابل منتقل کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ وہاں بابر کی پسندیدہ تفریح گاہ میں قبر بنا دی گئی۔ یہاں چنار کے جھنڈ سے بالاحصار اور دوسری طرف میدانوں کے پار پغمان کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں قبر کے چپٹے تعویذ کے قریب ایک چشمہ بہتا ہوا کابل ندی تک گیا ہے۔ اوپر، بغیر دیوار کے پتلے ستونوں پر چھت ڈال دی ہے۔ مگر پہلے چھت نہ تھی۔ ٹیکرے کے نیچے شاہجہاں نے چھوٹی سی مسجد بنوائی تھی۔ قبر پر سنگ مرمر کی لوح اور کتبہ جہانگیر نے لگایا۔ ٹیکرے کی ڈھلانوں پر خاکی چٹانوں، کائی یا خودرو پھول کی جھاڑیوں کے سوا کوئی آرائش نہیں نظر آتی۔ موجودہ کابل شہر سے درختوں اور بالاحصار کی پہاڑی نے اس مقام کو اوجھل میں کر دیا ہے۔ قبر کے باغ کو رحلت گاہ بابر کے سادہ نام سے پکارتے ہیں۔

بابر نے ۴۸ برس کی عمر پائی جس میں ۳۶ برس حکومت کی۔ سمرقند کی بادشاہی میں برس تک ... کرنے کے باوجود ہاتھ سے نکل گئی تو اس نے ہندوستان میں نئی سلطنت کی بنا ڈالی مگر اس کی شان و شوکت دیکھنے کو زندہ نہیں رہا۔ مغل سلاطین اعظم کی یہ سلطنت نوجوان اکبر کی ۱۵۵۶ء میں تخت نشینی کے بعد ہی منظم و استوار ہو سکی۔ تاہم عہد اکبری میں وہ اسی راستے پر چلی جس کی داغ بیل بابر نے ڈالی تھی۔

شیر نے کابل، کشمیر کو کوہستانی فصیلوں کے پار پنجاب کی ندیاں اور گنگا کی وادیوں سے ملا کر ہندوستان کا نقشہ ہی بدل ڈالا اور اسی ضمن میں لودھی سلاطین اور راجپوت راجاؤں کی جاگیردارانہ جتھوں کے ساتھ مذہبی تفریق و منافرت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس نے ممالک ہند میں فرماں روائے واحد کا اقتدار جو ہیبت

مدت سے نابود ہو چکا تھا، از سرِ نو بحال کیا اور اپنی سلطنت کو ماضی کی بجائے مستقبل کا سوچنے کی فکر و نظر عطا کی۔ مقامی روایات اور مالی نظام بحال رہنے دیے لیکن نظم و نسق کی باگ بادشاہ کے وزیروں کے ہاتھ آ گئی۔ خود بادشاہ کی ذات ان سے ما ورا رہی تاکہ عمال کی بے لاگ نگرانی اور انصاف کر سکے۔ بادشاہ پر قلندری کی جو چھاپ لگی تھی، وہ بابر سے اکبر کو متوارث ہوئی۔

بابر کا طرزِ عمل کہ جنگ و فتح کے وقت کمال سفاکی اور اس کے بعد غیر معمولی عفو و رواداری، بڑے بڑے منگول خوانین کی روایات کی جھلک دکھاتا ہے۔ قاآن، منگو، قبلائی نے بھی اسی طرح حکومت کی تھی۔ اکثر کہا گیا ہے کہ ممالک یورپ کے بادشاہوں نے "کریم النفس جابر دل" کا جو کردار پیش کیا، بابر ان سے ایک صدی پیشتر اس کا نمونہ بنا تھا۔ بایں ہمہ اس کے افعال عموماً اس کی شخصی صفات کے مظہر تھے۔ وہ اپنے ساتھ تیموریوں کا نغمہ و شعر ــ اور شراب کا ذوق ہندوستان میں لایا۔ ایسے ایسے مقامات پر جہاں کسی کا خیال بھی نہ جاتا تھا، بابر نے بیسیوں باغ تیار کرائے اور اسی شیفتگی کی بدولت "شاہ باغ ساز" کے خطاب کا مستحق ہوا۔ سایہ دار و ثمردار درختوں کے علاوہ اور عمارات بھی اس کے پیچھے پیچھے آگے نکل آئیں جہاں جہاں سے مغلوں کے قدم گزرے وہاں سنگِ سُرخ و مرمر کے محلات۔ بڑی بڑی مسجدیں اور مقبرے نمودار ہونے لگے۔ بابر تو یہ منظر دیکھنے کے لیے زیادہ نہ جیا، لیکن اس کا گم شدہ وطن سمرقند، ہندوستان میں اُٹھا لایا گیا۔

اسی دور میں دوسری سرزمینوں میں نئی نئی سلطنتوں کی بنا پڑ رہی تھی، جن کی خصوصیت یہ تھی کہ بہیمی طاقت اور زبردستی کی بجائے تہذیب و تمدن کا گھر تھیں۔ اُزبک خوانین سولھویں صدی کے آخر تک سمرقند پر قابض تو تھے لیکن وہ اپنے منگول اسلاف کی نقطہ پر چھائیں رہ گئے تھے۔ اصلی خانہ بدوش صحرائی میدانوں میں سمٹتے چلے جا رہے تھے۔ سولھویں صدی کے چھٹے عشرے میں جب اکبر کی امن و رواداری کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، صفوی شاہوں اور عثمانی سلاطین کے ماہین بھی صلح ہو گئی۔ ادھر شمال میں کنارِ دریائے والگا کے شہر قازان سے آخری تاتاری خوانین کو ماسکو کے ژار آئی وان المعروف بہ دہشت ناک کی توپوں نے نکال باہر کیا۔

وسط ایشیا کے شہسوار تیراندازوں کی ہزار سالہ برتری کا خاتمہ ہوا اور نہ صرف پہلی مرتبہ بلکہ ہمیشہ کے لیے تہذیب کے آلات جسمانی بدوی قوت پر غالب آ گئے۔

وسط صدی کے عبوری دور ہی میں جستجو کا قدم ایشیا کے محفوظ گوشوں تک آیا۔ فرنگی آنکھوں نے تبت کی پہاڑی فصیلیں مشاہدہ کیں۔ بحر نورد پادری چین کے دروازوں میں داخل ہوئے تاکہ یقین سے معلوم کریں کہ منچو سلطنت میں تو اس "کیتھے" (خطا) کا کوئی اثر آثار باقی نہیں، جس کی کیفیت مارکو پولو نے تحریر کی تھی۔ ایک صاحب عزم انگریز انتھونی جنکنسن موسکو سے مشرق میں چلتے چلتے سمرقند کی کاروانی شاہراہ تک پہنچ گیا۔ عثمانی ترکوں نے جو شہر سو سال پہلے نصاریٰ سے چھینا تھا، اب وہاں لندن و پیرس کے سفارت خانے قائم ہوئے اور انھوں نے اُسے "سلیمان عالی شان" کا دربار کہنا شروع کیا۔

سن ۱۶۰۰ء کے آتے آتے انگریزوں کی نئی بحری سلطنت کے متجسس تاجر پرتگیزوں اور ولندیزوں کے پیچھے لگے ہوئے مغلوں کے دربار تک پہنچنے والے تھے اور بابر کی ساختہ سلطنت میں ان کی پذیرائی ہونے والی تھی۔ صدی کے اسی آخری سال میں معزز (الیسٹ) انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے بنی تھی جس نے آگے چل کر سارے ملک ہی کو اپنا مقبوضہ بنا لیا۔ تاہم یہ آنریبل کمپنی اس مشرقی مقبوضہ کی روایات اور گوناگوں معاشیات بدلنے کی کوشش میں اتنی کامیاب ہونے والی نہ تھی جتنی شہر سمرقند کو اس حکمت عملی کی بدولت نصیب ہوئی کہ رعایا کو اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے۔

بابر کا اپنی قلم کا لکھا ہوا تزک کا نسخہ معدوم ہو گیا۔ تاہم اس کی زندگی میں اور کچھ بعد اس کی نقولیں اور اکثر فارسی میں کر لی گئی تھیں۔ بظاہر ایک خواجہ کلاں کے پاس تھی اور میرزا حیدر دوغلات یقیناً ایک نسخے کا مالک تھا۔ ہمایوں نے اپنے ہاتھ سے ایک نقل کی تھی اور شرحی حواشی بھی بڑھا دیے تھے۔ باپ نے خود اس کے افعال پر جو نکتہ چینی کی، حتیٰ کہ دہلی کے خزانے تڑوانے کے ذکر میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں کی تھی۔ گلبدن بیگم نے بھی صریحاً بابر نامے کے فارسی نسخے سے کام لیا تھا۔ شاہ جہاں کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ تھا جس کی بہت عمدہ تذہیب و تزئین کی گئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل خاندان [illegible] قدر کرتے تھے اور دوسرے کتاب میں بھی تزک نہایت محترم تھی۔ نتیجہ یہ کہ یہ مخطوطے بغیر کسی ترمیم و تہذیب کے اور یقیناً بلا تصرف ہم تک پہنچے۔ ان دور دور پھیلے ہوئے فارسی اور ترکی کے نسخوں میں لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں مگر معنی و مطالب میں فرق نہیں اور جو خلا بابر نے چھوڑ دیے تھے وہ بھی سلامت ماندہ نسخوں میں قریب قریب اسی طرح چھٹے ہوئے ہیں۔ ہم پورا یقین رکھ سکتے ہیں کہ جو تزک بابری ہم آج پڑھ رہے ہیں، وہی ہے جسے ساڑھے چار سو برس پہلے اس نے لکھا تھا (بجز چند مشکوک جزئیات کے)۔

ہندوستان کے اس پہلے بادشاہ کی ساری زندگی کے ایام جس طرح چین لیے بغیر گزرے اس کے باعث وہ پوری کتاب کی نظر ثانی کرنے کی فرصت نہ پا سکا اور غالباً تمام اجزا کو اچھی طرح مرتب بھی نہیں کر سکا۔ اس نے کتاب کا کوئی نام بھی تجویز نہیں کیا تھا۔ وہ از خود بابر نامہ کہلانے لگی۔ اس کا آغاز بلا کسی تمہید کے ایک دم ان[1] کلمات سے شروع ہوتا ہے کہ: "درسنہ ہشت صد و نود و نہ، در ولایت فرغانہ بسن دوازدہ سالگی پادشاہ شدم"۔ اور فوراً ہی وہ بے تکلف اس مملکت کا جغرافیہ، وہاں کے مشاہیر کا حال لکھنے لگتا ہے جن سے اُسے سابقہ پڑا اور جن میں خود اس کا باپ شامل ہے۔ بعد میں جب اُسے کابل میں کچھ سکون حاصل ہوا تو ادھر اُدھر بعض جملے بڑھائے۔ جیسے یہ جملہ کہ "ہندوستان کو زیر نگیں لانے کا میں ہمیشہ سے قصد کرتا تھا"۔ [فارسی تزک میں: "در تاریخ... کہ ولایت کابل مسخر شد، از آں تاریخ تا حال ہمیشہ ہوس ہندوستان کردہ می شد" مترجم] یہ لاف زنی بھی اس کی فطرت کا ایک پہلو دکھاتی ہے: یعنی جب داؤ پیچ سے بالاتفاق کے اتفاقاً کوئی کام بن گیا تو فرط شادمانی میں کہتا ہے کہ میں ہمیشہ سے اسے کرنے کی فکر میں تھا۔ کبھی کبھی کسی بڑی ذ کی بات کو وہ گول بھی کر جاتا ہے جیسے سمرقند میں خانزادہ بیگم کو شیبانی کے حوالے کرنے کا واقعہ۔ لیکن آج تک کسی نے جو شاہ کے لقب سے ملقب ہوا، اپنی کوتاہیاں، ناکامیاں، فراریاں، نشہ بازیاں اتنی وضاحت اور قوت سے بیان نہیں کیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اپنے اعمال کو بالکل ایک غیر آدمی کی طرح دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔

تزک کے بعض اجزا جن کے ملنے کی افسوس ہے کوئی امید نہیں پائی جاتی، یقیناً اس نے تحریر کیے تھے کیونکہ ایسی بیاضوں کے بعد آیندہ اوراق کے سلسلۂ بیان میں وہ اکثر ان واقعات کا حوالہ دیتا ہے جو گم شدہ پچھلے صفحات میں درج کیے تھے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ ایسے واقعات کا ذکر کیے بغیر ہرگز نہ رہ سکتا تھا جیسے اس کے بیٹے کامران اور عسکری کی ولادت۔ یا آخری سال میں ہمایوں کا یکایک آگرے آ جانا علی ہذا پتھر کے پل پر ازبکوں کو بلا امداد غیرے اس کا اچھی طرح رگڑنا جس کا میرزا حیدر نے تذکرہ کیا ہے اور یا پہلی مرتبہ لذتِ مے کشی سے آشنا ہونا۔ یقین ہے کہ ان پر اس نے حسب عادت خوب لکھا ہے مگر وہ تزک میں محفوظ نہیں رہا۔ ابتدائی عمر میں اپنی بیویوں کے مختصر مگر بڑی باریکی سے نقشے اتارے ہیں

---

[1] شروع بلا مختصر حمد و نعت، اپنا نام اور ولدیت تحریر کر دی ہے۔ یا کم سے کم فارسی تزک میں درج ہے۔ مترجم

لیکن کابل کی بیگمات کا تذکرہ مبہم ہے۔ حتیٰ کہ دلدار بیگم اور ماہم کے حالات آئے ہیں لیکن ان کے خاندان و نسب یا ذاتی اوصاف و مزاج کا ذکر نہیں جیسا کہ بابر معمولاً تحریر کیا کرتا ہے ۱۵۲۵ء (۹۳۱ھ) خاص ہندوستان پر حملے کے سال سے تزک غیر مربوط اور وقتاً فوقتاً سلسلہ بیان منقطع ہو گیا ہے اس زمانے میں بیماری بار بار اسے تنگ کرنے لگی تھی۔ حسن اتفاق سے گلبدن بیگم نے اہل حرم کے آگرے میں ورود سے اپنی سرگزشت کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ خاندان کے خانوادۂ شاہی بن جانے کے بعد اس نے ہمایوں کی تصویر بہتر سے بہتر رنگ میں کھینچی ہے۔

اعتراف و تشکر

بابر اپنی تزک میں عموماً ہر نام کے ساتھ پورے القاب و خطاب تحریر کرتا ہے۔ مگر ہم نے اپنی کتاب میں اس سے اقتباسات کرتے وقت انھیں چھوڑ دیا یا مختصر کر دیا ہے۔ جیسے سلطان علی میرزا کو صرف "پرنس علی" لکھا ہے۔ پھر کوئی جشن ہو یا جنگ یا معمولی حادثہ، ان میں اپنے رفیقوں کا وہ نام بنام ذکر کرتا ہے اور اس کا غیر معمولی حافظہ بیسیوں نام کی فہرست تیار کر دیتا ہے۔ یہ سب اس کے لیے مانوس تھے مگر ہمارے آج کے ناظرین کے لیے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا میں نے صرف مشہور یا پیش نظر احوال کے لیے ضروری ناموں کو رہنے دیا، باقی حذف کر دیے ہیں۔ پھر اس کا اُچھٹتا ہوا بیان، خصوصاً ترکی میں، کہیں کہیں مطلب کو مبہم بنا دیتا ہے۔ واقعۃً گھوڑے پر ملک کی منزلیں مارتے ہوئے اس نے کتاب لکھی تھی۔ واقعات ذہن میں تازہ اور مقصد اختصار سے لکھنا تھا۔ پھر قدرتی طور پر بہت سے مقامات جو اس کے وقت میں معروف تھے ان کا پتہ دیے بغیر وہ نام لکھ دینا کافی سمجھتا ہے۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر ہمیں کچھ تشریحی کلمات اضافہ کرنے ضروری معلوم ہوئے۔

ترکی متن کے اس فاضلانہ ترجمے (بابر نامہ ان انگلش) کا میں نہایت مرہون ہوں جسے اینٹ ایس بیوریج نے کیا (لندن، ۱۹۲۱) اور فارسی سے جسے لیڈن اور ارسکن کے لاجواب ترجمے (میموائرز آف ظہیر الدین بابر۔ لندن ۱۸۲۶) کا جس سے میں نے زیادہ تر افادہ کیا کیونکہ فارسی سے واقف ہوں اور چغتائی ترکی سے واقفیت نہیں رکھتا۔ ان تینوں لائق برطانی مترجموں نے جغرافی حواشی دیے ہیں جو ان کے زمانے میں

بہت مفید تھے۔ اِل مَنسکی کا روسی ترجمہ (قازان ۱۸۵۷ء) جس کا کورتیل نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا (۱۸۷۱) لفظی اور بلا حواشی کے ہے۔

دوسرے بیش بہا ہم عصر ماخذ یہ ہیں: گلبدن بیگم کا "ہمایوں نامہ" (ترجمہ بیورج "دی ہسٹری اوف ہمایوں" لندن ۱۹۰۲) میرزا حیدر کی "تاریخ رشیدی" (خلاصہ از ڈینی سن راس۔ لندن، ۱۸۹۵) "شیبانی نامہ" محمد صالح (دومیبری، ۱۸۸۵) اور خواند میر کی "حبیب السیئر" (فارسی۔ طہران ۱۲۷۱ھ)

عام ادبی کتب جن سے استفادہ کیا گیا: براؤن کی "تاریخ ادبیات فارسی"۔ بودے کی "ل انپاٹر منگول"۔ بارتھولڈ اور منورسکی کی "فور اسٹڈیز اون دی ہسٹری اوف سینٹرل ایشیا"۔ اولاف کارو کی "دی پٹھانز" اور ایشوری پرشاد کی "دی لائف اینڈ ٹائمز اوف ہمایوں" ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احمد جو اس وقت ناظم اطلاعات عامہ تھے اور حکومت پاکستان کا میں خاص طور پر زیربار احسان ہوں کہ مجھے کابل سے لاہور تک بابر کی آمد کے راستوں کی تحقیق کرنے کے زمانے میں اپنا مہمان بنایا اسی طرح بریگیڈیر گلزار احمد کا جنھوں نے خاص خاص قلعوں کی کیفیت بتائی جو بابر کے زمانے میں دریائے سندھ کے کنارے پر موجود تھے۔ جامعۂ استنبول کے پروفیسر ذکی ولدی توگن نے اس عہد کی کم معروف خوارزمی تہذیب کی نہایت مفید حقیقت بیان کی۔

۱۹۶۰ء کی گرمیوں میں سوویت روس کی اکادمی کے ادارہ مشرقیہ کے ارکان نے ازبکوں کے دوسری قوموں سے تعلقات کے بارے میں، شیبانی کی سیرت وخصائل کی وضاحت میں اور تیموری عہد کے شہر سمرقند کا خاکہ کھینچنے میں مدد دی۔ تاشقند کی درس گاہ کی ناظمہ ڈاکٹر اعظم جانوا نے کمال عنایت سے بابر کی عائلی زندگی کے متعلق اپنے مطالعے سے مستفید فرمایا اور کتاب "مُبَین" کے اقتصادی حصے کے بارے میں بھی میں نے انہی کی تحقیقات سے اپنی کتاب میں کام لیا۔

کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی

ترتیب : وی ۔ پی مینن — ترجمہ : سید رئیس احمد جعفری

- حکومتِ ہند کے محکمہ اُمورِ ریاست کے سیکریٹری مسٹر مینن کی یہ تصنیف انگریزی زبان میں ہے جس میں آزادیٔ ہندوستان کی زد میں آکر مٹ جانے یا مٹا دی جانے والی مسلم ریاستوں کی عبرت انگیز داستان بیان کی گئی ہے ۔
- مسٹر وی ۔ پی مینن کی اس تصنیف کا اردو ترجمہ اُردو زبان کے مایۂ ناز مصنف جناب رئیس احمد جعفری نے کیا ہے ۔

زبان کی روانی اور واقعات کی ترتیب بدستور کتاب کی زینت ہے ۔

بڑا سائز ۔ ۳۰۰ صفحات — رنگین نقشے — قیمت : چھ روپے صرف

حیدر آباد ——— جو کبھی تھا

ترتیب : مسٹر کے ۔ ایم منشی — ترجمہ : سید رئیس احمد جعفری

- ریاست حیدر آباد ، نظام دکن ، جس کو ۱۸۵۷ء کا انقلاب اور انگریزی سامراج نہ مٹا سکا ، ہندوستان کی آزادی کی انقلابی زد میں آکر پاش پاش ہو گیا ۔
- حیدر آباد کے مٹ جانے اور تباہ ہونے کی یہ عبرت ناک داستان حکومتِ ہند کے ایجنٹ جنرل متعینہ حیدر آباد مسٹر کے ایم منشی کے قلم کی ممنون ہے اور اب اس داستان کو اُردو کا جامہ پہنانے کا سہرا جناب رئیس احمد جعفری کے سر ہے ۔
- جعفری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے اُردو ادب کے ساتھ اپنی وابستگی اور خدمت کا ایک اور ثبوت پیش کیا ہے ۔ کتاب کے ترجمہ میں زبان نہایت رواں استعمال کی گئی ہے ۔
- حیدر آباد کے سقوط کے متعلق یہ پہلی مستند تصنیف ہے ۔

- بڑا سائز • رنگین تصاویر • صفحات ۵۰۰ • قیمت : دس روپے صرف

تاریخ کے موضوع پر ہماری چند مقبول و گرانقدر مطبوعات

نام کتاب	مختصر تعارف	قیمت
انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم مرتبہ: ولیم۔ایل لینگز ترجمہ و حواشی: مولانا غلام رسول مہر	انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم تین جلدوں میں ہے۔ تمام عالم کی تاریخ کا یہ انسائیکلوپیڈیا ایک مستند تاریخی تصنیف ہے۔ سائز ۵ × ۷½ ہے۔ تمام جلدیں ضروری نقشوں، شجروں اور تصاویر سے مزین ہیں۔	
پہلی جلد (تاریخِ اسلام)	پہلی جلد میں ابتدا سے لے کر آج تک کی پوری تاریخِ اسلام کا انسائیکلوپیڈیا درج ہے۔ صفحات ۴۵۰	۱۰ دس روپے
دوسری جلد (تاریخ عمومی)	ابتدا سے لے کر عہدِ نپولین تک، جس میں انقلابِ فرانس بھی شامل ہے۔ مع ضروری حواشی، نقشہ جات (۷ شجرے، ۸ نقشے) صفحات ۵۱۰	۱۲ بارہ روپے
تیسری جلد (تاریخ عمومی)	جس میں انقلابِ فرانس سے لے کر دورِ حاضرہ کے حالات درج ہیں۔ ۹ نقشے، ۷ شجرے۔ صفحات ۵۰۰	۱۴ چودہ روپے
سید احمد شہیدؒ از: مولانا غلام رسول مہر	سرزمینِ پاک و ہند میں تحریک احیاء دین کی مکمل اور مستند تاریخ۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ سائز ۶½ × ۱۰ صفحات ۹۲۵	۱۵ پندرہ روپے
جماعتِ مجاہدین از مولانا غلام رسول مہر	حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور ان کی جماعت کے تنظیمی حالات، ان کے رفقاء اور کارکنان کے سوانحی افکار۔ مدلل و مکمل دستاویز۔ سائز ۱۰" × ۶½، صفحات ۳۲۵	۷ سات روپے
سرگزشتِ مجاہدین از مولانا غلام رسول مہر	سید احمد شہیدؒ کے سلسلۂ جہاد پر چوتھی اور آخری تصنیف، جس میں سید صاحب کی تحریک جہاد۔ جماعت کا استحکام۔ کارکنان کی قربانیاں اور خدمات۔ مجاہدین کے حالات اور خدمات کا مفصل ذکر ہے۔ سائز ۶½ × ۱۰" صفحات ۶۸۰	۱۲ بارہ روپے
سیرت محمد علی از سید رئیس احمد جعفری	اس کتاب میں فاضل مصنف نے موصوف کی حیات اور خدماتِ ملی پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور بعض ایسے امور سربستہ کا انکشاف کیا ہے جن کے بارے میں عوام ابھی تک لاعلم تھے۔ سائز ۵" × ۷½، صفحات ۶۰۰	۶ چھ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز۔ کشمیری بازار، لاہور ــــ بندر روڈ، کراچی

نام کتاب	مختصر تعارف	قیمت
ہمارا قائد از زیڈ۔ اے سلہری	حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ بابائے قوم کی خدمات ملک و ملت کے لیے ناقابلِ فراموش تاریخ ہے اور ان خدمات پر سلہری صاحب نے ایک ایسا ہی ناقابلِ فراموش تبصرہ کیا ہے جو اردو ادب و تاریخ میں یادگار رہے گا۔ سائز ۵" × ۷½ ، صفحات ۲۴۰	دو روپے ۵۰ پیسے
دید و شنید از سید رئیس احمد جعفری	جیسا کے کتاب کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اپنے زمانے کی معروف ہستیوں کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور جو مستند ذریعوں سے سنا، وہی سب کچھ دید و شنید کے نام سے عوام تک پہنچا دیا۔ صفحات ۵۷۶	۶ روپے ۵۰ پیسے
تاتاریوں کی یلغار مصنف: ہیرلڈ لیم مترجم: عزیز احمد	تاتاریوں کے عروج کی مکمل سرگزشت۔ اس دور کی مستند تاریخ جب تاتاریوں نے مشرق و مغرب ایشیا اور یورپ کو ہلا دیا تھا۔ مشہور عالم مصنف ہیرلڈ لیم کی شہرہ آفاق تصنیف THE MARCH OF THE BARBARIAN کا اردو ترجمہ، جو اردو ادب کے لیے قابلِ فخر رہے گا۔ سائز ۶½ × ۱۰"، صفحات ۴۰۰	۱۲ بارہ روپے
کمال اتاترک مصنف: استاذ محمد توفیق مصری مترجم: کرم الٰہی خاموش	مصطفےٰ کمال پاشا المعروف کمال اتاترک، جسے ترک قوم کا نجات دہندہ بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا میں کمال اتاترک پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن استاذ محمد توفیق مصری کی تصنیف کو بہترین تسلیم کیا گیا ہے جس کا ترجمہ جناب کرم الٰہی خاموش صاحب نے نہایت آسان اور عام فہم اردو میں کیا ہے۔ سائز ۵" × ۷½، صفحات ۳۶۸ (ساتواں ایڈیشن)	۴ روپے ۷۵ پیسے
حکمائے عالم مصنف: القفطی مترجم: ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۴۱۱ اسلامی اور یونانی عالم، حکیم، فلاسفر حضرات کے مکمل اور مستند حالات۔ حکمائے عالم کا ترجمہ اردو ادب اور اردو نواز حضرات کے لیے گرانمایہ سرمایہ ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اس کتاب کا ترجمہ نہایت کاوش اور تجسس کے ساتھ کیا ہے۔ سائز ۵½ × ۹"، صفحات ۶۰۸ مع اشاریہ	۱۰ دس روپے
مختصر تاریخ اسلام از مولانا غلام رسول مہر	ابتدائے اسلام سے لے کر دورِ حاضر تک اسلامیانِ عالم کی مختصر مگر جامع تاریخ، جو کئی دیگر اسلامی تواریخ کا نچوڑ ہے۔ زبان نہایت سلیس۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب، سائز ۵" × ۷½، صفحات ۳۲۳	۳ روپے ۵۰ پیسے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز، کشمیری بازار، لاہور ——— بندر روڈ، کراچی